تالیف

مولانا محمد روح اللہ نقشبندی

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان فون: 32631861

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : اپریل ۲۰۱۰ء علمی گرافکس
ضخامت : 335 صفحات

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

﴿......ملنے کے پتے......﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON.
TX-77074, U.S.A

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین

عنوانات | صفحہ نمبر

انتساب

میں اپنی اس حقیر سی کاوش کی نسبت اپنے مشفق اور مہربان شخصیت اور بندہ ناچیز کے پیر و مرشد، فضیلۃ الشیخ، امام شریعت و طریقت حضرت اقدس مولانا محمد شمس الرحمٰن صاحب عباسی نقشبندی غفوری دامت برکاتہم و فیوضہم کی طرف کرتے ہوئے قلبی سکون محسوس کر رہا ہوں، جن کی بے پناہ شفقتوں، لازوال کرم فرماؤں بہترین تربیت اور اچھی سرپرستی کی بدولت میں ہاتھ میں قلم پکڑنے کے قابل ہو سکا۔

بندہ ناچیز و راقم اثیم

محمد روح اللہ نقشبندی غفوری

مقدمہ

قرآن کریم کا یہ فیصلہ اس امت میں تفقہ فی الدین کی اشد ضرورت ہے اور چاہئے کہ ایک جماعت فقہ میں لگی رہے اور دوسرے ان سے ان احکام کو اخذ کریں، شریعت اسلامیہ کی رو سے فقہ کتاب وسنت کا غیر نہیں۔ انہی کی گہرائی میں لپٹے مضامین کا نمایاں ہو کر سامنے آنا ہے۔ سو فقہ الٰہی ہدایت اور نبوی شریعت کی ہی استخراجی صورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم حدیث میں بھی فقہ کا احساس دلاتا ہے اور بتلاتا ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے بھی فقہ کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے فقہ کا مقام ملاحظہ فرمائیں:

قل كل من عند الله فمال هؤلآء القوم لا يكادون يفقهون حديثا (النساء:۷۸)

آپ کہہ دیں ہر اچھائی اور برائی اللہ کے فیصلے سے ہے کیا ہو گیا ان لوگوں کو بات سمجھنے کا سلیقہ نہیں۔

حدیث بات ہے اور اسے سمجھنے کا سلیقہ فقہ ہے۔ حدیث کے لئے فقہ درکار ہے بدوں اس کے وہ بات سمجھ نہ پائیں گے۔ اوروں کی بات تو اپنی جگہ رہی پیغمبر کی بات ہو تو بھی اس لئے کہ لوگ اسے سمجھ پائیں۔ انہیں اس کی فقہ حاصل ہونے چاہئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مشہور دعا کسے یاد نہیں:

قال رب اشرح لی صدری و یسر لی امری و احلل عقدة من لسانی یفقهوا قولی (طٰہٰ:۱۰)

اے رب! کشادہ کر میرا سینہ اور آسان کر میری منزل اور کھول دے گرہ میری زبان کی اور پالیں یہ میری بات میں فقہ (سمجھ)

ذوالقرنین جب دو پہاڑوں کے بیچ پہنچا تو ان سے کچھ لوگ ایسے ملے جو ان کی بات نہ سمجھ سکتے تھے ان کی اس بے چارگی کو قرآن کریم اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی

بات فقہ سے آشنا نہ ہو سکی کچھ بھی نہ جا سکی:

حتی اذا بلغ بین السدین وجد من دونهما قوماً لا یکادون یفقهون قولاً (الکہف:۹۳)

ترجمہ: یہاں تک کہ جب وہ پہنچا دو پہاڑوں کے مابین تو ان کے ورے ایسی قوم دیکھی جو ایک بات کی فقہ (سمجھ) نہ رکھتے تھے۔

ہمارے جو دوست فقہ کے نام سے چڑتے ہیں اور یہ لفظ تک سننا پسند نہیں کرتے وہ نہیں دیکھتے کہ قرآن کریم عام سمجھ اور دانش کے لئے لفظ فقہ بار بار لاتا ہے پھر اُن کے اس لفظ سے چڑنے کے کیا معنی رہ گئے؟ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو فقہ و دانش سے محروم نہ کرے۔ اصطلاحاً جسے فقہ کہا جاتا ہے وہ بھی کتاب وسنت کا غیر نہیں، کتاب وسنت کی گہرائی میں اُتر کر اُن کو پالینے کا نام ہے، فقہ اِدّی ایجاد نہیں، کتاب وسنت کا ہی استخراج ہے۔

فقہ کا آغاز تو عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہو چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے مسائل غیر منصوصہ میں خود صحابہ رضی اللہ عنہم کو اجتہاد کی راہ سمجھائی تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آنحضرت ﷺ کے بعد جو حوادث احکام (نئے نئے پیش آنے والے مسائل) میں اسی راہ سے چلے ہیں اور اسی سے امت کی اپنے قانونی تقاضوں اور ضرورتوں میں عملی پیش رفت رہی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد بڑے بڑے فقہاء یہ حضرات ہیں:

(۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ (۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ
(۳) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ (۴) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ
(۵) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (۶) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما
(۷) حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ (۸) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ
(۹) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (۱۰) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما
(۱۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (۱۱) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

ان کے علاوہ اور بھی مزید عہد رسالت ﷺ میں جو فقہاء کرام ہیں ان کے بھی

حالات زندگی کتاب ہذا میں آگے آرہے ہیں۔ انشاء اللہ العزیز

یہ حضرات کتاب وسنت کے پڑھنے پڑھانے میں تفقہ واستنباط اور استحسان سے کام لیتے تھے، اسلامی عدالتیں قائم تھیں ان میں قاضی کتاب وسنت کی روشنی میں، خلفائے راشدین کے فیصلوں کی روشنی میں اور فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم کی پیروی میں چلتے تھے، اسلام دنیا میں پہلی مرتبہ ایک قانون کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ اور یہ دنیا کے لئے ایک نیا تجربہ تھی، اسلام میں علم کے ماخذ باتفاق صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن وسنت اکابرِ امت اور فقہ وقیاس قرار پائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حاملینِ فقہ (کم وبیش روایات کے حافظ) تو سب تھے لیکن اونچے درجے کے فقہاء ان چالیس پچاس سے زائد نہ ہوں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں جو حضرات فتویٰ دیتے تھے، ان کی تعداد حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ایک سوتیس سے کچھ اوپر بتلائی ہے۔ (اعلام الموقعین، ج ۱ ص ۹)

آنحضرت ﷺ کے دور میں ہی مسلمانوں میں فقہ کا آغاز ہو گیا تھا، آپ ﷺ نے فقہ میں وسعت کی راہیں جائز رکھیں، لیکن آپ کے ہوتے ہوئے فقہ میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ تھی، صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم میں کچھ اختلاف رائے پیدا ہوا اور اس نے مختلف علاقوں میں وسعتِ عمل کی صورت اختیار کی، یہ علاقے حجاز، عراق، شام، یمن اور مصر وغیرہ تھے، جہاں اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نہ کسی کا اثر ورسوخ کارفرما رہا ہے۔

عراق میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا زیادہ اثر تھا، بعد میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی وہاں آٹھہرے، اس وقت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ انتقال فرما چکے تھے اور ان کے شاگرد حضرت علقمہ بن قیس رحمہ اللہ آپ کے مدرسہ کے صدر مدرس بنے، آپ کے شاگرد پھر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے شاگرد بھی بنے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پھر دو طرح کی روایات چلیں، محققین نے ان میں سے انہی روایات کا اعتبار کیا ہے جو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان کے سوا صرف انہی کی روایات لی گئیں جو

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر کے لوگ تھے جو لوگ ان کے حلقہ میں تھے مگر وہ دل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ تھے (جیسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف اٹھنے والے) ان کی روایات کا عراق میں کوئی اعتبار نہ کیا گیا، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی صلح کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ مدینہ تشریف لے آئے اور کوفہ میں فقہ کے مسند علمی حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ، حضرت علامہ شعبی رحمہ اللہ، مسروق بن اجدع رحمہ اللہ، حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ کے نام سے آباد رہی۔

مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ جس طرح قرآن کے بعد سنت کی ضرورت ہے اسی طرح کتاب وسنت کے بعد مسائل غیر منصوصہ کی دریافت کے لئے فقہ کی ضرورت ہے، پھر صرف مسائل غیر منصوصہ ہی نہیں منصوص مسائل میں بھی روایات مختلف ملتی ہیں کوئی پہلے دور کی اور کوئی پچھلے دور کی۔ ان میں تطبیق کی راہ دریافت کرنا اور احکام کو نکھارنا یہ بھی فقہ کے بغیر میسر نہیں آسکتا۔

اپنے پاس نصوص کتنی ہی کیوں نہ ہوں جس قوم کے پاس فقہ نہ ہو وہ ان نصوص سے کبھی اپنا ضابطہ قانون مکمل نہیں کرسکتی، مسلمانوں میں ایک گروہ اس کام کے لئے رہنا چاہئے جو فقہ مرتب کریں لوگ ان کی طرف رجوع کریں اور یہ حضرات انہیں حکم شریعت بتا سکیں۔ نصوص کتاب اللہ کی ہوں یا حدیث کی، گنتی میں آسکتی ہیں، مگر روز اٹھنے والی انسانی ضرورتیں لامحدود ہیں وہ گنتی کی نہیں، آخر ان کا بھی تو حل چاہئے۔

اس کا ایک ہی واحد حل ہے کہ فقہ کی اہمیت اور اس کی افادیت کو سمجھئے اور اس پر عمل کیجئے، یہ کتاب بنام "عہد رسالت ﷺ کے فقہائے کرام" اسی نظریے کے تحت لکھی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور بندہ ناچیز کی علمی وعملی کمزوری کو دور فرمائے۔ آمین

راقم اثیم

محمد روح اللہ نقشبندی غفوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن کریم میں فقہ کی ضرورت کا اعلان

جس طرح قرآن کے بعد سنت کی ضرورت ہے اسی طرح کتاب وسنت کے بعد مسائل غیر منصوصہ کی دریافت کے لیے فقہ کی ضرورت ہے۔ پھر صرف مسائل غیر منصوصہ ہی نہیں منصوص مسائل میں بھی روایات مختلف ملتی ہیں کوئی پہلے دور کی اور کوئی پچھلے دور کی۔ ان میں تطبیق کی راہ دریافت کرنا اور احکام کو نکھارنا یہ کبھی فقہ کے بغیر میسر نہیں آسکتا۔

اپنے پاس نصوص کتنی ہی کیوں نہ ہوں جس قوم کے پاس فقہ نہ ہو وہ ان نصوص سے کبھی اپنا ضابطہ قانون مکمل نہیں کرسکتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

وما كان المومنون لينفروا كافه فلولا نفرمن كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرونo (التوبہ:۱۵)

اور ایسے تو نہیں کہ سب مسلمان جہاد میں نکل کھڑے ہوں سو کیوں نہ نکلے ہر طبقے سے ایک گروہ جو دین میں تفقہ پیدا کریں (فقہ وسنت سیکھیں) اور پھر اپنے لوگوں کے پاس جب پہنچیں تو انہیں خبر دیں تاکہ وہ بچیں۔

قرآن کریم کا یہ حکم کہ امت میں ایک گروہ فقہاء کا ضرور ہونا چاہیے اس فطری تقاضے کو پورا کرتا ہے کہ جو خود اس مرتبے کے نہ ہوں وہ ان پر اعتماد کریں اور ان سے دین لیں۔ اجتہاد اور تقلید کی یہی اساس ہے ہر شخص مجتہد بنے یہ بھی تو نہیں ہوسکتا۔

امور سلطنت کے بارے میں بھی فرمایا کہ خود فیصلے نہ کرنے لگو۔ امن وخوف کی جب کوئی بات تمہیں پہنچے تو ان لوگوں تک پہنچاؤ جو اہل استنباط ہوں بات سے بات نکال سکیں اور جو خبر پہنچے اس کی گہرائی میں اتر سکیں۔

واذا جاء ھم امر من الامن او الخوف اذا عوا به ولو ردوہ الی الرسول والی اولامر منھم لعلمه الذین یستنبطونه منھم (النساء:۸۳)

اوران کے پاس جب کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اسے پھیلادیتے ہیں۔اوراگر وہ اسے اللہ کے رسول کی طرف اور اپنے اولی الامر کی طرف لوٹادیتے تو جولوگ ان میں اہل استنباط ہیں وہ بات سمجھ پاتے۔

قرآن کریم کی رو سے استنباط کی حجیت

قرآن کریم نے استنباط واجتہاد، بات سے بات نکالنے اور حقیقت تک رسائی پانے کی ہر جگہ راہ کھولی ہے اہل حکومت اپنے مسائل میں مجتہد ہیں اور فقہاء کرام شریعت میں مجتہد دونوں اپنے اپنے دائرہ میں اولی الامر ہیں اور عوام امت کو حکم ہے کہ ہر دائرہ زندگی میں وہ اپنے اولی الامر کے پیچھے چلیں۔نظم وسلطنت میں وہ ارکان سلطنت کی بات مانیں اور نظم شریعت میں فقہاء و مجتہدین کی دونوں طرف اپنے اپنے دائرہ عمل کے اولی الامر ہیں۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت پر لکھتے ہیں:

فثبت ان الاستنباط حجة والقیاس اما الاستنباط اوداخل فیه فوجب ان یکون حجة اذاثبت ھذا فنقول الایة دالة علیٰ امر احدھا ان فی احکام الحوادث مالا یعرف بالنص بل باالاستنباط وثانیتھا ان الاستنباط حجة وثالثھا ان العامی یجب علیه تقلید العلماء فی احکام الحوادث (تفسیر کبیر امام رازی ج ۳ ص ۲۷۲)

اس سے ثابت ہوا کہ استنباط حجت شرعی ہے اور قیاس یا تو استنباط ہی کا نام ہے یا یہ اس میں داخل ہے۔سو ضروری ٹھہرا کہ یہ حجت

ہو، جب یہ ثابت ہوا تو ہم کہتے ہیں کہ اس آیت سے کئی مسئلے نکلتے ہیں۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ بعض ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ ان کا حکم نصوص میں دکھائی نہیں دیتا۔ ان کا حکم استنباط سے جانا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ استنباط حجت ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ عامی پر علماء کی تقلید احکام حوادث میں واجب ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم (النساء:۱۹)

اے ایمان والو! تم کہا مانو اللہ کا اور کہا مانو رسول کا اور ان کا جو اولی الامر ہوں تم میں سے۔

اولی الامر سے مراد اہل العلم والفقہ

اولی الامر کی تفسیر قرآن کریم میں سورۂ نساء کی آیت ۸۳ میں اہل استنباط سے کی گئی ہے سو گو اولی الامر میں اہل حکومت بھی شامل ہیں۔ لیکن پہلے درجہ میں اس سے مجتہدین ہی مراد لیے گئے ہیں۔ حافظ ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ (۳۷۰ھ) لکھتے ہیں:

ووجہ تخصیص المجتھدین انہ جاء فی الایۃ الثانیۃ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم ففسر اولی الامر باھل الاستنباط وھم المجتھدون. (احکام القرآن ج۲ص۲۵۶)

اور اولی الامر کی مجتہدین سے تخصیص کی وجہ دوسری آیت ہے جس میں کہا گیا ہے اور اگر یہ لوگ اپنے معاملہ کو اللہ کے رسول اور اپنے اولی الامر کی طرف لوٹاتے تو ان میں جو مجتہد ہیں وہ اس کے حکم کو پا لیتے سو اولی الامر سے مراد اہل استنباط ہیں اور وہ مجتہد ہی ہو سکتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی منزلت علمی سے کون واقف نہیں۔ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مرتبہ علمی کو کون نہیں جانتا۔ دونوں بزرگ فرماتے ہیں اولی الامر سے مراد اہل الفقہ ہیں۔ (المصنف لابن ابی شیبہ ج۶ ص ۴۱۸)

اور فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پیروی امت پر واجب کی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا امیر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو وہاں کا صدر و مدرس بنا کر بھیجا اور اہل کوفہ کو لکھا کہ تم دونوں ان کی اقتداء کرنا، اس سے پتہ چلا کہ حکام بھی اولی الامر میں آتے ہیں اور فقہاء بھی۔ انتظامی امور میں تم امراء کی بات مانو اور علمی امور میں فقہاء کی پیروی کرو۔ آپ نے اہل کوفہ کے نام لکھا۔

انی قدبعثت الیکم بعمار بن یاسرا میراً وعبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما معلماً و وزیرً اوھما من النجباء من اصحاب رسول اللہ ﷺ من اھل بدر فاقتدوابھما واسمعوا من قولھما.

میں تمہاری طرف عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کو علی الترتیب امیر اور معلم بنا کر بھیج رہا ہوں اور یہ دونوں آنحضرت ﷺ کے اونچے درجہ کے صحابہ میں سے ہیں، اور اہل بدر میں سے ہیں تم (اپنے اپنے دائرہ میں) ان دونوں کی پیروی کرنا اور ان کی اطاعت کرنا اور ان کے قول کو لینا۔

اولی الامر کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد

حافظ جصاص رازی رحمہ اللہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کر کے لکھتے ہیں:

عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ انھم امراء السرایا

ویجوزان یکونوا جمیعاً مرادین بالایة لان الاسم یتناولهم جمیعاً لان الامراء یلون امر تدبیر الجیوش و السرایا قتال العدو و العلماء یلون حفظ الشریعة وما یجوز وما لایجوز. (احکام القرآن ج ۲ ص ۲۱۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اولی الامر سے مراد لشکروں کے امراء ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں (امراء اور علماء) دونوں مراد ہوں کیونکہ اولی الامر کا اسم ان سب کو شامل ہے۔ کیونکہ امراء ہی لشکروں کی تدبیر اور دشمنوں سے جنگ کرنے کے والی ہیں اور علماء حفظ شریعت اور یجوز ولا یجوز (مسائل فقہ) کے والی ہیں۔

یہاں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلام میں قانون سازی کا مدار قرآن و حدیث کے ساتھ فقہ پر ہے فقہ ہی ہے جس سے قرآن پاک کی مختلف آیات میں تطبیق کی راہیں کھلتی ہیں اور فقہ ہی ہے جس سے حدیث کے مختلف مضامین آپس میں ترتیب پاتے ہیں۔ اسلامی قانون سازی میں کتاب وسنت اس کے پہلے ماخذ ہیں۔ فقہ دانش ان کے ساتھ ساتھ شامل رہی ہے۔ آیات کے اختلاف کو حل کرنا اور احادیث کے اختلافات کو ترتیب دینا یہ کام علم اصول کے بغیر انجام نہیں پاتا۔ ہاں مسائل غیر منصوصہ مستنبطہ من الکتاب والسنۃ جنہیں جزئیات فقہ کہتے ہیں ان کا نمبر بے شک کتاب وسنت کے بعد ہے۔ مسائل منصوصہ اور مسائل غیر منصوصہ مستنبط کو اپنے اپنے درجہ میں رکھا جائے گا۔

قرآن کریم کا یہ فیصلہ ہے کہ اس امت میں تفقہ فی الدین کی اشد ضرورت ہے اور چاہئے کہ ایک جماعت فقہ میں لگی رہے اور دوسرے ان سے ان احکام کو اخذ کریں۔ اس کی رو سے فقہ کتاب وسنت کا غیر نہیں۔ انہی کی گہرائی میں لپٹے مضامین کا نمایاں ہوکر سامنے آنا ہے۔ سو فقہ الٰہی ہدایت اور نبوی شریعت کی ہی ایک استخراجی صورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم حدیث میں بھی فقہ کا احساس دلاتا ہے اور بتلاتا ہے کہ اسے

سمجھنے کے لیے بھی فقہ کی ضرورت ہے۔

قل کل من عنداللہ فما لھؤلاء القوم لایکادون یفقھون حدیثاً. (النساء:۷۸)

آپ کہہ دیں ہر اچھائی اور برائی اللہ کے فیصلے سے ہے کیا ہو گیا ان لوگوں کو بات سمجھنے کا سلیقہ نہیں۔

حدیث بات ہے اور اسے سمجھنے کا سلیقہ فقہ ہے حدیث کے لئے فقہ درکار ہے بدوں اس کے وہ بات سمجھ نہ پائیں گے۔ اصطلاحاً جسے فقہ کہا جاتا ہے وہ کتاب وسنت کا غیر نہیں۔ کتاب وسنت کی گہرائی میں اتر کران کو پالینے کا نام ہے۔ فقہ کوئی نئی ایجاد نہیں۔ کتاب وسنت کا ہی استخراج ہے۔

فقہ نہ جاننے والوں کی مذمت

قرآن کریم نے کافروں کو کہا ہے کہ وہ فقہ سے محروم ہیں۔

لانتم اشد رھبۃ فی صدورھم من اللہ ذلک بانھم قوم لایفقھون (الحشر:۱۳)

البتہ تمہارا ڈر زیادہ ہے ان کے دلوں میں اللہ کے ڈر سے یہ اس لیے کہ وہ لوگ فقہ نہیں رکھتے۔

ولقد ذرأنا لجھنم کثیراً من الجن والانس لھم قلوب لایفقھون بھا ولھم اعین لایبصرون بھا (الاعراف:۱۷۹)

اور البتہ پیدا کئے ہیں ہم نے جہنم کے لیے بہت سے جن اور بہت سے آدمی۔ ان کے دل ہیں جن میں فقہ نہیں۔ ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے ہوں۔

فطبع علیٰ قلوبھم فھم لایفقھون (المنافقون:۳)

سو مہر لگ چکی ہے ان کے دلوں پر سو اب وہ فقہ سے بالکل بے تعلق ہیں۔

ولکن المنافقین لایفقھون (المنافقون:۷)

اور لیکن منافق اپنے پاس فقہ نہیں رکھتے۔

بل کانوا لا یفقھون الا قلیلاً. (الفتح:۱۵)

بلکہ وہ فقہ نہ رکھتے تھے مگر چند لوگ۔

بانھم قوم لایفقھون. (الانفال:۶۵، التوبہ:۱۲۷)

وہ ایسے لوگ جن کے پاس فقہ نہ ہو۔

مانفقہ کثیراً مماتقول. (ہود:۹۱)

ہم تمہاری کہی باتوں میں کچھ فقہ نہیں پاتے۔

لو کانوا یفقھون (التوبہ:۸۷)

کاش کہ وہ فقہ پاس رکھے ہوتے۔

آنحضرت ﷺ کے نزدیک فقہ کا مقام

آنحضرت ﷺ سے نقل روایت کرنے والے تو بہت تھے۔ آپ کی ہدایت تھی کہ میری ایک بات بھی جسے پہنچی ہو اسے لازم ہے کہ اسے آگے روایت کر دے تا کہ دین کی کوئی بات چھپی نہ رہے۔ ہوسکتا ہے جن کے پاس وہ یہ حدیث پہنچائے وہ اس کی نسبت اسے زیادہ سمجھنے والا ہو۔ اہل روایت تو سبھی ہو سکتے ہیں مگر اہل فقہ وہی خوش قسمت ہیں۔ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ کر لے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین . (ترمذی جلد۲ ص۸۹ وقال حسن صحیح، سنن دارمی جلد۱ ص۸۵ ورواہ مسلم عن معاویہ رضی اللہ عنہ، ص۱۴۳ من المجلد الاول)

اللہ تعالیٰ جس بندے سے خیر کا ارادہ فرمالے اسے دین میں فقیہ بنادیتا ہے۔

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

الناس معادن فخیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الاسلام اذافقھوا (صحیح بخاری جلد اص ۴۹۶ ص ۴۷۳۔ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۳۱)

لوگ کانیں ہیں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے اسلام میں بھی وہی اچھے ہوں گے جب وہ فقہ کو جاننے لگیں۔

(۳) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

ان رجالاً یاتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین واذا اتوکم فاستو صوابھم خیراً۔ (جامع ترمذی ج ۲ ص ۸۹، سنن ابن ماجہ ص ۲۲)

بے شک اطراف عالم سے لوگ تمہارے پاس آئیں گے تاکہ وہ دین میں تفقہ حاصل کریں۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم انہیں خیر کی نصیحت کرنا۔

(۴) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا:

فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد. (رواہ الترمذی ج ۲ ص ۹۳، سنن ابن ماجہ ص ۲۲)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اسے اس طرح روایت کرتے ہیں:

ماعبدالله عزوجل بشیء افضل من فقه فی الدین ولفقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابد ولکل شی عماد

وعماد هذا الدين الفقه. (عوارف المعارف ج۱ص۲۲۵)

اللہ کی کوئی عبادت فقہ فی الدین سے بڑھ کر نہیں ہے اور ایک فقیہ شیطان پر ایک ہزار عابدوں (عبادت گزاروں) سے بھی زیادہ گراں ہے۔ ہر چیز کا ایک ستون ہے اور اس دین کا ستون فقہ ہے۔

(۵) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے حضور ﷺ کو فرماتے سنا:

رب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الىٰ من هو افقه منه. (رواہ الشافعی واحمد والدارمی ج۱ص۸۶ والترمذی ج۲ص۹۰)

کئی ایسے ہیں جو حامل فقہ (راوی حدیث) تو ہیں لیکن وہ فقیہ نہیں اور کئی حاملین فقہ روایت اس کی طرف لے جاتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہو۔

(۶) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے اپنی مسجد میں دو حلقے دیکھے۔ ایک میں لوگ دُعائیں مانگ رہے تھے متوجہ الی اللہ ہو رہے تھے اور دوسرے حلقے کے لوگ (يتعلمون الفقه) فقہ میں مشغول تھے آپ ﷺ نے اس دوسرے حلقے کے لوگوں کے بارے میں فرمایا یہ پہلوں سے افضل ہیں:

اما هولاء فيتعلمون الفقه ويعلمون الجاهل فهولاء افضل.

(سنن دارمی ج۱ص۹۹، مسند ابوداؤد الطیالسی ص۲۳۶)

یہ لوگ فقہ کا علم حاصل کر رہے ہیں پھر یہ آگے جاہلوں کو تعلیم دیتے ہیں سو یہ ان سے افضل ہیں۔

(۷) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے وہاں پہنچ کر جو خطبہ دیا۔ اس میں انہیں اسلام کی رغبت دلائی اور تفقہ فی القرآن کی نصیحت کی:

فخطب الناس معاذ فحضهم على الاسلام وامر هم بالتفقه في القرآن. (سنن دارمی ج ۱ ص ۸۴)

پس حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور لوگوں کو اسلام کی رغبت دلائی اور انہیں قرآن حکیم سے فقہ مرتب کرنے کا حکم دیا۔

قرآن کریم سے جو مسئلہ بیان کیا جائے۔ دیکھنا ہوتا ہے کہ قرآن کریم اسے عبارۃً بیان کرتا ہے یا دلالۃً یا اشارۃً یا اقتضاءً پھر یہ کہ یہ حکم عام ہے یا خاص، بصورت اول عام مخصوص منہ البعض ہے یا نہیں، پھر مجمل ہے تو اس کی تفصیل کیا اس میں کسی دوسرے مقام پر ہے یا اس کی تفصیل سنت سے معلوم کی جائے گی۔ ان سب کے جاننے میں خاصا علم فقہ درکار ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے انہیں تفقہ فی القرآن کا سبق دیا۔ آپ خود آنحضرت ﷺ سے مجتہد ہونے کی سند پائے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

خصلتان لايجتمعان في منافق حسن سمت ولافقه في الدين. (رواہ الترمذی ج ۲ ص ۹۳)

دو عادتیں کسی منافق میں جمع نہیں ہو پاتیں (۱) حسن سیرت (۲) دین میں فقہ کی گہرائی۔

منافق قرآن کی آیات، منافقت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے کلمہ بھی پڑھ سکتا ہے۔ نشهد انک رسول الله بھی کہہ سکتا ہے۔ حدیث بھی روایت کرسکتا ہے صحیح ہو یا اپنے پاس سے بنائے۔ لیکن تفقہ فی الدین سے وہ کلیۃً عاری ہوتا ہے۔ یہ ایسا نور ہے جو قلب منافق میں اتر نہیں سکتا اور اس کا کوئی ظاہر نہیں جسے وہ ظاہری طور پر اپنا رکھے۔ فقہ کے ظاہری پیرائے قرآن وحدیث ہیں اور ان میں وہ منافقت کی راہ نہیں چل سکتا ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ فقہی جزئیات کی نقل کرے اور غلط کرے، ظاہر ہے کہ وہ فقیہ نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے جو علم دے کر حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا اس میں جو شخص فقہ پالے اور پھر قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہ پڑھائے اس کی کیا مثال ہوسکتی ہے اسے

آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد میں ملاحظہ فرمائیں، حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

مثل مابعثنی اللہ بہ من الھدی والعلم کمثل الغیث الکثیر اصاب ارضاً فکان منھا نقیۃ قبلت الماء فانبتت الکلاء والعشب الکثیر و منھا اجادب امسکت الماء فنفع اللہ بھا الناس فشربوا و سقوا زرعوا واصاب منھا طائفۃ اخریٰ وانماھی قیعان لاتمسک ماء ولاتنبت کلاء فذلک مثل من فقہ فی دین اللہ ونفعہ بمابعثنی اللہ بہ فعلم وعلم ومثل من لم یرفع بذلک راسا. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۸)

اللہ نے مجھے جو علم اور ہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی مثال اس وافر بارش کی ہے جو ایسی زمین پر برسی جو بڑی صاف تھی اس نے پانی کو اپنے میں جذب کیا اور بہت گھاس اور سبزیاں اگائیں اور ایسی زمین بھی تھی جو پتھریلی تھی اس نے پانی روک رکھا۔ اللہ نے اس سے بھی لوگوں کو فائدہ پہنچایا وہ اسے پیتے رہے پلاتے رہے کھیتوں کو دیتے رہے اور ایسی زمین بھی تھی جس کے چٹیل میدان تھے یہ نہ پانی کو روک سکی نہ سبزہ اگا سکی یہ مثال ان کی ہے جو اللہ کے دین میں فقہ حاصل کریں اور اللہ نے جو دین مجھے دے کر بھیجا ہے اس سے نفع حاصل کریں علم سیکھیں اور اسے سکھائیں اور اس کی جس نے اس کھلی بارش پر سر تک نہیں اٹھایا۔

آپ نے بجا فرمایا:

مجلس فقہ خیر من عبادۃ ستین سنۃ. (طبرانی فی المعجم الکبیر)

فقہ کی ایک مجلس ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۶۱ میں جریج راہب کا قصہ مذکور ہے۔ والدہ نے اسے تین دفعہ آواز دی اور وہ اپنے صومعہ میں عبادت میں لگا رہا۔ ماں کو جواب نہ دیا۔ ماں نے اسے بددعا دی وہ عبادت کے شوق میں لگا رہا یہ نہ سمجھ پایا کہ ماں کی آواز پر پہنچنا کیسا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔

لو کان جریج الراهب فقيهاً عالما لعلم ان اجابة امه خير من عبادة ربه (عمدۃ القاری ج ۷ ص ۲۸۳)

اگر جریج راہب علم میں فقیہ ہوتا تو اسے پتہ ہوتا کہ ماں کی آواز پر ہاں کہنا خدا کی عبادت سے بہتر ہے۔

اس میں لسان رسالت سے علم فقہ کی عظمت ظاہر ہے ہر عالم فقیہ نہیں ہوتا۔ فقہ صرف اونچے علم والوں کا نصیب ہے دوسرے درجے میں محدثین ہیں جو اس بارش کے پانی کو اپنے ہاں روک لیتے ہیں۔

ویسے تو آنحضرت ﷺ کے پاس سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم روز آتے جاتے تھے لیکن ان میں جو فقہ میں گہرائی پا چکے وہ آنحضرت ﷺ کی نظر میں ہوتے تھے۔ درس وتدریس اور فقہ وافتاء کی خدمات انہی کے سپرد ہوتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی حضرت زیاد بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا:

ان كنت لاعدك من فقهاء المدينة . (رواہ الدارمی عن ابی الدرداء ج ۱ ص ۹۹ والترمذی ج ۲ ص ۹۰)

بے شک میں تو تمہیں مدینہ کے فقہاء میں سے سمجھتا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ ایک اعرابی کے سامنے یہ آیت پڑھی: **فمن يعمل مثقال ذرة خيراً يره ومن يعمل مثقال ذرة شرا يره** تو وہ اعرابی کہنے لگا: **حسبی حسبی** مجھے مجھے یہ کافی ہے مجھے یہ کافی ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: **فقه الرجل** یہ شخص فقیہ ہو گیا۔ (عوارف المعارف بہامش احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۲۲۶)

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے دُعا کی تھی:

اللھم فقھه فی الدین وعلم التاویل. (مسند احمد، ج ۸، ص ۳۲۸ بحوالہ ترجمان السنۃ، ج ۱ ص ۲۵۸)

اے اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو دین کی فقہ عطا فرما اور اسے علم تفسیر عطا کر۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں فقہ کا مقام

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کوئی مسئلہ پیش آتا تو اہل الرائے اور اہل الفقہ کو مشورہ کے لیے بلاتے۔ مہاجرین وانصار میں سے اہل علم کو بلاتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلاتے۔ یہی لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں فتوے دیا کرتے تھے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو وہ بھی انہی سے مشورہ لیا کرتے تھے اور فتوے کا مدار زیادہ انہی حضرات پر تھا۔ (کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۴)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مجلس فقہاء ان سات ارکان پر مشتمل تھی:

کان ابوبکر الصدیق اذ اورد علیه حکم نظر فی کتاب الله تعالیٰ فان وجد فیه یقضیٰ به قضیٰ به وان لم یجد فی کتاب الله نظر فی سنة رسول الله فان وجدفیها مایقضی به قضی به فان اعیاه ذلک سأل الناس هل علمتم ان رسول الله قضیٰ فیه بکذا اوکذا فان لم یجد سنة سنها النبی ﷺ جمع رؤس الناس فاستشارهم فاذا اجتمع الیهم علی الشی قضیٰ به. (اعلام الموقعین ج ۱)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی مقدمہ آتا تو آپ کتاب اللہ پر نظر کرتے اگر اس میں حل جاتا تو اس کے مطابق

فیصلہ کرتے اور اگر اسے کتاب اللہ میں نہ پاتے تو سنت رسول پاک ﷺ میں اسے تلاش کرتے اگر آپ کو وہ اس میں مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ دیتے اور اگر وہ مسئلہ وہاں بھی نہ ملتا تو آپ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھتے کیا تم نے جانا کہ حضور ﷺ نے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ دیا ہوا گر آپ کو اس طرح بھی حضور ﷺ کی کوئی سنت نہ ملتی تو آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کی میٹنگ بلاتے اور ان سے مشورہ کرتے اگر وہ کسی بات پر متفق ہو جاتے تو آپ اس کے مطابق فیصلہ فرماتے۔ ادلہ شرعیہ میں کتاب وسنت کے بعد اجماع کا درجہ ہے پھر قیاس مجتہد ہے۔

(۲) قرآن کریم کا ارشاد ہے:

کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون. (آل عمران:۸۱)

تم ہو جاؤ اللہ والے جیسے کہ تم سکھلاتے تھے اللہ کی کتاب اور جیسے کہ تم خود بھی پڑھتے تھے۔

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں

کونوا حکماء علماء فقہاء (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۶)

تم ہو جاؤ حکماء، علماء اور فقہاء۔

قال ابن عباس رضی اللہ عنہما ماسالنی عن مسئلة الاعرفت فقیه هو اوغیر فقیه (المصنف لابن ابی شیبہ ج ۵ ص ۳۱۲)

جب بھی کسی نے کوئی مجھ سے مسئلہ پوچھا میں نے جان لیا وہ فقیہ ہے یا غیر فقیہ۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں آپ جس کو عالم ربانی سمجھتے کہ وہ بات کتاب وسنت کی مرادات میں گھر کر کہتا ہے تو اسے کہتے یہ فقیہ ہو چکا آپ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ

عنہ کو بھی یہ سند دی اور فرمایا۔

انہ لفقیہ (ذکرہ فی المشکوۃ من حدیث البخاری کذافی فتح الرحمن ج ۳ ص ۱۸)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے ہاں فقہ کی کتنی عظمت تھی۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا:

افضل العبادة الفقه فی الدین (عوارف المعارف بہامش احیاء ج ا ص ۲۲۶)

یہ بہترین عبادت ہے، کہ فقہ میں لگے رہو۔

(۳) فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی منزلت علمی سے کون آگاہ نہیں۔ آپ اس زمانے کو فتنے کا زمانہ کہتے ہیں۔ جب قرآن کے الفاظ کو اٹھانے والے زیادہ ہو جائیں گے اور اس کی گہرائی میں اُترنے والے اس کے معانی کے علمبردار کم ہو جائیں گے قرآن پاک کے ظاہر و باطن کو اُٹھانے والوں کو آپ قراء اور فقہاء کا نام دیتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

کیف انتم اذالبستکم فتنة یهرم فیها الکبیر ویربوا فیها الصغیر...... اذاکثرت قراء کم وقلت فقهاء کم.

(سنن دارمی ج ا ص ۷۵)

تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہیں فتنے آلیں گے بڑے بوڑھے ہو جائیں گے اور چھوٹے بڑے ہو جائیں گے۔۔۔ قاری زیادہ ہوں گے اور فقہ جاننے والے کم ہوں گے۔

اور یہ بھی فرمایا:

لا یاتی علیکم عام الا وهو شر من الذی کان قبله .... ولکن علماء کم وخیار کم وفقهاء کم یذهبون ثم لاتجدون منهم خلفا وتجئ قوم یقیون الامر برایهم.

(ایضا ص ۷۶)

تم پر کوئی سال نہ آئے گا مگر یہ کہ وہ اپنے سے پہلے سال سے بدتر ہوگا۔ لیکن تمہارے علماء اور اچھے لوگ اور فقہا چلتے بنیں گے پھر تم ان کے جانشین نہ پاؤ گے پھر ایسے لوگ اُٹھ کھڑے ہوں گے جو معاملے کو اپنے خیال سے طے کریں گے۔

فقہاء مسائل غیر منصوصہ کو علت پر نظر رکھتے ہوئے مسائل منصوصہ پر قیاس کرتے ہیں رائے پر قیاس نہیں کرتے حضرت نے پیشگوئی کی جب اصل فقہاء اُٹھ جائیں گے تو وہ لوگ آجائیں گے جو مسائل کو اپنے خیال سے طے کریں گے۔

(۴) فقیہ شام حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ (۳۲ھ) فرماتے ہیں:

لاتفقه کل الفقه حتیٰ تریٰ للقراٰن وجوها کثیرة ولن تفقه کل الفقه حتیٰ تمقت الناس فی ذات الله ثم تقبل علیٰ نفسک فتکون لها اشد مقتاً عنک للناس.

(سنن دارمی ج۱)

تم اس وقت تک پورے فقیہ نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ قرآن کریم میں وجوہِ کثیرہ پر تمہاری نظر نہ ہو اور تم اس وقت تک کامل فقیہ نہ ہو سکو گے جب تک تم اللہ کے لیے لوگوں سے بیزار نہ رہو۔ پھر تم اپنے جی پر نظر کرو اور تم اس کے لیے لوگوں سے بھی زیادہ دوری اختیار کرنے والے ہو جاؤ۔

(۵) حضرت تمیم داری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

فمن سوده قومه علی الفقه کان حیاة له ولهم ومن سوده قومه علیٰ غیر فقه کان هلاکاً له ولهم. (دارمی ج۱ ص۹۱)

جس شخص کو اس کی قوم نے فقہ پر سرداری دی اس میں اس کے لیے اور اس قوم کے لیے زندگی ہے اور جسے اس کی قوم نے فقہ کے بغیر سردار بنایا اس میں اس کے لیے اور پوری قوم کے لیے ہلاکت ہے۔

(۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا:

امابعد فانی امرکم بما امرکم به القرآن وانهاکم عمانهاکم عنه محمد ﷺ وامرکم باتفاق الفقه والسنة والقنکم فی العربية. (المصنف بعبد الرزاق ج۱۱ص۲۱۳)

میں تمہیں اسی بات کا حکم دیتا ہوں جس کا قرآن کریم نے تمہیں حکم دیا ہے۔ اور اسی چیز سے روکتا ہوں جس سے آنحضرت ﷺ نے روکا ہے اور میں تمہیں فقہ اور سنت کے جوڑنے اور عربیت میں فہم پیدا کرنے کی تاکید کرتا ہوں۔

عن عمر بن زيد قال كتب عمر الیٰ ابی موسیٰ امابعد فتفقهوا فی السنة وتفقهوافی العربية. (المصنف لابن ابی شیبہ ج۵ص۲۴۰)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ سنت میں فقہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور عربیت میں فقہ کی تلاش کرو۔

حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ خود بھی اونچے علمی پائے کے عالم تھے گویا ان کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ فقہ سنت اور علم وادب ساتھ ساتھ چلیں گے تب کتاب و سنت کی اصل پر اطلاع ہو سکے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک اور موقعہ پر بھی فرمایا:

تفقهوا قبل ان تسودوا (صحیح بخاری ج۱ص۱۷، المصنف لابن ابی شیبہ وراجع لہ فتح الباری ج۱ص۱۶۶)

سیادت پر آنے سے پہلے فقہ حاصل کرو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جابیہ میں جو خطبہ دیا اس میں کھلے لفظوں میں فقہ کی طرف توجہ دلائی آپ نے فرمایا:

یاایها الناس من اراد ان یسأل عن القرآن فلیأت ابی بن

كعب ومن اراد ان يسأل عن الفرائض فليات زيدبن ثابت ومن اراد ان يسأل عن الفقه فليات معاذ بن جبل.

(رواہ الطبرانی فی الاوسط وراجع لہ مجمع الزوائد ج ا ص ۱۳۵)

جو شخص چاہے کہ قرآن کے بارے میں کچھ پوچھے وہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس جائے اور جو شخص وراثت کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہے وہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور جو شخص فقہ کا خواہاں ہو وہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شہادت

لاخير فى عبادة لافقه فيها ولافى قراة لاتدبر فيها افلا يتدبرون القرآن. (اتحاف شرح الشمائل للدوجی ص ۳۴۲)

اس عبادت میں خیر نہیں جس میں فقہ کا دخل نہ ہو اور نہ قرأۃ میں جس کے ساتھ تدبر نہیں (قرآن کریم میں ہے) کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

آپ نے یہ بھی فرمایا:

الفهم الفهم فيما يختلج فى صدرك مما لم يبلغك فى الكتاب والسنة و اعرف الامثال والاشباه ثم قس الامور عند ذلک فاعمد الىٰ احبها الى الله واشبهها فيما ترى. (دارقطنی)

جو چیز تیرے دل میں کھٹکے جس کے بارے میں تمہیں کتاب وسنت سے کوئی بات نہ پہنچی ہو اس میں غور کرو اور اسے جاننے کی کوشش کرو۔ اس کی امثال اور ملتی جلتی صورتوں کو پہچانو پھر اس موقعہ پر قیاس سے کام لو اور وہ پہلو اختیار کرو جو اللہ کو زیادہ پسند ہو اور

تمہاری نظر میں حق کے زیادہ قریب ہو۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جنہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے انہ لفقیہ کے اعزاز سے ذکر کیا ہے۔آپ نے طاعون عموس میں جو خطبہ دیا اس میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا وہ مجھ سے زیادہ فقیہ ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں فقہ کا ذکر کس عزت اور عظمت سے کیا جاتا تھا اور فقہ کی اسلام میں کتنی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اعلان تھا کہ جو شخص فقہ نہ جانتا ہو وہ ہمارے بازار (ہماری مجلس شوریٰ) میں نہ بیٹھے۔ (طبع الہ باد)

(۸) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی عظیم علمی شخصیت سے کون انکار کر سکتا ہے آپ کی زبان سے فقہ کی عظمت سنیئے:

عن جابر قال مارایت احدًا کان اقرأ لکتاب الله ولا افقه فی ذین الله ولا اعلم بالله من عمرؓ (المصنف لابن ابی شیبہ ج ۶ ص ۱۳۹)

میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ کسی کو قرآن پڑھنے والا دین کی زیادہ سمجھ رکھنے والا (افقہ) اور اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والا کسی کو نہیں پایا۔

(۹) عن عبید بن عمر رضی الله عنه قال اذا اراد الله بعبد خیراً فقهه فی الدین والهمه رشده. (المصنف ج ۶ ص ۲۴۱)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خیر کا ارادہ فرمالیں تو اسے دین میں فقہ عطا فرمادیتے ہیں اور اس کا رشد و ہدایت ہونا اس کے دل میں القا فرمادیتے ہیں۔

محمد بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی فقہ کی عظمت واہمیت اسی طرح مروی ہے۔

(۱۰) جب فقہ کی اہمیت نہ رہے تو اسے دور آخر کی علامت سمجھیں۔ حضرت

عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما (۳۲ھ) فرماتے ہیں:

عن یحییٰ بن سعید ان عبدالله بن مسعود رضی الله عنه قال لانسان انک فی زمان کثیر فقهاء و قلیل قراء لا تحفظ فیه حدود القرأن و تضیع حروفه قلیل من یسأل کثیر من یعطی...... وسیاتی علی الناس زمان قلیل فقهاء لا کثیر قراء لا یحفظ فیه حروف القرأن و تضیع حدوده. (مؤطا امام مالک ص ۱۸۷)

تم ایسے دور میں ہو جس میں فقہاء زیادہ ہیں اور قاری کم قرآن کی حدود کی حفاظت ہے اور اس کے حروف (اختلاف قرأت) کی بحثوں میں زیادہ وقت نہیں لگایا جاتا۔ مانگنے والے کم ہیں اور دینے والے زیادہ لیکن ایک ایسا زمانہ بھی آرہا ہے کہ فقہ والے کم ہو جائیں گے اور قاریوں کی کثرت ہوگی۔ حروف قرآن پر محنت ہوگی اور قرآن کی حدود کا دھیان نہ رہے گا۔

قرآن میں اسلامی فقہ کی بنیادیں

شیخ محمد خضری بک لکھتے ہیں: شریعت نے اسلامی قانون سازی میں تین بنیادی چیزوں کی بطور خاص رعایت کی گئی ہے۔

(۱) عدم الحرج: اس میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ لوگوں پر تنگی واقع نہ ہو اور عام زندگی میں کوئی حرج واقع نہ ہو۔

(۲) تقلیل التکلیف: یعنی انسان پر شریعت کی وجہ سے جو ذمہ داری آئے اس کے تحمل میں انسان کو بہت کم تکلیف ہو۔

(۳) تدریج: کوئی حکم اچانک وارد نہ کیا جائے۔ تدریج سے کام لیا جائے شریعت اس راہ سے قانون بنے گی۔

قرآن کریم میں عدم الحرج کا بیان

هوا حبتبکم وماجعل علیکم فی الدین من حرج ملة ابیکم ابراهیم (الحج:۷۸)

اللہ تعالیٰ نے تمہیں چن لیا ہے اور نہیں رکھی تم پر کوئی دین میں تنگی یہ دین تمہارے باپ ابراہیم کا ہے۔

یعنی دین میں کوئی ایسی مشکل نہیں رکھی جس کا اٹھانا کٹھن ہو۔ احکام میں ہر طرح کی رخصتوں اور سہولتوں کا لحاظ رکھا ہے۔ یہ دوسری بات ہے تم خود اپنے اوپر ایک آسان چیز کو مشکل بنالو۔ پانی نہ ملے اور وضو نہ کرسکو اس حال میں تیمم کی راہ کھول دی اور فرمایا:

مایرید اللہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطهرکم (پ۶ المائدہ)

اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی ڈالے لیکن چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے۔

یعنی وضو نہ سہی تو تیمم سہی غرض پاک ہونا ہے۔ یہ پاکیزگی جس طرح پانی سے ہوسکتی ہے تو اسی طرح تیمم سے بھی ہوسکتی ہے۔ جس سے پانی نکلا ہے پورا کرۂ ارضی پانی اور مٹی پر مشتمل ہے پانی بھی پاکیزگی کا ذریعہ ہے اور مٹی بھی۔ دین میں تنگی نہیں کہ اور کوئی دوسری راہ ہی نہ ہو۔

دنیا کا علم سب حاصل کریں اور اسے دلیل سے جانیں۔ اس میں سب انسانوں کو ڈالنا دنیا کے دوسرے کاموں میں قطع حوادث کا موجب تھا۔ اس لیے اسے سب کے لیے فرض نہ ٹھہرایا گیا۔ اسے فرض کفایہ ٹھہرایا۔ دوسروں کے لیے ان کی تقلید کی راہ کھلی ہے انہیں دلائل جاننے کا لازماً پابند نہ کیا گیا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

جو احداث کثیر الوقوع تھے ان میں سارے جسم کا دھونا ضروری نہ رکھا۔ صرف وہ اعضاء جن کو اکثر بلاد متمدنہ کے رہنے والے کھلا

رکھنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے ان کا دھونا اور مسح کرنا ضروری بتلایا۔
تاکہ کوئی تنگی اور دقت نہ ہو۔ ہاں حدث اکبر یعنی جنابت جو احیاناً
پیش آتی ہے اور اس حالت میں نفس کو ملکوتی خصال کی طرف
ابھارنے کے لیے کسی غیر معمولی تنبیہ کی ضرورت ہے، اس کے
ازالہ کے لیے تمام بدن کا دھونا فرض کیا۔ پھر مرض اور سفر وغیرہ
حالات میں کسی قدر آسانی فرمادی۔ (تفسیر عثمانی ص ۱۳۹)

یرید اللہ بکم الیسر ولایرید بکم العسر و لتکملوا العدۃ ولتکبر واللہ علیٰ ما ھداکم (البقرہ:۱۸۵)

اللہ تعالیٰ تم پر آسانی چاہتا ہے اور وہ تم پر کوئی دشواری نہیں چاہتا۔
وہ چاہتا ہے کہ تم (روزوں کی) گنتی پوری کرلو اور بڑائی کہو اللہ کی
اس بات پر کہ اس نے تمہیں ہدایت کی۔

حدیث میں دین میں تنگی نہ ہونے کا بیان

انا امۃ امیۃ لانکتب ولا نحسب. (صحیح مسلم ج۱ ص ۳۴۷)

ہم امت امیہ ہیں (نہ پڑھی ہوئی قوم) لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔
یعنی ہمارے روزمرہ کے مسائل کسی ایسے اصول پر مبنی نہ ہو جائیں جس کو کچھ لوگ
جانیں اور کچھ نہ جانیں۔ دین فطرت وہ دین ہے جس تک رسائی ہر کسی کی ہو سکے چاند
دیکھ کر فیصلہ کرنا یہ ہر کسی کے بس میں ہے اور چاند کی منازل کو جاننا پہچاننا اسے صرف اہل
حق ہی جانتے ہیں۔

یسروا ولا تعسروا

دین میں آسانیاں پیدا کرو اپنے اوپر تنگی لازم نہ کرو۔

ماخیر بین امرین الا اختار ایسرھما مالم یکن اثما.

آپ جب بھی دو باتوں میں سے کسی کے اپنانے کا اختیار دیا گیا تو

آپ نے آسان صورت ہی اختیار کی۔ اگر اس میں کوئی گناہ کی بات نہ ہو۔

اس سے مجموعی طور پر شریعت کا مزاج سمجھ میں آتا ہے کہ حتی الوسع لوگوں پر تنگی ڈالنے سے روکا گیا ہے۔ اسی پر فقہ کا یہ اصول مرتب ہوتا ہے۔

اذا ابتلی احدکم ببلیّتین فلیختر اھو نھما.

جب تم میں سے کوئی شخص دو آزمائشوں میں گھر جائے تو اسے چاہئے کہ آسان کو اختیار کرے۔

آنحضرت ﷺ کی صحابہ رضی اللہ عنہم کو فقہ سکھانے کی محنت

آنحضرت ﷺ نے جنس کو جنس کے بدلے برابر برابر بیچنا تو جائز فرمایا۔ لیکن ان میں کمی بیشی کو سود ٹھہرایا۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آج تازہ کھجور خشک کھجور کے بدلے برابر دی جائے اور کل وہ تازہ کھجور خشک ہو کر اس خشک کھجور سے کم ہو جائے تو کیا اس صورت میں وہ پہلی بیع کہ تازہ کھجور خشک کھجور کے بدلے میں برابر بیچی گئی کیا جائز ٹھہرے گی؟ آنحضرت ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ بعض صورتوں میں شریعت کے احکام معلل بعلت ہوتے ہیں۔ احکام میں علت پر نظر رکھنا ہر کسی کا کام نہیں۔ فقہ پر نظر صرف فقہاء کی ہی ہو سکتی ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کیا خشک کھجور تر کھجور کے بدلے خریدنا درست ہے؟ آنحضرت ﷺ یہ جواب بھی دے سکتے تھے کہ نہیں مگر آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس حکم کی فقہ سمجھائی اور پوچھا کیا تر کھجور خشک کھجور ہو کر وزن میں کم نہیں ہو جاتی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہاں آپ نے پھر فرمایا۔ پھر یہ جائز نہیں اس سودے کو ناجائز فرمایا:

فقال لمن حوله اینقص الرطب اذا یبس قالوا نعم فنھی عن ذلک. (رواہ الترمذی وقال حسن صحیح ج ۱)

قاضی شوکانی نیل الاوطار میں لکھتے ہیں آنحضرت ﷺ کا مقصد اس تفصیل سے

اس کے عدم جواز کی علت بتلانا تھا کہ رطب سوکھ کر جب تمر سے وزن میں کم ہو جائے تو یہ بیع برابر کی برابر سے نہ رہی جب یہ نہیں تو سود متحقق ہو گیا جو حرام ہے۔ (نیل الاوطار)

دیکھئے آپ نے بیان علت حکم میں کس قدر اہتمام فرمایا کہ حضار مجلس کی زبان سے کہلوا دیا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ حکم علت پر متفرع ہوتا ہے۔

ایک بار ایک یہودی کا جنازہ آنحضرت ﷺ کے سامنے سے گزرا۔ آپ ﷺ اس کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے لوگوں نے کہا۔ حضور ﷺ! وہ تو یہودی جنازہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہ ایک جان نہیں جو گئی؟ أیست نفساً۔

(ویویدہ مافی کتاب الاثار۔ للامام محمد)

جنازہ دیکھ کر اٹھنے کی علت کیا تھی؟ ایک جان کا احترام جو دنیا سے گئی یا اس کے ساتھیوں سے انسانی ہمدردی کا اظہار۔ سو یہ حکم غیر مسلم تک کو ممتد ہوگا، حضور ﷺ نے اس کی علت بیان فرما دی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد نہ سنا تھا۔ انہوں نے آپ ﷺ کے اٹھنے کی علت نہ بیان کی کہ یہودی اس جنازہ کے ساتھ بخور جلا رہے تھے، حضور ﷺ کو اس کی بو ناگوار تھی اس لیے آپ وہاں سے اٹھ گئے، اس سے معلوم ہوا کہ مجتہدین ان دونوں حکم کی علت تلاش کرتے تھے اور یہ کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ علت پر نظر کر کے مجتہدین ظاہر نص کے خلاف فتویٰ بھی دیتے تھے اور کوئی اسے حدیث کی مخالفت نہ کہتا تھا۔

کسے معلوم نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے دور میں عورتیں عیدگاہ میں آتی تھیں۔ مگر اس کی علت یہ نہ تھی کہ عورتوں پر عید کی نماز فرض ہے بلکہ ان کا وہاں آنا ایک دینی اجتماع کی حاضری ہوتی تھی جس میں دعوت کا کام ہوتا تھا۔ جو عورتیں نماز پڑھنے کی حالت میں نہ ہوتی تھیں وہ بھی عیدگاہ میں حاضری دیتی تھیں۔ اگر حاضری کی علت نماز ہوتی تو ان عورتوں کو جو ایام میں ہوتیں ان کو عیدگاہ میں آنے کا نہ کہا جاتا۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں۔

فاما الحیض فیعتزلن المصلی ویشھدن دعوۃ

المسلمین. (رواہ الترمذی ج۱)

ایام والی عورتیں نماز سے تو ایک طرف رہتیں لیکن دعوت کے کام میں حاضری دیتیں۔

کوفہ کے جلیل القدر مجتہد امام سفیان الثوری رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۱ھ) اور حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۶ھ) نے اپنے دور میں اس علت پر نظر رکھتے ہوئے دیگر بڑے مصالح کے لیے عورتوں کو عیدگاہ میں آنے سے روک لیا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فقہی فیصلہ بھی یہی تھا۔ مجتہدین کے اس فیصلے پر کسی نے ان پر مخالفت حدیث کا الزام نہ لگایا۔ اس اصول سے کسی صاحب علم کو اختلاف نہ تھا کہ حکم کی علت پر نظر رکھتے ہوئے مجتہد ظاہر نص کے خلاف بھی فتویٰ دے سکتا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

روی عن ابن المبارک انه قال اکره الیوم الخروج للنساء في العیدین...... ویروی عن عائشة قالت لورأی رسول الله ﷺ ما احدث النساء لمنعهن المسجد کما منعت نساء بني اسرائیل ویروی عن سفیان الثوری انه کره الیوم الخروج للنساء الی العید (جامع ترمذی جلد اول باب فی خروج النساء الی العیدین ص۱۷۲)

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں آج میں عورتوں کے عیدین کے لیے نکلنے کو جائز نہیں سمجھتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ اگر دیکھ پاتے جو عورتیں آج کل کر رہی ہیں تو آپ انہیں مسجدوں میں آنے سے ضرور روکتے جیسا کہ بنو اسرائیل کی عورتوں کو عبادت گاہوں میں جانے سے روک دیا گیا تھا اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے کہ عورتوں کا عیدگاہ میں جانا مکروہ ہے۔

آپ نے دیکھا کسی شخص نے ان پر خلاف حدیث کا الزام لگایا؟ نہیں ہرگز نہیں ان دنوں احکام معلل بعلل سمجھے جاتے ہیں اور فتویٰ دینے کے لیے فقہاء کی ضرورت ہوتی تھی۔ حدیث کے ظاہر پر فتویٰ دینے کا رواج نہ تھا۔

حضرت مجاہد کہتے ہیں ایک روز میں اور عطاء اور طاؤس اور عکرمہ رحمہم اللہ بیٹھے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر پوچھا کہ جب میں پیشاب کرتا ہوں تو پیشاب کے بعد ماء دافق (اچھل کر نکلنے والا پانی) نکلتا ہے کیا اس سے غسل واجب ہو جاتا ہے ہم نے پوچھا کیا یہ وہی ماء دافق نکلتا ہے جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ ہم نے کہا غسل تو واجب ہے۔ وہ شخص انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا چلا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جونہی نماز سے فارغ ہوئے آپ نے عکرمہ سے کہا کہ اس شخص کو واپس بلا لاؤ چنانچہ وہ آ گیا۔ آپ نے پھر ہم سے پوچھا۔ کیا تم نے قرآن سے فتویٰ دیا ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔ فرمایا حدیث سے؟ ہم نے کہا نہیں۔ فرمایا صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال سے؟ ہم نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا کس کے قول سے فتویٰ دیا ہے؟ انہوں نے کہا ہم نے اپنی رائے سے یہ فتویٰ دیا ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا۔

لذلک یقول رسول اللہ ﷺ فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد.

اسی لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ سخت ہے۔

پھر آپ نے اس سائل سے پوچھا کہ پیشاب کے بعد جو چیز نکلتی ہے کیا اس کے نکلنے کے وقت تمہیں شہوت ہوتی ہے اس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا اس کے نکلنے کے بعد اعضاء میں استرخا اور ڈھیلا پن آ جاتا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اس صورت میں صرف وضو تیرے لیے کافی ہے غسل کی حاجت نہیں۔ (حقیقۃ الفقہ ص ۱۹۵،۱۹۶)

یہ حضرات مجاہد (۱۰۰ھ) عطاء (۱۱۵ھ) طاؤس (۱۰۵ھ) اور عکرمہ (۱۰۷ھ)

کوئی معمولی درجے کے لوگ نہ تھے مگر آپ نے دیکھا کہ فقہ کے دریا کتنے گہرے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے سوال سے فقہ کے یہ اصول سامنے آئے۔

(۱)......اسلام میں علم کے ماخذ چار ہیں:

۱۔ قرآن، ۲۔ حدیث، ۳۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین،

۴۔ اس امام کا قول جس کی پیروی جاری ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں پوچھا کہ کیا تم نے یہ مسئلہ ان سے لیا ہے؟ انہوں نے چاروں مرتبہ ایک ہی جواب دیا کہ نہیں پانچویں بات انہوں نے اپنی کہی کہ یہ فیصلہ ہم نے اپنی رائے سے کیا ہے۔

(۲)......ان حضرات نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہم نے اپنی رائے سے یہ فیصلہ دیا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ دین میں رائے سے مسئلہ بتلانے میں کوئی عیب نہیں یہ عیب تب ہے کہ کسی نص کے مقابلہ میں ہو۔ جو رائے کسی نص سے متصادم نہیں وہ ہرگز معیوب نہیں۔ اگر رائے سے فیصلہ کرنا معیوب ہوتا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس پر ضرور نکیر کرتے۔

(۳)...... یہ چاروں حضرات مجتہد تھے۔ اگر وہ مجتہد نہ ہوتے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ انہیں ان کے پانچویں جواب پر یہ کہتے کہ تم عامی ہو اور عامی آدمی کو دین کے کسی مسئلہ میں رائے قائم کرنے کا حق نہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ علم کے ہوتے بھی تقلید اعلم جائز ہے۔ اپنے اجتہاد کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

(۴)......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جب دو سوال کیے اور انہیں حکم کی علت ٹھہرایا تو اس پر ان چار حضرات نے اور نہ اس شخص نے جو مسئلہ پوچھنے آیا تھا ان سے ان کی دلیل پوچھی کہ آپ غسل فرض ہونے کے لیے یہ جو شرطیں لگا رہے ہیں یہ کس نص میں مذکور ہیں قرآن میں یا حدیث میں معلوم ہوا اس وقت مجتہد کے قول پر بلا دلیل عمل کرنا اور اس پر اعتماد کرنا کہ وہ کتاب وسنت کی روشنی میں صحیح مسئلہ بتا رہا ہوگا جائز تھا کوئی عیب ہرگز نہ تھا۔

فقہ اعمال کے درجوں میں بہت دقیق ہے لیکن معاملات اور امور سلطنت میں فقہ اور بھی گہری ہو جاتی ہے نظام عبادات کو ترتیب دینا اتنا مشکل نہیں جتنا امور سلطنت کو ایک ترتیب پر لانا مشکل ہے، شافعی فقہاء نظامِ عبادات کی ترتیب میں لگے رہے۔ لیکن فقہائے احناف نے ابتدا سے ہی ابواب السیر کو فقہ کا اہم موضوع گردانا۔ یہ انہی ہی کی کوشش تھی کہ اسلام ایک پورے نظام حیات کے طور پر سامنے آیا۔

علم فقہ اور اس کی تعریف

"الفقه علم بالمسائل الشرعيه" یعنی شریعت کے مسائل کا علم فقہ ہے۔ فقہ کے معنی سمجھ کے ہیں اور اس کے یہی معنی قرآن مجید میں استعمال کیے گئے ہیں۔

وطبع علىٰ قلوبهم فهم لايفقهون ۝ (التوبہ: ۸۷)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اس لیے وہ نہیں سمجھتے۔

لیکن اصطلاح شرع میں فقہ کا لفظ علم دین کے لیے مخصوص ہے اس لیے علم فقہ کا عالم فقیہ کہلاتا ہے ''مجلة الاحكام العدليه'' میں فقہ کی یہ تعریف کی گئی ہے ''یعنی اعمال شرعیہ کے مسائل کا علم فقہ کہلاتا ہے'' لیکن فقہ کی جو تعریف علماء فقہ نے کی ہے وہ اس تعریف سے زیادہ جامع ہے ان کے نزدیک ''فقہ ان فروعی احکام شرعیہ کا علم ہے جو تفصیلی دلائل سے ماخوذ ہو'' (فلسفہ شریعت اسلام ص ۱۴)

فقہ اسلام کے ماخذ

فقہ اسلام کے چار بنیادی ماخذ ہیں۔

۱۔ قرآن مجید ۲۔ سنت نبوی ﷺ ۳۔ اجماع، ۴۔ قیاس

(۱) قرآن مجید

تمام علماء اسلام کا اسی پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید ہی تمام احکام شریعت کا پہلا ماخذ ہے اندلس کا مشہور فلسفی ابن رشد لکھتا ہے ''دیگر کتب سماوی کے مقابلہ میں قرآن مجید

ان عظیم خصوصیات کا حامل ہے کہ یہ بیک وقت کتاب عقائد بھی ہے اور مجموعہ قوانین بھی یہ عظیم خصوصیات قرآن مجید کا اعجاز ہے۔ دوسری کوئی آسمانی کتاب اس وصف میں قرآن مجید کی شریک نہیں ہو سکتی۔" (تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۲۰)

لہٰذا اگر کسی کو کوئی شرعی حکم معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو ایک عالم یا مجتہد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کا بنیادی اصول صرف قرآن مجید ہی میں تلاش کرے۔ اسلامی قوانین کے لیے قرآن مجید کو اصل ماخذ قرار دینے کے لیے کسی مذہبی ثبوت یا دلیل کی ضرورت نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی قوم کے وہ لوگ جو قرآن مجید کو جھٹلاتے تھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں چیلنج دیا گیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ام یقولون افترٰہ قل فاتوا بعشر سور مثلہٖ مفتریٰت وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین ٥ (ہود:۱۳)

یہ کیا کہتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارے معبود ہیں ان کو مدد کے لئے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم انہیں معبود سمجھنے میں سچے ہو۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ام یقولون افترٰہ، قل فاتوا بسورۃ مثلہٖ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین ٥ (یونس:۳۸)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا ہے کہہ دو اگر سچے ہو تو تم بھی اسی طرح کی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکتے ہو بلا لو۔

مگر وہ سب کے سب لوگ اس چیلنج کو قبول کرنے سے قاصر رہے حالانکہ ان میں عربی زبان کے بہت بڑے بڑے ماہر بھی تھے۔ ایسے باکمال لوگوں کی ناکامی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ قرآن مجید فرقان حمید انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ یہ کلام الٰہی ہے

کوئی اسے جھٹلا نہیں سکتا مسلمانوں کے لیے قرآن مجید مکمل ضابطہ حیات ہے۔

(۲) سنت نبوی ﷺ

سنت کے لغوی معنی عادات اور طریقے کے ہیں، محدثین اور جمہور علماء کرام کے نزدیک سنت ہر وہ کام ہے جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قول، فعل یا تائید کی صورت میں صادر ہو۔ سنت نبوی ﷺ قرآن مجید کی تفسیر کرتی ہے اور اس کے مجمل مفہوم کو واضح کرتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سنت قرآن مجید کی تشریح کی حیثیت رکھتی ہے، سنت کی تشریعی حیثیت کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس انذل الیھم ولعلھم یتفکرون ○ (النحل:۴۴)

اور ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کی ہے تا کہ جو (ارشادات) لوگوں کے لیے نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو تا کہ وہ غور کریں۔

یعنی رسول اللہ ﷺ پر کتاب اس لیے نازل کی گئی تھی کہ آپ ﷺ اپنے قول، فعل سے اس کی تعلیمات اور اس کے احکام کی تشریح و توضیح کرتے رہیں اس سے خود بخود یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی سنت قرآن کی مستند اور جامع تشریح ہے۔ اس کے علاوہ بھی قرآن مجید کی آیات ہیں جو سنت کی تشریعی حیثیت پر دلالت کرتی ہیں، قرآن مجید میں جو مجمل فرائض و احکام بیان کیے گئے ہیں نبی کریم ﷺ نے اس کی پوری تفصیل بیان فرمائی ہے جیسا کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے احکام۔

ان فرائض کو ادا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سنت نبوی ﷺ کی پیروی نہ کی جائے، قرآن مجید میں نماز قائم کرنے اور روزہ رکھنے حج کرنے اور زکوٰۃ دینے کے بارے میں حکم ہے لیکن قرآن مجید میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ان کی ادائیگی کس طرح کرنا ہے ان کی ادائیگی کا طریقہ سنت نبوی ﷺ پر عمل کرنے سے پتا چلتا ہے۔

جمہور امت اس بات کے قائل ہیں کہ سنت نبوی ﷺ بھی اسلامی احکام ثابت کرنے کا ایک مستقل ماخذ وسرچشمہ ہے خود قرآنی آیات اس امر پر شاہد ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وما اٰتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا.

(الحشر:۷)

سو جو چیز تم کو رسول دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں (اس سے) باز رہو۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول . (النور:۵۴)

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی فرماں برداری کرو اور رسول اللہ کی فرماں برداری کرو۔

رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد تمام صحابہ کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرنا واجب ہے صحابہ کرام کا عام طریقہ یہ تھا کہ جب انہیں کوئی مسئلہ کتاب اللہ میں نہیں ملتا تھا تو اس موقع پر وہ سنت نبوی ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔

(۳) اجماع

اجماع کے لغوی معنی متفق ہونے اور پختہ ارادہ کرنے کے ہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ''کسی زمانے میں امت اسلامیہ کے مجتہدین کا کسی شرعی حکم پر جمع ہو جانا اجماع کہلاتا ہے'' جمہور علمائے اصول کے نزدیک یہ اجماع کی بہترین تعریف ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے اجماع کا حجت ہونا واضح کیا اس کی تعریف لکھی اور اسے فقہ اسلامی میں معتبر سمجھا۔

جب نبی کریم ﷺ دنیا سے پردہ فرما گئے تو مسلمانوں میں ایسے حوادث و واقعات نے جنم لیا جو صراحتاً کتاب وسنت میں مذکور نہ تھے اور ان کی گرہ کشائی کے لیے

اجماع وقیاس کے اصول وضع کیے گئے۔ (شرح الحدیث والفقہ ص ۵۷۴)

اجماع کا شرعی حجت ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ومن يشاقق الرسول من بعد ماتبين له الهدى ويتبع غير سبيل المومنين نوله ماتولى ونصله جهنم و ساء ت مصيراً O (النساء:۱۱۵)

اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر ﷺ کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستہ کے سوا اور راستہ پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دینگے (اور قیامت) کے دن جہنم میں داخل کرینگے اور وہ بری جگہ ہے۔

اس قرآنی ارشاد پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اجماع کے شرعی حجت ہونے پر دلیل قائم کی ہے اور آپ کے بعد تمام علماء نے اس کو صحیح تسلیم کیا ہے۔حدیث مبارکہ ہے:

عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ قال ان الله لايجمع امتي اوقال امة محمدٍ على ضلالةٍ ويدالله على الجماعة. (ترمذی ج۲ص۳۳)

ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا جماعت پر اللہ تعالیٰ کا دست حفاظت ہے۔

یہ حدیث بھی اجماع کے لیے حجت ہے درحقیقت اجماع کا حجت ہونا ایک یقینی امر ہے کیونکہ اجماع کسی نئے حکم کو پیش نہیں کرتا بلکہ کسی سے ثابت شدہ حکم کو متفقہ طور پر ثابت کرتا ہے۔

حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ بعض دفعہ ہمارے سامنے ایسا معاملہ پیش ہوتا ہے جس کا ذکر کتاب وسنت میں موجود نہیں ہوتا تو نبی

کریم ﷺ نے فرمایا ایسی صورت میں عالم اور عابد مسلمانوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو ان کے سامنے مشورہ کے لیے پیش کرو اور کسی ایک کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

(فقہ اسلام ص ۲۲۲)

(۴) قیاس

اسلامی قانون کا چوتھا ماخذ قیاس ہے قیاس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں فرع (وہ جس کی اصل کوئی اور چیز ہو) کو اصل (سرچشمہ) کے ساتھ علت (سبب) وحکم میں برابر کرنا قیاس کہلاتا ہے۔

جب کسی مسئلہ کا حل کتاب وسنت نبوی ﷺ میں موجود نہ ہو اور اس پر علمائے امت کا اجماع بھی منعقد نہ ہوا ہو تو اس کو قیاس یا رائے کی مدد سے حل کیا جاتا ہے جب رائے اور قیاس کے مفہوم میں توسیع ہوئی تو علماء نے اس کے مفہوم کو متعین کیا اور یہ شرط لگادی جو کوئی اپنی رائے اور قیاس سے فتویٰ دے تو اس کے پیش نظر کوئی خاص بنیادی اصول ہونا چاہیے۔

عراق کے اکثر فقہاء قیاس کے ماہر تھے بالخصوص امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھی قیاس کو صحیح طریقے سے استعمال کرنے میں ضرب المثل تھے ان کی بہت شہرت تھی بالخصوص امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قیاس کے معاملے میں ایسی راہ پر گامزن ہوئے کہ اپنے پیشرؤوں سے سبقت لے گئے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت تیز فہم ذہین اور دوربین تھے علم فقہ کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے انہوں نے علم کلام میں مہارت پیدا کرلی تھی۔

قیاس کا دائرہ عمل انہیں چیزوں تک محدود ہے جن کی حقیقت اور ان کا مفہوم عقل میں آسکے اور جن باتوں کو عقل نہ سمجھ سکتی ہو ان میں قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

صحابہ نے قیاس اور مشورہ کے بعد شراب نوشی کی سزا مقرر کی تھی بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر قیاس سے کام لے کر یہ فرمایا جب کوئی شراب پیتا ہے تو وہ نشے میں مخمور ہو کر بے ہودہ باتیں کرتا ہے اور دوسروں پر تہمت لگاتا ہے اس لیے میری رائے میں اس پر تہمت کی حد مقرر ہونی چاہیے اس قیاس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

شراب نوشی کی سزا تہمت کی سزا کے برابر مقرر کی تھی۔

فقہ کا درجہ کیا ہے؟

اولاً یہ بات ذہن میں رہے کہ فقہ قرآن وحدیث کا غیر نہیں ہے فقہ مسائل غیر منصوصہ نئے سرے سے بناتی نہیں انہیں صرف دریافت کرتی ہے۔ وہ مسائل نصوص شریعت میں پہلے ہی لپٹے اور مخفی تھے یہ مجتہدین کا علمی کمال ہے کہ انہوں نے وہ کھول کر رکھ دیئے اور دریافت کر لیے۔

سائنس نے ذرّے میں کوئی طاقت پیدا نہیں کی۔ ایٹم میں یہ طاقت پہلے سے موجود تھی اور مخفی تھی۔ سائنسدانوں نے اسے دریافت کر کے ایٹم بم بنا دیا۔ فقہ کی اصولی لائنیں پہلے سے کتاب وسنت میں بچھی ہوئی تھیں۔ مجتہدین نے انہیں دریافت کر کے ان پر ہزاروں جزئیات مرتب کر ڈالیں۔

اس گہری کاوش کے باوجود ان جزئیات فقہ کو قطعیت کا درجہ حاصل نہیں۔ نہ ان کے منکر کو کافر کہا جا سکتا ہے۔ کتاب وسنت تو اپنی جگہ قطعی درجے میں واجب القبول ہوں گے لیکن جو مسائل ان سے استنباط اور استخراج کے ذریعے حاصل ہوں انٰ میں وہ قطعیت نہیں آتی۔ سو علم کے مآخذ ہونے کی حیثیت سے اجتہاد نئے حاصل ہونے والے مسائل تیسرے درجے میں ہیں۔ ان کا اکابر امت کو ان دوسرے مجتہدین سے اور آگے رکھا جائے تو پھر فقہ سے حاصل شدہ مسائل چوتھے درجہ میں شمار ہوں گے۔ اصولاً ان کا درجہ تیسرا ہے اور وہ کتاب وسنت کے بعد ہے۔

فقہ کے تیسرے درجہ پر قرآن کی شہادت

یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (النساء:۵۹)

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو (۱) اللہ کی اطاعت کرو، (۲) اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے، (۳) اولی الامر کی اطاعت کرو۔

فقہاء و مجتہدین جو علم شریعت میں ہمارے اولی الامر ہیں انہیں قرآن نے تیسرے درجے میں رکھا ہے۔

قرآن کی دوسری شہادت

فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون. (النحل)

اگر تمہیں کوئی بات معلوم نہ ہو تو اہل علم سے پوچھ لیا کرو۔

اسلام میں علم کا اصل سرچشمہ کتاب وسنت ہیں۔ اگر کوئی ان سے اپنی بات نہیں لے سکتا تو وہ اہل ذکر سے پوچھ لے۔ وہ کتاب وسنت کی روشنی میں اسے بتلادیں گے سو ان کی بات تیسرے نمبر پر رہے گی۔

علم نہ رکھنے والے اہل الذکر کی باتوں کو دلائل و براہین سے پرکھ نہیں سکتے کسی بات کو دلائل و براہین سے جاننا اہل علم کا کام ہے نہ کہ عوام کا۔ ان کا کام بس یہی ہے کہ وہ اہل ذکر پر اعتماد کرتے ہوئے ان سے دلیل طلب کیے بغیر ان کے بتائے پر عمل کرلیں۔ اس آیت کے جملہ ان کنتم لاتعلمون نے جانچ پڑتال کی۔ یہ سب پابندیاں ان پر نرم کردی ہیں۔

اہل کتاب کے بارے میں جاننا ہو تو ان کے اہل ذکر سے پوچھیں۔ اسلام کے بارے میں جاننا ہو تو ان کے اہل علم سے پوچھیں اہل ذکر کا لفظ عام ہے جو دونوں کو شامل ہے۔ آیت کا شان نزول گو کسی ایک سے متعلق ہو۔ قرآن کریم کو اس کے اسباب نزول پر بند نہیں کیا جاسکتا۔

علماء اسلام پہلے بھی اس آیت سے تقلید ائمہ پر استدلال کرتے رہے ہیں۔ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

اما من يسوغ له التقليد فهو العامی الذی لايعرف طرق الاحكام الشرعية فيجوز له ان يقلد عالماً ويعمل بقوله قال الله تعالىٰ فاسئلوا اهل الذكران كنتم

لاتعلمون. (الفقیہ والمتفقہ ج۲ص۶۸)

تو جس کے لئے تقلید کی راہ ہے یہ وہ عامی ہے جو احکام شرعیہ کی راہوں کو نہ جانتا ہو۔ اس کے لیے جائز ہے کہ کسی ایک عالم کی تقلید کرلے اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرے کہ اگر تم نہیں جانتے تو ان سے پوچھ لیا کرو جو جانتے ہیں۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ (۶۰۶ھ) لکھتے ہیں:

ان من الناس من جوّز التقلید المجتهد بهٰذه الاية.

ایسے حضرات بھی ہوئے ہیں جو اس آیت کی رو سے تقلید مجتہد کو جائز سمجھتے ہیں۔

تفسیر روح المعانی میں امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے:

استدل بها علیٰ جواز تقليد العامي في الفروع

(روح المعانی ج۱۴ص۱۴۸)

اس آیت سے فروعات میں تقلید کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے۔

قرآن کی تیسری شہادت

نماز میں ہم سب اللہ رب العزت سے صراط مستقیم پر چلنے کی دُعا کرتے ہیں اور صراط مستقیم اللہ رب العزت کے انعام یافتہ لوگوں کی راہ کا نام ہے، اس صدیقوں شہیدوں اور صالحین امت کا نام من النبیین کے بعد آتا ہے۔ معلوم ہوا اسلام میں ان بزرگوں کی پیروی اللہ اور اس کے رسول خاتم کے بعد تیسرے نمبر پر ہے۔ رسول کی پیروی سے مراد ہے سنت کی پیروی اور صالحین امت کی پیروی سے مراد فقہ کی پیروی ہے۔

انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين. (النساء:۶۹)

جن پر اللہ نے انعام کیا وہ (۱) نبی ہیں، (۲) صدیق ہیں،

(۳) شہداء ہیں اور (۴) صالحین امت ہیں۔

قرآن کی چوتھی شہادت

قرآن کریم نے آنحضرت ﷺ کی پیروی کے ساتھ ہم پر سبیل مومنین کی پیروی فرض کی ہے اور ظاہر ہے کہ اس پیروی کا درجہ حضور پیغمبر خاتم ﷺ کی پیروی کے بعد کا ہے۔ اب تیسرا درجہ اجماع امت کا ہوگیا۔ مجتہد کی پیروی اب چوتھے درجہ میں آجائے گی۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ماتولیٰ ونصله جھنم و ساء ت مصیرا (النساء:۱۱۵)

اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے مسلمانوں کی راہ کے خلاف تو ہم اسے لوٹا دیں گے اسی طرف جدھر وہ خود مڑا اور پہنچائیں گے ہم اسے جہنم میں اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔

بندگان الٰہی کی پیروی قرآن کریم اس طرح لازم کرتا ہے۔

واتبع سبیل من اناب. (لقمان:۱۵)

اور تو راہ چل اس کی جو میری طرف رجوع ہوا۔

سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کی روشنی میں ہم پورے سبیل المومنین کی پیروی کے پابند ہیں اور سورۂ لقمان کی اس آیت کی روشنی میں ہم ہر منیب الٰہی کی پیروی کے پابند ٹھہرے۔ اختلاف ائمہ کی صورت میں ہم کسی ایک کی پیروی کرلیں تو اس آیت پر عمل کا تقاضا پورا ہوجاتا ہے۔ اجماع امت تیسرے درجے کا مآخذ علم ٹھہرا اور تقلید مجتہد چوتھے درجے میں آئے گی۔

حافظ ابن تیمیہ ان دونوں آیتوں کو اس طرح جمع کرتے ہیں:

واتبع سبیل من اناب الی والامة منیبة الی اللہ تعالیٰ

فیجب اتباع سبیلھا. (معارج الاصول ص ۱۲)

اور تو راہ چل اس کی جو میری طرف چلا اور امت اللہ تعالیٰ کے حضور

جھکنے والی ہے۔ سو چاہئے کہ اس راہ کی اتباع واجب ٹھہرے۔

اجتہاد کے تیسرے درجے پر آنحضرت ﷺ کی شہادت

آنحضرت ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنایا تو ان سے پوچھا۔ کیف تقضی اذا عرض لک قضاء جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ آئے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ آپ نے عرض کیا۔ اللہ کی کتاب کے مطابق۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا اگر وہ بات آپ کو کتاب اللہ میں نہ ملے؟ آپ نے کہا تو حضور ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا کہ اگر تو اسے میری سنت میں نہ پائے اور وہ تجھے کتاب اللہ میں بھی نہ ملے تو کیا کرو گے۔ اس پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ۔ اجتهد برای ولاالو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اپنی طرف سے (بات سمجھنے اور اس کا حل نکالنے میں) کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی چھاتی پر (موافقت کا) ہاتھ مارا اور فرمایا۔

الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ ﷺ لما یرضی

رسول اللہ. (سنن ابی داؤد، ج ۲ ص ۱۴۹، مسند امام احمد جلد ۵ ص ۲۳۰، سنن

دارمی جلد ۲، سنن کبریٰ للبیہقی جلد ۱۰ ص ۱۱۴، البدایہ جلد ۵ ص ۱۰۳)

سب حمد اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس چیز

کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ جو چیز قرآن وسنت میں نہ ملے اسے یہ نہ کہنا چاہئے کہ وہ بات دین کی نہیں، ہوسکتا ہے کہ قرآن وحدیث سے اجتہاداً نکالی گئی ہو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے ہمیشہ تیسرا ماخذ شریعت سمجھا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس پر مہر

تصدیق ثبت فرمائی ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو حمص کے کئی بزرگوں نے روایت کیا ہے اس کثرت پر نام لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تاہم حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ (۷۵۱ھ) نے ایک نام عبدالرحمٰن بن غنم رحمۃ اللہ علیہ ذکر کیا ہے عبدالرحمٰن بن غنم رحمۃ اللہ علیہ شامی کبار تابعین میں سے ہیں اور انہوں نے بھی یہ حدیث حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

چاروں مذاہب کے محدثین نے اس حدیث کی تصدیق کی ہے۔

(۱)...... حافظ ابن عبدالبر مالکی رحمۃ اللہ علیہ (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

وحديث معاذ صحيح مشهور رواه الائمة العدول وهو اهل في الاجتهاد والقياس على الاصول. (جامع بیان العلم ج۱ص۷۷)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث صحیح اور درجہ شہرت کو پہنچی ہوئی ہے اسے ائمہ عدول نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث بنیاد ہے اجتہاد کی۔

(۲)...... حافظ ابن قیم حنبلی رحمۃ اللہ علیہ (۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

وهذا اسناد متصل ورجاله معروفون بالثقة. (اعلام الموقعین ج۱ص۱۷۶)

اس حدیث کے جملہ راوی متصل ہیں اور سب ثقہ ہونے میں جانے پہچانے ہیں۔

(۳)...... حافظ ابن کثیر الدمشقی الشافعی رحمۃ اللہ علیہ (۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:

وهذا الحديث في المسند والسنن باسناد جيد كما هو مقرر في موضعه. (تفسیر ابن کثیر ج۱ص۳)

یہ حدیث مسانید وسنن میں سند جید کے ساتھ منقول ہے اور یہ اپنے

موقع پر طے شدہ ہے۔

(۴)......حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

الحديث له شواهد موقوفة عن عمر بن الخطاب وابن مسعود وزيد بن ثابت وابن عباس و قد اخرجها البيهقي في سننه عقب تخريجه لهٰذا الحديث تقوية له. (بذل المجہود ج۵ ص۳۱۰)

اس حدیث میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اجتہاد کے ساتھ رائے کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور حضور ﷺ اسے منظوری بخشی ہے معلوم ہوا مجتہد کے لیے اہل الرائے ہونا کوئی عیب نہیں اور وہ رائے ہرگز عیب نہیں جو کتاب وسنت کی کسی نہ کسی اصل پر قائم ہو، حدیث تو ہر شخص روایت کرسکتا ہے جس میں تثبت اور یادداشت کی قوت ہو، پر اہل الرائے ہونا یہ درجہ اجتہاد ہے جو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ البتہ خود ساختہ رائے کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے اسلام میں اجتہاد کی راہ کھلی۔ اجتہاد کی راہ سے حاصل کردہ مسائل کو فقہ کہا جاتا ہے۔ان کی جڑیں کتاب وسنت میں ہوتی ہیں مگر ان کی شاخیں بہت دور تک جاتی ہیں۔

حافظ ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بھی ایک ایسی ذمہ داری سونپی آپ ﷺ کے پاس دو شخص کسی جھگڑے میں حاضر ہوئے۔تو آپ نے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے کہا اقض بینهما عقبہ رضی اللہ عنہ ان دونوں میں فیصلہ کرادو۔اس پر حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔

يارسول الله اقضي بينهما وانت حاضر قال اقض بينهما فان اصبت فلك عشر حسنات وان اخطأت فلك حسنة واحدة . (احکام القرآن ج۲ ص۲۱۳)

اے اللہ کے رسول ﷺ : میں آپ کی موجودگی میں فیصلہ کروں آپ نے فرمایا تم فیصلہ کرو۔ اگر تم صحیح بات کو جا پہنچے تو تم کو دس نیکیوں کا ثواب ملے گا، اور اگر تم چوک گئے تو تجھے ایک نیکی ملی۔

اس پر حضرت جصاص رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وامر النبی لمعاذ وعقبة بن عامر بالاجتهاد صدر عندنا عن الآية وهو قوله تعالیٰ فان تنازعتم فی شی فردوه الی الله والرسول. لانا متی وجدنا من النبی حكما مواطئا لمعنی قد ورد به القرآن حملناه علیٰ انه حكم به عن القرآن وانه لم يكن حكما مبتدأ من النبی كنحو قطعة السارق وجلده الزانی وما جری مجراهما. (ایضاً)

آنحضرت ﷺ کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کرنے کا کہنا ہمارے نزدیک اس آیت سے ماخوذ ہے کہ جب تم کسی بات میں تنازع میں آؤ تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ، کیوں کہ ہم جب حضور ﷺ سے کوئی بات پائیں جو اس معنی کے مطابق ہو جو قرآن میں وارد ہو چکا تو ہم اسے اس پر محمول کریں گے کہ آپ نے وہ بات قرآن سے کہی ہے اور یہ حکم ابھی نبی سے صادر ہو رہا جیسے آپ کسی چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیں یا کسی زانی کو کوڑوں کی سزا دیں اور ایسی ہی کوئی بات اور ہو۔

آنحضرت ﷺ سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اگر مجھے کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس کا صاف حکم مجھے کتاب وسنت میں نہ ملے تو ایسے موقع پر میں کیا کروں آپ نے فرمایا:

تشاوروا الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه راى خاصة.

(معارف السنن ج ۳ ص ۲۶۵، مجمع الزوائد ج ا ص ۷۸)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو براہ راست اجتہاد کی اجازت دی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوسرے فقہاء سے مشورے کا حکم دیا۔ یہ اس لیے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جہاں جا رہے تھے وہاں کوئی اور اہل علم کا حلقہ موجود نہ تھا۔ کہ آپ ان سے مشورہ کرتے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کی کافی گنجائش تھی۔

اس روایت سے یہ بھی پتہ چلا کہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم بھی موجود اور وہ اپنی جگہ پورے ممتاز تھے اور دوسرے صحابہ مہمات مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔

ان روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں فقہ کا تیسرا درجہ ہے، سنت کے ہوتے ہوئے اس کے مقابل نہ اجتہاد کی اجازت ہے نہ اس کا کوئی مقام، اگر کوئی مسئلہ کتاب وسنت دونوں میں نہ ملے تو ان کی کسی اصل پر اس نئے پیش آمدہ مسئلے کو قیاس کرنا جائز ہوگا یہ عمل اجتہاد کہلاتا ہے، اس میں یہ ضروری ہے کہ قیاس کرنے والے میں اجتہاد کی شرطیں پائی جائیں۔ لوگ یونہی مجتہد نہ بن بیٹھے ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کہ اجتہاد تیسرے نمبر پر ہے

حضور ﷺ کی موجودگی میں اجتہاد تیسرے درجہ میں تھا کہ جب کتاب وسنت میں کوئی بات نہ ملے تو اجتہاد کر لیا جائے۔ لیکن حضور ﷺ کی وفات کے بعد اجتہاد کی راہ عام نہ رکھی گئی، اکابر امت کے فیصلے عام اجتہاد امت پر مقدم ٹھہرائے گئے۔ تاہم کتاب وسنت کو ہر حال میں مقدم رکھا گیا اور اسلامی قانون سازی میں اجتہاد کو سنت کے بعد جگہ دی گئی۔

علامہ شعبی رحمۃ اللہ علیہ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ فیصلے کس طرح کیے جائیں۔۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

عن شریح انہ کتب الیٰ عمر یسالہ فکتب الیہ ان اقض بھافی کتاب اللہ فان لم یکن فی کتاب اللہ فبسنۃ رسول اللہ ﷺ فان لم یکن فی کتاب اللہ ولافی سنۃ رسول اللہ صلی علیہ وسلم فاقض بماقضی بہ الصالحون فان لم یکن فی کتاب اللہ ولافی سنۃ رسول اللہ ولم یقض بہ الصالحون فان شئت فتقدم وان شئت فتاخر ولاأری التاخر الا خیرالک والسلام. (سنن نسائی ج۲ص۳۰۵)

شریح رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا فیصلے کس طرح کیے جائیں آپ نے لکھا کتاب اللہ کے مطابق۔ کتاب اللہ میں نہ ہوں تو سنت رسول اللہ کے مطابق۔ اگر کتاب اللہ میں بھی نہ ہوں اور سنت رسول اللہ میں بھی نہ ہوں تو پہلے اکابرامت جو فیصلے کر چکے ہیں ان کے مطابق فیصلے کرو۔ اور اگر کتاب اللہ میں بھی نہ ہوں اور سنت رسول اللہ میں بھی نہ ہوں اور پہلے صالحین امت میں اس پر کچھ فیصلہ نہ کر پائے ہوں تو چاہے تو آگے بڑھو (یعنی اجتہاد کرلو) اور چاہو تو رُک جاؤ (یعنی یہاں لکھ بھیجو) اور میرے خیال میں تمہارے لئے رکنا بہتر ہے۔ والسلام

مقام اجتہاد کی نزاکت پرغور کریں حضرت عمر رضی اللہ عنہ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ جیسے فاضل اجل کو بھی اس کی کھلی اجازت نہیں دے رہے۔ تاہم شرعاً چونکہ انہیں اجتہاد کا حق پہنچتا تھا اس لیے روکا بھی نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے تشریع اسلامی میں قیاس شرعی کو چوتھا درجہ ملتا ہے۔ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے فیصلے موجود ہوں تو پھر کسی مجتہد کو بھی اجتہاد کی ضرورت نہیں، اکابرامت کے فیصلے بطیب خاطر قبول کرلینے چائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کے بیان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں کو من وعن قبول کرنے کا اشارہ تھا۔

اجتہاد کے چوتھے درجہ پر ہونے کی شہادت

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سریر آرائے مسند علم ہیں، آپ فرماتے ہیں:

فمن عرض له منكم قضاء بعد اليوم فليقض بمافى كتاب الله فان جاءه امر ليس فى كتاب الله فليقض بماقضىٰ به نبيه ﷺ فان جاءه امر ليس فى كتاب الله ولاقضىٰ به نبيه ﷺ فليقض بماقضىٰ به الصالحون فان جاءه امر ليس فى كتاب الله ولاقضى به نبيه ﷺ ولاقضى به الصالحون فليجتهد. (سنن دارمی جلد ا ص ا ۷، سنن نسائی ج ۲ ص ۳۰۵)

تم میں سے کسی کے پاس مقدمہ آئے تو اسے چاہیے کہ وہ قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کرے۔ اگر وہ اسے کتاب اللہ میں نہ ملے تو چاہیے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ اگر وہ اسے کتاب اللہ اور سنت رسول پاک ﷺ میں نہ پائے تو اسے چاہیے کہ وہ اکابر امت ائمہ کرام (جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے) کے مطابق فیصلہ دے اور اگر وہ مسئلہ اسے نہ قرآن میں ملے نہ سنت میں اور نہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہ نے اس کا کوئی فیصلہ دیا ہو تو اب اسے اجتہاد کرنا چاہیے ڈرنا نہ چاہیے (جب ضرورت پیش آئی ہے تو دین میں اس کا حل کیوں نہ ہو)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس بیان میں بھی رائے سے اجتہاد

کرنے کی تلقین ہے یہاں رائے سے وہ رائے مراد ہے جو کتاب وسنت کے اصولوں پر قائم کی جائے، کتاب وسنت سے اس اصل کو تلاش کرنا اور پھر اس پر مسائل پیش آمدہ کو منطبق کرنا یہ اجتہاد ہے جس میں مجتہد اپنی رائے قائم کرتا ہے سو یہ کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے لوگ بلا وجہ بدکنے لگیں۔

سنت کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی نئی راہیں

حدیث معاذ رضی اللہ عنہ کی روشنی میں جب کوئی چیز سنت میں مل جائے تو اصولاً اس کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت نہیں، لیکن سنت اگر پہلے مورد پر بند نہ ہو اور اسے کسی مصلحت کے لئے اختیار کیا گیا ہو تو اس مصلحت کے نہ ہونے کی صورت میں اجتہاداً کوئی دوسرا موقف اختیار کرنا یہ سنت سے ٹکراؤ نہ ہوگا دین کی ایک وسعت شمار ہوگا مثلاً

آنحضرت ﷺ نے اپنے آخری آیام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ امام نماز مقرر کیا۔ اس سے پہلے آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بھی مقرر کر چکے تھے۔ لیکن آپ نے امور سلطنت کے لئے کسی کو اپنا خلیفہ چنا اور پھر مسجد نبوی میں آپ کی بیعت عام ہوئی۔

آنحضرت ﷺ کا یہ طریق کار سب صحابہ رضی اللہ عنہ کے سامنے موجود تھا مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری آیام میں اس سنت پر عمل کرنے کی بجائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس وصیت کے لکھنے والے تھے۔ انہوں نے بھی آپ سے نہ کہا کہ آپ سنت کے خلاف یہ کام کیوں کر رہے ہیں حضور ﷺ نے تو ایسا نہ کیا تھا؟ کسی نے ایسا نہیں کہا معلوم ہوا کہ بعض حالات میں سنت کے ہوتے ہوئے بھی اجتہاد کی راہ اختیار کی جاسکتی ہے۔

پہلی اور دوسری صورت میں اصولی فرق

حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں مجتہد تھے ممکن ہے ان کی اس حدیث کی علت پر نظر ہو اور اس لیے وہ ظاہر حدیث پر عمل پیرا نہ ہوئے ہوں حضور

ﷺ کے اس نامزد نہ کرنے میں یہ سبب نظر آتا ہے۔

حضور ﷺ اگر کسی کو مقرر کر جائیں تو اصولاً وہ امت کے سامنے جوابدہ نہیں ہے حضور ﷺ کے مقرر کردہ پر کبھی کو کسی مسئلے میں انگلی اٹھانے کا حق نہ ہوگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اگر کسی نے آپ کا لمبا کرتہ دیکھ کر یہ سوال اٹھایا کہ یہ کرتا ایک چادر سے کیسے بن گیا تو وہ اسی لیے تھا کہ آپ آنحضرت ﷺ کے مقرر کردہ نہ تھے ،حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا، اب اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے اس عمل کی (کہ آپ نے کسی کو امور سلطنت میں جانشین نامزد نہ کیا، علت پا گئے اور اس موقع پر بوجہ عدم علت اپنا جانشین نامزد کر دیا تو آپ کا یہ عمل سنت سے ٹکراؤ نہیں اسی سنت کی ایک وسعت شمار ہوگا۔

الحمد للہ! اس وقت کسی نے یہ شور نہ کیا تھا کہ دیکھو یہ فقہ والے ظاہر حدیث کے خلاف چل رہے ہیں یہ اسی لیے کہ وہ دور اہل خیر کا تھا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس حدیث پر عمل نہ کیا نہ کاملاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر چلے، انہوں نے اپنا اجتہاد کیا اور چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی نامزد کر دی کہ یہ اپنے میں سے کسی کو خلیفہ چن لیں۔ یہ ایک پہلو سے نامزدگی بھی تھی اور ایک درجے میں یہ انتخاب بھی تھا۔ آپ نے پہلی دوصورتوں کو جائز العمل سمجھا لیکن عملاً ایک تیسری صورت اختیار کی، ایک مجتہد کے لیے دوسرے مجتہد کی تقلید ضروری نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> **ان استخلف فان ابابکر قد استخلف وان لم استخلف فان رسول اللہ ﷺ لم یستخلف.** (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۲، صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۲۰)
>
> اگر میں کسی کو خلیفہ بنا جاؤں تو مجھے حق پہنچتا ہے کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ نامزد کیا تھا اور اگر میں کسی کو خلیفہ نہ بناؤں تو مجھے اس کا بھی حق پہنچتا ہے کیونکہ حضور ﷺ نے امور سلطنت

میں کسی کو جانشین نامزد نہ کیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ حضور ﷺ کے عدم استخلاف کو سنت قائمہ نہیں سمجھا محض ایک سنت کے درجہ میں لیا ہے۔ اس صورت میں کسی دوسرے عمل کی پوری گنجائش رہی ہے اور وہ عمل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا۔ یہ حضرات دین اور مقام سنت کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ اس صورت حال میں یہ پروپیگنڈہ کہ دیکھو اہل فقہ کس طرح ظاہر حدیث کے خلاف چلے ہیں انہی لوگوں کا کام ہے جن کو علم سے بہت کم واسطہ پڑا ہو۔

پہلی اور تیسری صورت میں فرق

آنحضرت ﷺ کے سفر آخرت کے وقت مسلمانوں میں اکثریت صحابہ رضی اللہ عنہم کی تھی کسی غیر صحابی کو خلیفہ نہ چن سکتے تھے اور آپ کو بھی یقین تھا کہ اللہ رب العزت اور امت مسلمہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کو آگے نہ کریں گے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سفر آخرت کے وقت مسلمانوں میں اکثریت غیر صحابہ رضی اللہ عنہ کی تھی۔ اگر آپ حضور ﷺ کے طریقے پر بات امت میں کھلی چھوڑ جاتے تو اصولاً کوئی غیر صحابی بھی قیادت میں آگے آسکتا تھا۔ آپ کی عام پالیسی تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہ کے ہو۔تے ہوئے کسی غیر صحابی کو آگے نہ آنے دیا جائے۔ آپ نے اس مصلحت کے لیے چھ صحابہ نامزد کر دیے جو آخر میں دو رہ گئے۔ اس میں یہ امر بھی ذہنی طور پر طے پا گیا کہ جو بھی چنا جائے دوسرا اس کے بعد بہر حال اولیٰ بالخلافۃ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب اچانک ہوا تو کسی نے ان کی اہلیت خلافت پر کوئی سوال نہ اٹھایا۔ کیونکہ یہ بات اس سے بہت پہلے طے ہو چکی تھی۔

دوسری اور تیسری صورت میں فرق

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا۔ یہ اسلام میں دوسری صورت عمل تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ آدمی نامزد کیے۔ یہ

اسلام میں عقدِ خلافت کی تیسری صورت تھی۔ دوسری صورت اور اس تیسری صورت میں فرق کیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی افضیلت باقی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پر قطعی تھی۔ اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں نامزد کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کیا۔ جنگ احد میں مخالف صفوں میں جب یہ خبر چل نکلی کہ حضور ﷺ شہید ہوگئے ہیں تو انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نام لے کر للکارا تھا۔ جب وہ سمجھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی مارے جاچکے ہیں تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لے کر انہیں للکارا تھا۔ اس وقت ہر کہ دمہ اپنے پرائے کو پتہ تھا کہ مسلم قیادت میں کون سے صحابہ رضی اللہ عنہم آئیں گے۔ سو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ قطعی تھا۔ سو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلا کسی تامل کے آپ کو نامزد کردیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کی یہ وصیت قلم بند کی تھی۔

یہ تین مجتہدوں کا اجتہاد آپ کے سامنے ہے مجتہد کی نظر حکم کے سبب اور حدیث کی علت پر ہوتی ہے۔ وہ کئی دفعہ بظاہر حدیث چھوڑتا نظر آتا ہے۔ مگر وہ حدیث چھوڑ نہیں رہا ہوتا۔ اس کی علت پر نظر کیے وہ کوئی دوسری صورت عمل تجویز کرتا ہے اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ یہ حضرات حدیث کے خلاف چلے اور یہ کہ ان کا حدیث پر عمل نہ تھا۔

قرآن کل بنی نوع انسان کے لیے ہے

جب قرآن کل بنی نوع انسان کے لیے ہے تو جو لوگ عالم نہیں وہ کیا کریں۔ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ وہ کسی عالم کی پیروی کریں۔ قرآن کریم کہتا ہے۔

وتلک الامثال نضربها للناس ومایعقلها الاالعالمون.

(العنکبوت:۴۳)

اور یہ امثال ہیں جس میں ہم تمام لوگوں کے لیے بیان کررہے ہیں مگر انہیں نہیں سمجھ سکتے مگر عالم ہی۔

اور نہ جاننے والوں کے لیے کہہ دیا:

واتبع سبیل من اناب (لقمان:۱۵)

اور پیروی کر اس کی جو میری طرف رجوع لایا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی نے کسی مجتہد کے استنباط پر عمل اختیار کر رکھا ہو اور اسے اس کے مقابل حدیث صحیح مل جائے اور اس کے معارض کوئی دوسری حدیث یا صحابی کا کوئی اثر نہ ہو تو وہ اسے چھوڑ دے۔ کیونکہ وہ مجتہد کی پیروی ایک مصل حتی درجے میں تھی۔ یہ نہیں کہ اس پر ہمارے پاس کوئی آسمانی سند ہو۔ مقام فقہ مقام حدیث کے بعد ہے۔

عہد رسالت ﷺ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی فقہی تربیت

رسول اللہ ﷺ نے قیاس ورائے (فقہی بصیرت) کو خود بھی بعض مواقع میں استعمال فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی نہایت سیدھے سادھے انداز سے اس طریقے کو سمجھایا اور اس کی تربیت کی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے زندگی کے گوناگوں شعبوں میں ان کی تربیت جس انداز سے کی اس کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

حج کی ادائیگی

ایک صحابی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میری بہن نے حج کرنے کی نذر مانی تھی وہ حج نہ کر سکی اور مر گئی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

لو كان عليها دين اكنت قاضيه قال: نعم قال: فاقض دين الله فهو احق بالقضاء. (صحیح البخاری، ج۹ ص۱۹۱)

تیری بہن پر اگر قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کرتا؟ بولا جی ہاں، فرمایا اس کو ادا کر، اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کو ادا کیا جائے۔

یہاں حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے قرض کو انسان کے قرض پر قیاس کیا یہ علت دونوں میں موجود ہے۔ ان میں سے ہر فرض کی ادائیگی ضروری ہے۔

اسی طرح خثعمیہ نامی ایک خاتون نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میرے باپ پر حج فرض ہے۔ لیکن وہ بہت بوڑھا ہے سواری پر بیٹھ نہیں سکتا، کیا میں اس کی طرف

سے حج کر سکتی ہوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے اس پر قرض ہوتا تو تم وہ ادا کرتی؟ تو کیا وہ کافی ہو جاتا اس نے کہا جی ہاں! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو اللہ کا قرض ادا کرنا زیادہ ضروری ہے۔ (نسائی، ج ۲ ص ۴)

ایک خاتون کو بھی فقہی بصیرت سے آشنا کر دیا۔

میاں بیوی کی معاشرتی زندگی کا پہلو

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس وقت رسول اللہ ﷺ سے یہ بات عرض کی کہ ایک دن میں خوشی میں تھا، میں نے روزے کی حالت میں بیوی کا بوسہ لیا۔ (تو کیا روزہ جاتا رہا)

رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: غور کرو اگر تم نے روزے کی حالت میں منہ میں پانی لیا اور اسے منہ میں پھرایا، کلی کی تو کیا ہوگا؟ بولے یہ کوئی حرج کی بات نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو کیا ہوا؟ روزہ پانی کے حلق سے اترنے سے ٹوٹے گا؟ اگر پانی حلق سے نہیں اترا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا؟ (ابوداؤد، ج ۱ ص ۳۳، الحاکم، ج ۱ ص ۸۱۳)

یہاں صرف بوسہ لینا یہ صورت ایسی ہے جیسے منہ میں پانی ڈالا اور وہ حلق سے نیچے نہ اترا۔ روزہ برقرار رہا، علت دونوں میں یکساں ہے لہٰذا جو حکم ایک کا ہے وہی حکم دوسرے کا ہوگا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے ایک مرتبہ عرض کی کہ مالدار صدقہ خیرات کرتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، وہ آخرت میں ہم سے بازی لے جائیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم بھی یہ کرتے ہو، میں نے عرض کیا وہ صدقہ کرتے ہیں، ہم صدقہ خیرات نہیں کرتے، سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے بھی صدقہ ہے۔ تمہارا راستے سے ہڈی اٹھانا صدقہ ہے، تمہارا گناہ سے بچنا بھی صدقہ ہے، تمہارا کمزور کی مدد کرنا صدقہ ہے، اور تمہارا اپنی بیوی سے ہمبستری کرنا صدقہ ہے، میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ہمیں اپنی شہوت پوری کرنے پر اجر دیا جاتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ذرا غور کرو اور دیکھو) اگر تم یہی کام اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور کے ساتھ

کرتے تو کیا تم گنہگار نہ ہوتے؟ میں نے کہا جی ہاں! تو کیا تم اپنے آپ کو شر و بدکاری سے نہیں روکتے ہو، اور کیا تم یہ نیک کام انجام نہیں دیتے ہو، (مسند احمد، ج ۵ ص ۱۵۴)

تو رسول اللہ ﷺ نے قیاس کیا، قیاس کے طریقے سے ان کی رہنمائی فرمائی۔

معاملاتی پہلو

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت سفر میں کسی قبیلے میں اتری (اس زمانے میں ان میں مہمانداری عام تھی لیکن انہوں نے نہیں پوچھا اور ہوٹل وغیرہ کا اس زمانے میں رواج نہ تھا) اتفاقاً اس قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا، انہوں نے اس کے علاج کی کوشش کی وہ سودمند نہ ہوئی، قبیلے کے کچھ لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ان لوگوں سے بھی پوچھو چنانچہ انہوں نے کہا کیا تم میں کوئی سانپ کے کاٹے کا علاج جانتا ہے؟ ان میں سے ایک بولا جی ہاں، میں جانتا ہوں، میرے پاس اس کا منتر ہے لیکن تم نے ہماری مہمانداری نہیں کی۔ اس لئے ہم بھی بلا اجرت اس پر جھاڑ پھونک نہیں کریں گے، چنانچہ بکریوں کے ایک مختصر گلے پر معاملہ طے ہو گیا وہ گیا اور اس نے الحمد شریف پڑھ کر دم کیا، سانپ کا زہر اتر گیا، چنانچہ معاملے کے مطابق جو طے تھا وہ انہیں دیا گیا صحابہ رضی اللہ عنہم میں بعض نے کہا یہ آپس میں تقسیم کرو، چنانچہ دم کرنے والا بولا یہ ابھی نہیں، حضور اکرم ﷺ سے پوچھ کر تقسیم کریں گے، چنانچہ مدینہ آ کر یہ قصہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بتایا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ الحمد اس کا منتر ہے؟ (انہوں نے عرض کی الحمد شریف ہر مرض سے شفا ہے) آپ نے فرمایا تم نے ٹھیک کیا، باہم تقسیم کر دو اور میرا بھی ایک حصہ رکھو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ (صحیح بخاری، ج ۳ ص ۱۲۱)

یہاں نبی اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اجتہاد کی وجہ سے دوہرے اجر ملنے کی خوشخبری سنائی ہے۔ مذکورہ بالا حدیثوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نئے مسائل کے حل میں اجتہاد نہایت کامیاب ترین طریقہ ہے۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ اصول فقہ کے مبادی عہد رسالت ہی میں ظاہر

ہو گئے تھے۔ (الوصول الی قواعد الاصول،ص ۱۶)

تجارت کے پہلو

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لعن اللہ الیھود حرمت علیھم الشحوم فحملوھا فباعوھا (صحیح بخاری، ج۴ص ۲۵۷، صحیح مسلم ،ص ۱۵)

یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار ہو، (گردے، آنتیں، اور معدے کی) چربیاں ان پر حرام کی گئی تھیں۔ انہوں نے اس کو چھوڑا نہیں، انہوں نے ان سے مالی فائدہ اٹھایا، انہیں بیچا اور بیچ کر اس کی قیمت کھائی۔

چربی سے فائدہ اٹھانا حرام تھا، انہوں نے اس کی قیمت سے فائدہ اٹھایا، یہاں دیکھئے ''اکـــل'' (کھانا) بھی (باعث) انتفاع تھا اور خرید و فروخت کر کے مالی فائدہ اٹھانا بھی (باعث) انتفاع ہے۔ دونوں میں علت (انتفاع) یکساں موجود ہے تو حکم بھی دونوں کا یکساں ہوگا۔

رنگ روپ کا پہلو

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ: میرے یہاں کالا بچہ پیدا ہوا ہے، رسالت مآب ﷺ نے پوچھا تمہارے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں موجود ہیں، رسول اکرم ﷺ نے پوچھا ان کے رنگ کیسے ہیں؟ اس نے بتایا وہ سرخ ہیں، پھر سرور عالم ﷺ نے اس سے پوچھا: ان میں کوئی خاکی رنگ کا بھی ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں موجود ہے۔ سرور کونین ﷺ نے فرمایا وہ کہاں سے آیا؟ اس نے کہا ممکن ہے مادہ کی کسی رنگ نے یہ رنگ کھینچ لیا ہو، رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: تو تیرے بیٹے کا رنگ بھی کسی رگ نے کھینچ لیا ہوگا۔ (صحیح مسلم، ج۲ص ۱۱۳۷)

ملاحظہ فرمائیں کہ حضور اکرم ﷺ نے باپ بیٹے کے رنگ روپ کے اختلاف

کو اونٹ کے رنگ روپ کے اختلاف پر قیاس کیا۔ اور آدمی کو بھی فقہی بصیرت کا ڈھنگ بتادیا۔

رسول اللہ ﷺ کے قیاس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک چیز کا حکم اس کی نظیر سے پیش کر کے بتاتے تھے۔ (اصول الجصاص، ج ۲ص ۲۲۴)

چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے فرمایا! تمہاری بیوی سے ہمبستری کرنا بھی صدقہ وخیرات کا حکم رکھتا ہے۔ صحابی نے عرض کیا، کیا ہمیں اس شہوت کی تسکین کرنے میں بھی اجر دیا جاتا ہے؟ رسالت مآب ﷺ نے اس سے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تم یہ کام اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت کے ساتھ کرتے تو تم گنہگار نہ ہوتے؟ (معلوم ہوا جہاں نکاح کی علت نہ پائی جائے گی وہاں یہ کام گناہ اور حرام ہوگا) صحابی نے عرض کی جی ہاں ہوتا، تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس طرح تمہارا بُرے کام پر مواخذہ اور گناہ ہوگا، اسی طرح خیر کے کام پر اجر ملے گا، تو دیکھئے رسول ﷺ نے قیاس کیا اور محظور کا مقابلہ مباح سے کر کے یہ واضح فرمایا کہ جس طرح محظور کے ارتکاب پر گناہ اور محاسبہ ہوتا ہے اس کے مقابل مباح کے ارتکاب پر اجر ملتا ہے۔

بصیرت کے استعمال کی ترغیب اور ہمت افزائی

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ دو آدمی جھگڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اے عمرو، ان کے درمیان فیصلہ کرو، انہوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھ سے زیادہ اس کے حقدار ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں اس کے باوجود تم کرو، انہوں نے عرض کی، اس فیصلے پر مجھے کیا ملے گا؟ میں کیونکر فیصلہ کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم نے ٹھیک فیصلہ کیا تو تمہارے لئے دس نیکیاں ہیں اور اگر تم نے اجتہاد کیا اور اس میں بھول چوک ہوئی تو تمہیں ایک نیکی ملے گی۔ (مسند احمد، ج ۳ص ۲۰۵)

اور عقبہ بن عامر سے بھی اسی طرح سے مروی ہے۔

شرائطِ صلح کی پابندی میں قیدی صحابی رضی اللہ عنہ کی فقہی بصیرت

صلح حدیبیہ ۶ ھ کے بعد حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ جب مشرکین کے چنگل سے بھاگ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آگئے تو صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق قریش نے دو آدمی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیجے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ حضور اکرم ﷺ شرط کے مطابق ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو واپس کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں واپس کیا، جب مدینہ سے باہر نکلے تو ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک کو جان سے مار ڈالا اور دوسرا بھاگ کر واپس حضور اکرم ﷺ کے پاس آ گیا اور ابو بصیر کے کارنامے کی خبر کی، ابو بصیر رضی اللہ عنہ سیف البحر (ساحل سمندر) جا پہنچے۔ یہ خبر جب مکہ میں کچھ مسلمانوں کو لگی تو وہ بھی ابو بصیر رضی اللہ عنہ سے جا ملے اور مشرکین پر حملے شروع کیے۔ (صحیح بخاری، کتاب الشروط، حدیث نمبر ۲۷۳۴)

ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی یہ کام اپنے اجتہاد سے کرتے رہے اور حضور اکرم ﷺ نے ان پر کوئی نکیر اور گرفت نہیں کی اس لئے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حدود و شرائط سے خارج تھے)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مکہ کے مسلمانوں کو جو خط ابو بصیر رضی اللہ عنہ سے جا ملنے کے لئے لکھا تھا وہ حضور اکرم ﷺ کی اجازت سے نہیں لکھا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس پر نکیر بھی نہیں کی۔ اور نہ حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے کافر کو قتل پر کوئی گرفت کی اور نہ ان کے قیام ساحل سمندر پر کوئی باز پرس کی۔ اور نہ ان سے جا ملنے والوں پر کچھ گرفت کی، اس لئے کہ یہ ان کی فقہی بصیرت اور اجتہادی فکر و نظر کا نتیجہ و ثمرہ تھا اور درست تھا۔

نماز کی امامت میں فقہی بصیرت

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: قوم و قبیلے میں جو سب سے بڑا قاری ہو وہ امامت کرے اور قرأت میں سب برابر ہوں تو جو ان میں سنت کا سب سے بڑا عالم

ہو وہ امامت کرے، چنانچہ دو ہم رتبہ اور قریب قریب میں سے ایک کو زیادہ بڑا قرار دینا اجتہادی امر ہے۔ (اصول الجصاص، ج ۲ص ۲۲۳)

حضور اکرم ﷺ کا حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے یہ فرمانا کہ تم اپنی کمزور قوم کے امام ہو، لہٰذا کمزور ترین کی اقتدا کا خیال رکھو، کمزور ترین کو جاننا اجتہادی طریقے سے ہی ہو سکتا ہے۔ (ایضاً)

نماز میں شک اور فقہی بصیرت سے فیصلہ

اسی طرح نماز کے اندر شک میں مبتلا شخص کا ظن غالب پر عمل کرنا یہ بھی ایک اجتہادی امر ہے۔

امان و سفارش

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دودھ شریک بھائی عبداللہ بن ابی سرح کا واقعہ ہے جن کے قتل کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دے دیا پھر بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں ''امان'' دی اور انہیں حضور اکرم ﷺ کے پاس لا کر بیعت کی سفارش کرتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ اس خیال سے کہ اس کے قتل کا حکم دیا جا چکا ہے کوئی اسے آکر قتل کر دے کچھ دیر رکے رہے۔ جب کوئی آگے نہ بڑھا تو رسالتمآب ﷺ نے اس کو بیعت کر لیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ''امان دہی اور سفارش'' اجتہادی کام تھا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان پر نکیر نہیں کی۔ (ایضاً)

میدان جنگ میں انتخاب امیر

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ موتہ ۸ھ میں لشکر روانہ کیا تو فرمایا تھا کہ جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب (۸ھ/ ۶۲۹ء) شہید ہو جائیں تو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ۸ھ/ ۶۲۹ء) کو امیر لشکر بنایا جائے یہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ (۸ھ/ ۶۲۹ء) کو امیر

بنایا جائے، یہ بھی شہید ہو گئے تو لشکر بغیر امیر لشکر رہ گیا، یہاں صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کی ہدایت کے مطابق اپنی فقہی بصیرت سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (۲۱ھ/ ۶۴۲) کو امیر لشکر چن لیا، جب دربار رسالت ﷺ میں اس امر کی اطلاع کی گئی تو رسول اکرم ﷺ نے اس اجتہادی عمل کو درست قرار دیا۔ (ایضاً، ج ۲ص ۲۱۶)

طہارت میں پانی پر قادر نہ رہنے میں فقہی رہنمائی

اسی طرح غزوۂ ذات السلاسل ۷ یا ۸ ہجری میں سردی کی رات، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو احتلام ہو گیا، چنانچہ انہیں یہ ڈر ہوا کہ اگر میں نہایا تو ہلاکت کا خطرہ ہے۔ تیمم کیا اور صبح (فجر) کی نماز پڑھائی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس واقعہ کا تذکرہ رسالت مآب ﷺ سے کیا، حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

یا عمرو صلیت با صحابک وانت جنب؟

اے عمرو! تم نے احتلام کی حالت میں اپنے رفقا کو نماز پڑھا دی؟

(حضرت عمرو فرماتے ہیں) نہ نہانے کی میں نے وجہ بتائی اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیماo (النساء:۲۹)

حضور اکرم ﷺ نے اس قیاس شرعی کو تسلیم کیا، نہ کوئی گرفت کی نہ ملامت اور تقریراً آپ نے ان کے اجتہاد اور فقہی بصیرت کو درست قرار دیا۔ (سنن ابو داؤد، ج ۱ص ۱۴۵)

یہاں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جان کی ہلاکت کی صورت کو تیمم کے جواز کی صورت پر قیاس کیا، کیونکہ دونوں صورتوں میں علت مشترکہ پانی کے استعمال پر قادر نہ رہنا ہے۔ (سنن نسائی، ص ۷۵ مطبوعہ قدیمی کتب خانہ، کراچی)

عن ابی سعید رضی اللہ عنہ ان رجلین تیمما و صلیا ثم وجدا ماءً فی الوقت فتوضا احدھما و عاد

لصلاته ما كان في الوقت ولم يعد الآخر فسالا النبي ﷺ فقال للذي لم يعد اصبت السنة و اجزاتك صلاتك وقال للآخر اماانت فلك مثل سهم جمع

(الاحکام، ج۵ص۹۴)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دو شخصوں نے تیمم کر کے نماز پڑھی، پھر وقت کے رہتے رہتے پانی مل گیا، ایک نے وضو کر کے نماز لوٹائی اور دوسرے نے نماز نہیں لوٹائی۔ پھر ان دونوں نے بارگاہ رسالت ﷺ میں جا کر یہ واقعہ بیان کیا، اور اس کے متعلق حکم پوچھا۔ جس شخص نے نماز نہیں لوٹائی، اس سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے سنت کے مطابق عمل کیا، تم نے جو نماز پڑھی وہ کافی ہوگئی، اور دوسرے شخص سے فرمایا تم کو ثواب کا پورا حصہ ملے گا، یعنی تم نے دونوں نمازوں کا ثواب پایا۔ (اس نے اپنے اجتہاد کی وجہ سے دوہرا اجر پایا)

عن ابن عمر رضي الله عنهما قال قال النبي ﷺ يوم الاحزاب لايصلين احد العصر الا في بني قريظة فادرك بعضهم العصر في الطريق، فقال بعضهم لانصلي حتى ناتيها، وقال بعضهم بل نصلي لم يردمنا ذالك، فذكر ذالك للنبي ﷺ فلم يعنف واحدا منهم. (مسلم، ج۴ص۱۳۶ اوحید الزماں)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا: آنحضرت ﷺ نے جنگ خندق ۵ھ میں (جب جنگ ہوچکی) یوں فرمایا تم میں سے ہر شخص عصر کی نماز بنی قریظہ کے پاس پہنچ کر پڑھے۔ اب نماز کا وقت راستے میں آپہنچا، تو بعض نے کہا

ہم تو جب تک بنی قریظہ کے پاس نہ پہنچ لیں گے۔ عصر کی نماز نہیں پڑھیں گے۔ اور بعض نے کہا ہم نماز پڑھ لیتے ہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہم نماز قضا کریں پھر بارگاہ رسالت ﷺ میں اس واقعہ کا ذکر آیا، رسول اللہ ﷺ نے کسی پر خفگی نہیں کی، ہر ایک کے عمل کو درست قرار دیا۔

عہدِ رسالت ﷺ میں دو مجتہد کی اجتہادی آرا

نماز کا وقت راستے میں ہوگیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں دو جماعت ہوگئیں، ایک نے راستے میں وقت پر نماز ادا کی، اور دوسری جماعت نے بنی قریظہ میں وقت نکل جانے کے بعد نماز پڑھی، دونوں کا انداز فکر ونظر جداگانہ تھا۔ ایک جماعت کی رائے تھی کہ نماز وقت پر ادا کرنے کا حکم ہے۔ لہذا نماز کا وقت راستے میں آگیا ہے۔ یہیں ادا کرنا ہے۔ دوسری جماعت نے بنی قریظہ میں جا کر نماز پڑھی۔ دونوں کی نیت بخیر تھی، اس لئے کسی پر ملامت وگرفت نہ کی۔

اس انداز تربیت سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مجتہد ہر اس مسئلے میں جس میں نص موجود نہ ہو، اپنی فقہی بصیرت پر عمل کرسکتا ہے اس کی رائے درست نہ ہو تو بھی اس سے مواخذہ نہ ہوگا، بلکہ حق کی جستجو میں جو کوشش کی ہے اس کا ایک اجر ملے گا جیسا کہ دوسری حدیث سے ثابت ہے۔ (ایضاً)

قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ حدیث مذکور کی شرح میں رقم طراز ہیں:

قال الامام: هذا فيه دلالة على ان الاثم موضوع في مسائل الفرع و ان كل مجتهد غير ملوم فيما اداه اجتهاده اليه بخلاف مسائل الاصول وكان هولا لما تعارضت عندهم الادلة فالا مر بالصلاة لو قتها يوجب تعجيلها قبل وصول بني قريظة والامر لايصلي الافي

بنی قریظة یوجب التاخیر وان فاتت الوقت فای الظاهرین یقدم وای العمومین یستعمل؟ هذا موضع الاشکال وللنظر فیه مجال. قال القاضی: مفهوم مراد النبی ﷺ الاستعجال الی بنی قریظه دون التوانی لاقصد تاخیر الصلاة نفسها فمن اخذ بالمفهوم صلی حین خاف فوات الوقت، ومن اخذ بظاهر اللفظ اخر ففیه حجة للقائلین بالظاهر وللقائلین بالمفهوم.

(اکمال المعلم بفوائد مسلم للقاضی عیاض علیہ الرحمہ، ج ٦ ص ١١٠)

اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ فروعی مسائل میں (مجتہد سے) بھول چوک معاف ہے۔ اور ان فروعی مسائل میں سے جس مسئلے (کے نتیجے) تک مجتہد کا اجتہاد اسے پہنچائے، اس میں مجتہد کی ملامت و گرفت نہیں کی جائے گی، اس کے برعکس اصول کے مسائل (یعنی عقائد) میں معاف نہیں۔ اور یہ مذکورہ بالا صورت میں جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی نظر میں دلائل متعارض ہو گئے، چنانچہ نماز کو اپنے وقت پر پڑھنے کا حکم تو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ نماز کو بنی قریظہ پہنچنے سے پہلے ادا کیا جائے۔ اور ان لایصلی الافی بنی قریظة۔ کا حکم اس امر کو چاہتا ہے نماز وقت نکلنے کے بعد بنی قریظہ میں پڑھی جائے۔ تو کون سے ظاہر کو مقدم کیا جائے، اور کون سے عام پر عمل کیا جائے؟ قاضی عیاض رحمہ اللہ المتوفی ۵۴۴ھ نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ کی مراد بنی قریظہ تک پہنچنے میں جلدی کرنا تھا نفس نماز کو مؤخر کرنا اس میں سستی اور کوتاہی کرنا مراد نہ تھا۔ جس نے اس مفہوم کو لیا اس نے نماز کے فوت ہونے کے اندیشے سے نماز وقت میں ادا کی اور جس نے ظاہر لفظ کو لیا،

مقصود کو نہ سمجھا اس نے اس پر عمل کیا اور نماز مؤخر کی، تو اس حدیث میں دونوں مکاتب فکر کی دلیل موجود ہے۔ جو مکتب فکر ظاہری الفاظ پر عمل کا قائل ہے۔ اس کی بھی دلیل ہے اور جو مکتبہ فکر منشا و مقصد (بات کی تہہ تک پہنچنے) کا خوگر ہے اس کی بھی دلیل موجود ہے۔

امام محی الدین یحییٰ بن شرف نووی (المتوفی ۶۷۶ھ) فرماتے ہیں:

اما اختلاف الصحابة بالمبادرة بالصلوٰة عند ضيق و قتها و تاخير، فسببه ان ادلة الشرع تعارضت عندهم بان الصلوٰة مامور بها في الوقت مع ان المفهوم من قول النبي ﷺ لايصلين احد العصر الا في بني قريظة، المبادرة بالذهاب اليهم وان لايشتغل عنه بشيء الا ان تاخير الصلوٰة مقصود في نفسه من حيث انه تاخير، فاخذ بعض الصحابة بهذا المفهوم نظراً الى المعنى لا الى اللفظ ، فصلوا حين خافوا فوت الوقت، واخذ اخرون بظاهر اللفظ و حقيقته فاخروها ولم يعنف النبي ﷺ واحدا من الفريقين لانهم مجتهدون، ففيه دلالة لمن يقول بالمفهوم والقياس و مراعاة المعنى، ولمن يقول بالظاهر ايضاً، وفيه انه لا يعنف المجتهد فيما فعله باجتهاده، اذا بذل وسعه في الاجتهاد. (مسلم ج۲ ص۹۶)

نماز کا وقت تنگ ہو جانے کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم میں نماز اپنے وقت میں ادا کرنے، یا اس میں اتنی دیر کرنے میں کہ قضا پڑھنی پڑے اختلاف ہوا۔ اس اختلاف کا سبب یہ تھا کہ شریعت کے دلائل ان کی نظر میں متعارض ہو گئے۔ اس طرح کہ نماز کو وقت

پر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہاں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد: لایصلین احد العصرا و الظهر الافی بنی قریظة کا ایک مفہوم یہ ہے کہ: بنی قریظہ کی طرف جانے میں جلدی کی جائے اور جلدی پہنچنے میں کوئی چیز مانع نہ ہو، محض نماز کی تاخیر مقصود نہیں، لہٰذا بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے ''لایصلین'' کے معنی و منشاء کے پیش نظر وقت پر نماز پڑھی اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ظاہر الفاظ پر عمل کیا اور بنی قریظہ میں جا کر قضا نماز پڑھی۔ اس واقعے کا ذکر جب بارگاہ رسالت ﷺ میں کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے کسی فریق پر نہ گرفت کی نہ ملامت کی، کیونکہ ہر فریق نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا، اس لئے اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوئیں، ا۔ ظاہر الفاظ پر اور ۲۔ قیاس رائے پر عمل کرنا۔ یہ دونوں درست ہیں۔ چنانچہ اس حدیث میں ان لوگوں کی بھی دلیل پوشیدہ ہے۔ جو اجتہاد و قیاس کے قائل ہیں۔ اور معنی و منشا کا خیال رکھتے ہیں اور اس فریق کی بھی دلیل موجود ہے۔ جو ظاہر الفاظ پر عمل پیرا رہتے ہیں، نیز اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ مجتہد کو اس کے اجتہاد پر عمل کرنے میں ملامت نہیں کی جائے گی، جب کہ اس نے حق کی جستجو میں اپنی پوری کوشش کی ہو۔

اس حدیث پر علامہ ابن قیم الجوزیہ (۷۵۱ھ/ ۶۹۱ء) نے سیر حاصل بحث کی ہے وہ بھی ہدیہ ناظرین ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

فقہا کا اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ ان دونوں فریقوں میں سے کونسا فریق زیادہ حق سے قریب رہا ہے؟ فقہا کی ایک جماعت کہتی ہے کہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے نماز مؤخر کی، وہ اپنے اجتہاد میں حق سے قریب رہے۔ اگر ہم ان کے ساتھ ہوتے تو ہم بھی ایسا کرتے، جیسے انہوں نے نماز مؤخر کی، اور ہم بھی بنی قریظہ میں نماز پڑھتے، تاکہ

رسول اللہ ﷺ کے حکم: لایصلین احد العصر الافی بنی قریظة پر عمل پیرا رہتے فی الفور نماز نہ پڑھتے۔اور فقہا کی دوسری جماعت کا قول یہ ہے کہ نہیں بلکہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے راستے میں اپنے وقت پر نماز پڑھی، انہوں نے سبقت کی فضیلت حاصل کی اور دونوں فضیلتوں سے سرفراز ہوئے، اس لئے کہ انہوں نے رسالت مآب ﷺ کے حکم کو (۱) جلد از جلد پورا کرنے کی کوشش کی، (۲) اور اپنے وقت پر نماز پڑھنے میں سرور کونین ﷺ کی رضا جوئی کی خاطر جلدی کی، (۳) پھر قوم کے ساتھ جا ملنے میں بھی جلدی کی۔ تو انہوں نے جہاد کی فضیلت بھی پائی، نماز کو اپنے وقت میں پڑھنے کی فضیلت بھی حاصل کی اور رسول اللہ ﷺ کے منشا کو پانے میں بھی کامیاب رہے یہ جماعت دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ فقیہ نکلی اور خاص کر یہ نماز تو عصر کی نماز تھی، اور یہی صلاۃ الوسطی ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کی اس صحیح صریح نص کی وجہ سے، جس کا کوئی معارض نہیں اور اس میں کوئی طعن بھی نہیں۔ نماز عصر کی پابندی کرنے میں اس میں تاخیر نہ کرنے، اس کو جلدی پڑھنے کے متعلق حدیث میں تاکید آئی ہے۔ اس کے متعلق یہ حدیث بھی موجود ہے کہ جس سے یہ نماز فوت ہوئی تو گویا اس کے اہل وعیال اور مال سب برباد ہو گئے، اس کا عمل ضائع ہو گیا۔ پس جو تاکید اس نماز کے متعلق نہیں آئی۔ بہر حال جن حضرات نے نماز مؤخر کی ان کے پاس بھی نماز مؤخر کرنے کا عذر موجود ہے۔ ان کو ایک اجر ملے گا، یہ اس لئے ملا کہ انہوں نے ظاہر نص کو نہیں چھوڑا ان کی غرض اس سے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل تھی اسی لئے حق تک رسائی میں ان دونوں میں سے کوئی بھی خطا کار نہیں۔ بلکہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے راستے میں نماز پڑھی، انہوں نے دونوں دلائل میں موافقت اور تطبیق کی دونوں فضیلتوں کو حاصل کیا۔ اس لئے ان کے دوہرا اجر ہے اور دوسرے حضرات بھی اجر کے مستحق ہیں۔ (زاد المعاد، المنار الاسلامیہ ج ۳ ص ۱۳۱)

آپ نے دیکھا کہ جس جماعت نے نماز وقت پر ادا کی اس نے اپنی فقہی بصیرت سے گوناگوں اجر کس خوبی سے سمیٹے! یہی وہ راز ہے جس کی بناء پر فقیہ اللہ تعالی کے یہاں محبوب وپسندیدہ ہوتا ہے اور اس کا مرتبہ دوسروں سے بلند تر رہتا ہے۔

رسول ﷺ کا اپنی رائے کے بجائے صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے سے اتفاق

ان الامر لماضاق علی المسلمین فی حرب الاحزاب، وکان فی الکفار قوم من اهل مکة عونالهم رئیسهم عینیة بن حصن الغزاری، ابوسفیان بن حرب، بعث رسول الله ﷺ الیٰ عینیة وقال: ارجع انت و قومک ولک ثلث: ثمار المدینة، فابی الا ان یعطیه نصفها فاستشار ذی ذلک الانصار و فیهم سعد بن معاذ و سعد بن عبادة رئیسا الاؤس وٗالخزرج فقالا: هذا شیء امرک الله به ام شی رایته من نفسک قال، لابل رائی رائیته من عند نفسی، فقالا: یارسول الله لم ینالوا من ثمار المدینة الابشراء او بقری فاذا اعزنا الله بالاسلام لا ،عطیهم الدنیة، فلیس بیننا و بینهم الا السیف، وفرح بذلک رسول الله ﷺ ثم قال للذین جاو ابالصلح : اذهبوا فلا تعطیهم الا السیف (کشف الاسرار علی اصول فخر الاسلام البز دوی، ج۳ ص۲۱۰)

غزوہ احزاب میں مسلمانوں پر جب جنگ کا معاملہ پریشان کن ہوگیا اور کفار (کے لشکر) میں مکہ کے لوگوں کی ایک جماعت ان کی معاونت کررہی تھی ان کے سردار عینیہ بن حصن اور ابوسفیان بن حرب تھے تو رسول اللہ ﷺ نے عینیہ کے پاس (ایک قاصد) بھیجا اور فرمایا: تو اور تیری قوم (کفار کی نصرت و مدد چھوڑ کر) مکہ

لوٹ جائے تو تمہارے لئے مدینہ کے پھلوں کا تیسرا حصہ ہوگا تو اس نے صاف انکار کر دیا، مگر یہ کہ آپ ہمیں آدھے پھل دیں تو آنحضرت ﷺ نے اس معاملے میں انصار سے مشورہ کیا اور ان میں قبیلہ اوس و خزرج کے سردار حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما بھی تھے تو ان دونوں نے حضور سے پوچھا اس بات کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے یا یہ آپ کی ذاتی رائے ہے؟ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ یہ میری اپنی رائے ہے۔ تو انہوں نے عرض کی، یا رسول اللہ! ان مکہ والوں کو خرید و فروخت اور مہمانداری کے علاوہ مدینہ کے پھل نہیں ملے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی بدولت عزت عطا فرمائی ہے تو ہم ان کو گئی گزری چیز بھی نہیں دیں گے، ہمارے اور ان کے درمیان میں (فیصلہ کن چیز) صرف تلوار ہے، رسول اللہ ﷺ (ان کی) اس بات سے مسرور ہوئے پھر ان کی طرف سے صلح کے لئے آئے ہوئے لوگوں سے کہا: جاؤ، اب تو ہم ان کا تلوار ہی سے فیصلہ کریں گے۔

رائے کے استعمال پر اظہار مسرت

عن رجال من اصحاب معاذ: ان رسول الله ﷺ لما بعثه الى اليمن، قال: كيف تقضى ؟ قال: بكتاب الله عزوجل قال: فان لم تجد فى كتاب الله ؟ فقال: بسنة رسول الله ﷺ قال: فان لم يكن فى سنة رسول الله؟ قال: اجتهد برايى، فقال: الحمدلله الذى وفق رسول رسول الله لما يحبه رسول الله ، فأجاز له الا جتهاد فيما لانص فيه. ومن جهة اخرىٰ ان هذا الخبر

قدتلقاه الناس بالقبول، واستقاض، واشتهر عندهم من غير نكير من احدٍ منهم على رواية، ولا ردله وايضاً: فان اكثر احواله ان يصير مرسلا، والمرسل عندنا مقبول. (اصول الجصاص، ج۲ص۲۲۲)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے انہیں جب یمن کی طرف (قاضی بنا کر) بھیجا تو پوچھا! (جب تمہارے سامنے کوئی مسئلہ آئے گا) کیسے فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا: کتاب اللہ کے موافق رسول اللہ ﷺ نے پوچھا! اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ؟ عرض کی! رسول اللہ ﷺ کی سنت کے موافق سرکار دو عالم ﷺ نے پھر پوچھا! اگر سنت رسول اللہ ﷺ میں نہ ملے؟ عرض کی اپنی رائے و اجتہاد سے فیصلہ کروں گا۔ تو سرور کونین ﷺ نے (اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے) فرمایا: جس نے رسول اللہ ﷺ کے رسول وسفیر ایسی چیز کی توفیق عنایت فرمائی جس کو اللہ کا رسول پسند کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے ان کو غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کی اجازت عطا کی تھی، اس حدیث کو عوام وخواص میں قبول عام حاصل ہے اور اہل علم کے یہاں اس حدیث کو بغیر کسی انکار و زد کے شہرت حاصل ہے۔ نیز (یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے) کہ بیشتر راویوں نے اس حدیث کو مرسل روایت کیا ہے اور مرسل ہمارے (حنفیہ) کے یہاں مقبول اور قابل حجت ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ارشاد (اجتهد برائی) کی تشریح صحیح البخاری وسنن ابی داؤد کے اولین شارح امام ابوسلیمان الخطابی المتوفی ۳۸۸ھ نے ان الفاظ میں کی ہے:

قال الخطابي اجتهدبرائي يريد الا جتهاد في

ردالقضية من طريق للقياس الىٰ معنى الكتاب والسنة ولم يرد الرائى الذى يسخ له من قبل نفسه اويخطر بباله من غير اصل من كتاب اوسنة وفى هذا اثبات القياس وايجاب الحكم به (معالم السنن، ج۴ص۱۵۳، بذل المجہود، ج۴ص۳۰۹)

''اجتہد رائی'' سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مراد وہ اجتہاد ہے جس میں قیاس کے ذریعہ غیر منصوص مسئلے کے حکم کو قرآن وسنت کے معنی ومنشاء کی طرف لوٹایا جائے۔ نہ کہ اس رائے کی جو محض نفسانی خواہش کی بنا پر ظاہر ہو۔ یا وہ رائے جو قرآن وسنت کی اصل کے بغیر یوں ہی دل میں کھٹکنے لگے۔ یہ حدیث قیاس کے ثبوت کی دلیل ہے۔ نیز اس امر کی دلیل ہے کہ قیاس جو حکم ثابت کرتا ہے اس پر عمل کرنا ضروری اور واجب ہے۔

فقہاء محدثین میں حافظ ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث کے ماخذ وسند کے متعلق فرماتے ہیں۔

هذا الحديث فى المسند والسنن باسناد جيد.

(تفسیر القرآن العظیم، ج۱ص۴)

یہ حدیث مسند احمد اور سنن کی کتابوں میں عمدہ سند کے ساتھ آئی ہے۔

فقہی بصیرت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آراستگی

اکثر و بیشتر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس صفت سے آراستہ تھے۔ اور اس صفت کے اصل مصداق رسول ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، چنانچہ شیخ الاسلام ابواسحاق شیرازی شافعی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۴۷۶ھ ''طبقات الفقہاء'' میں رقم طراز ہیں۔

اعلم ان اكثرا صحاب رسول الله ﷺ الذين صحبوه

و لازموہ، کانوا فقھاء وذلک ان طریق الفقه فی حق الصحابة (رض) خطاب الله عزوجل، و خطاب رسول (ﷺ) وما عقل منهما وافعال رسول الله ﷺ وماعقل منها فخطاب الله عزوجل هو القران الکریم وقد انزل ذلک بلغتهم علی اسباب عرفوها وقصص کانوا فیها فعرفوا مسطوره، و مفهومه، ومنصوصه، و معقوله، ولهذا قال ابوعبید فی کتاب المجاز: لم ینقل ان احداً من الصحابة رجع فی معرفة شی فی القران الکریم الیٰ رسول الله (ﷺ) وخطاب رسول الله (ﷺ) ایضاً بلغتهم یعرفون معناه ویفهمون مبهمه وفحواه، وافعاله هی التی فعلهامن العبادات والمعاملات والسیر والسیاسات وقد شاهدوا ذلک کله، وعرفوه، وتکرر علیهم، و بحیروه ولهذاقال ﷺ اصحابی کا لنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم ولان من نظر فیما نقلوه عن رسول الله (ﷺ) من اقواله وتامل ماو صفوه من افعاله فی العبادات و غیر ها اضطروه الیٰ العلم بفقہم و فضلهم، غیر ان الذی اشتهر منهم بالفتاویٰ والا حکام وتکلم فی الحلال والحرام جماعة مخصوصة. (طبقات الفقہاء، ص ۳)

اس حقیقت کو سمجھو کہ رسول اللہ ﷺ کے اکثر و بیشتر صحابی جنہوں نے ان کی صحبت اٹھائی اور ان سے وابستہ رہے، وہ سب فقیہ ہیں اور بلاشبہ یہ فقہ (شریعت کو سمجھنے سمجھانے) کا طریقہ صحابہ رضی اللہ

عنہم کے حق میں آیا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے خطاب (اوامر و نواہی) اور اس کے رسول ﷺ کے خطاب سے جو کچھ سمجھا اور رسول اکرم ﷺ کے افعال و اعمال اور تقریرات (معرضِ بیان میں آپ ﷺ کے سکوت کرنے اور نکیر نہ کرنے) کو جانا اور سمجھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے۔ وہی قرآن کریم ہے۔ جو انہی کی زبان میں ہے۔ ان اسباب کی وجہ سے جنہیں یہ جانتے اور ان واقعات کے تحت جو ان کے سامنے پیش آئے تھے یہ ان سے واقف تھے، اتارا گیا انہوں نے نوشتۂ وحی کو سمجھا اس کے منشا و مطلب کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کے صریح اور غیر صریح احکام کو سمجھا۔ ابوعبید قاسم بن سلام (المتوفی ۲۲۴ھ) نے ''کتاب المجاز'' میں کہا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی صحابی سے منقول نہیں کہ اس نے قرآن کی کسی صریح وصاف بات کو سمجھنے میں رسول اللہ ﷺ سے رجوع کیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا خطاب ان سے انہی کی زبان میں ہوتا تھا وہ اس کے معانی و مطالب کو جانتے اس کی مبہم بات کو سمجھتے تھے۔ اس کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے وہ افعال جن کا تعلق عبادات، معاملات، عادات و اطوار اور سیاسات سے ہے، ان سب کا انہوں نے مشاہدہ کیا، دیکھا، اور سمجھا تھا۔ اور جو باتیں ان کے سامنے بار بار آتی تھیں ان کی گہرائی تک پہنچتے تھے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا تھا: اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ستاروں کی طرح رہنما ہیں تم جس کی پیروی کرو گے رہنمائی پاؤ گے۔) اس لئے جو کوئی رسول اللہ ﷺ کے ان اقوال میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم نے نقل

کئے ہیں غور و فکر کرے گا اور ان اعمال میں جن کا تعلق عبادات وغیرہ سے ہے، نقل کرے گا وہ ان کے علم و دانش، فہم و فراست اور فضل و کمال کی طرف اپنے آپ کو مجبور و محتاج پائے گا، یہ اور بات ہے کہ ان اکثر و بیشتر صحابہ رضی اللہ عنہم میں وہ صحابہ جنہیں فتویٰ دینے، حلال و حرام سے بحث کرنے (اور مشکل مسئلوں کا حل نکالنے) میں شہرت حاصل تھی وہ ایک مخصوص جماعت تھی۔

عہدِ رسالت ﷺ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد

عہدِ رسالت ﷺ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی کل تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تھی۔ (مقدمہ ابن الصلاح ومحاسن الاصلاح، ص ۴۹۴) ان میں اکثر و بیشتر فقیہ تھے۔ لیکن ہر ایک صحابی رضی اللہ عنہ مجتہد نہ تھا اور نہ وہ اپنے آپ کو فتویٰ دینے کا اہل سمجھتا اور نہ اسلامی معاشرے میں اس کو اس اہم ذمہ داری کا اہل سمجھا جاتا تھا۔

مجتہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

صحابہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا تعداد میں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن سے بکثرت فتویٰ منقول ہیں ایسے کل سات مجتہد صحابی ہیں اور جن سے کم فتوے منقول ہیں وہ تیرہ مجتہد صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور جن سے کم تر صرف ایک دو فتوے منقول ہیں وہ ایک سو بیس ہیں۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی کل تعداد میں صرف سات ہی سر برآوردہ مجتہدین کو شمار کیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ سولہ ہزار دو سو پچاسی صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظیم جماعت میں صرف ہمیں ایک ہی عظیم ترین مجتہد نظر آتا ہے۔

اور اگر ان تیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جن کے فتوے کم منقول ہیں ان سات عظیم ترین مجتہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جن سے بکثرت فتوے منقول ہیں، ملائیں تو ان عظیم ترین اور عظیم تر سب کی تعداد بیس ہو جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پانچ ہزار سات سو کی جماعت میں ہمیں ایک مجتہد ملتا ہے۔

مجتہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے تین طبقات

علامہ ابن حزم المتوفی ۴۵۶ھ نے عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کے تین طبقات بیان کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

لم ترو الفتیا فی العبادات والاحکام الا عن مائة ونیف وثلاثین منهم فقط من رجل و امراة بعد التقصی الشدیدة. (الاحکام، ج۵ ص۹۲)

عبادات اور ایسے مسائل میں جن میں شریعت کا حکم درکار ہوتا ہے فتوے دینے والے صحابی اور صحابیہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا بہت چھان بین کے بعد پتہ لگ سکا ہے۔ ان کی تعداد ایک سو تیس سے کچھ اوپر ہے، ان مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کے تین طبقات ہیں۔

۱۔ پہلا طبقہ مکثرین صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ یہ وہ ارباب فتویٰ صحابی ہیں جن کے فتووں کی سنن و آثار کی کتابوں میں اتنی کثرت اور بہتات ہے کہ انہیں یکجا کیا جائے تو ایک بڑی موٹی جلد تیار ہو جائے۔

۲۔ دوسرا طبقہ متوسطین صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے یہ ان ارباب فتویٰ صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے جن کے فتووں کی کتب و آثار و سنن میں اتنی کثرت نہیں کہ موٹی سی ایک کتاب بن جائے لیکن اتنی تعداد ضرور منقول ہے کہ ان سے ایک رسالہ ترتیب پا جائے۔

۳۔ تیسرا طبقہ مقلین کا ہے یہ ان ارباب فتویٰ صحابہ رضی اللہ عنہ کا طبقہ ہے جن سے اتنے فتوے بھی حدیث کی کتابوں میں منقول نہیں کہ ایک چھوٹا موٹا رسالہ ہی بنایا جاسکے۔ بس ایک دو فتوے ہی منقول ہیں وہ ایک جز (ایک یا دو ہی ورق) میں آجائیں گے۔

چنانچہ علامہ ابن حزم اندلسی المتوفی ۴۵۶ھ لکھتے ہیں کہ:

مکثرین: کثرت سے فتوے دینے والے سات ارباب فتویٰ صحابی یہ ہیں،

۱۔ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا،۲۔حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ان کے فرزند،۳۔حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ،۴۔حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب، ۵۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، ۶۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ۷۔حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ سات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں ان میں سے ہر ایک کے فتووں کو جمع کیا جائے تو وہ ایک موٹی کتاب بن جائے،ابوبکر محمد بن موسیٰ بن یعقوب بن امیر المومنین مامون نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے فتووں کو جمع کیا تو وہ بیس کتابوں میں یکجا ہوئے تھے،ابوبکر محمد جس کا ذکر اوپر آیا ہے یہ علم فقہ و حدیث میں آئمہ اسلام میں سے ایک تھے۔

متوسطین میں وہ ارباب فتویٰ صحابی ہیں جن سے زیادہ فتوے منقول نہیں ان میں:

۱۔ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا،۲۔حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، ۳۔حضرت ابوسعید خدری،۴۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ،۵۔حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ۶۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، ۷۔حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ،۸۔حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ،۹۔معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، ۱۰۔حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ، ۱۱۔حضرت سعد بن الوقاص رضی اللہ عنہ، ۱۲۔حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ،۱۳۔حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ شامل ہیں یہ تیرہ ۱۳۔صحابی رضی اللہ عنہم ہیں۔

ان میں سے ہر ایک کے فتوے اگر جمع کیے جائیں تو ایک چھوٹا رسالہ بن جائے گا۔انہی میں ۱۔حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، ۲۔حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، ۳۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، ۴۔حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ، ۵۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، ۶۔حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ، ۷۔حضرت معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہ کے ناموں کو اور بڑھایا جائے (تو ۱۳ میں سات کا اور اضافہ کیا جائے تو متوسطین کی تعداد بیس تک پہنچ جائیگی اس صورت میں مکثرین اور متوسطین کی مجموعی تعداد ستائیس ہو جائے گی)

باقی سب مقلین وہ صحابی ہیں جن میں ہر ایک سے ایک دو فتوے ہی منقول ہیں اور وہ بہت مختصر ہیں، ورق دو ورق سے زیادہ نہیں ہیں، ان سے ہر ایک کے فتووں کا بہت مختصر جزء بنے گا۔ (الاحکام، ج ۵ ص ۹۲، ۹۳)

مکثرین، متوسطین صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجموعی تعداد کے پیش نظر علامہ ابن الہمام المتوفی ۸۶۱ھ نے شرح فتح القدیر میں لکھا ہے:

لا تبلغ عدة المجتهدين الفقهاء منهم اکثر من عشرين

(شرح فتح القدیر، ج ۳ ص ۳۳۵)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہ کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں پہنچتی ہے۔

ان ارباب فتویٰ صحابہ کی مجموعی تعداد ایک سو سترہ سے کچھ اوپر ہے۔ ان میں ایک سو بیالیس ۱۴۲ صحابی رضی اللہ عنہم اور بیس ۲۰ صحابیہ رضی اللہ عنہن ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ایک سو باسٹھ ہی ہوتی ہے۔ (ایضاً)

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مسلم معاشرے میں جب کبھی اور جہاں کہیں نت نئے مسائل پیش آئے، اکثر و بیشتر انہی سات اکابر مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہ میں کسی نہ کسی کے پاس جا کر مسئلہ کا حکم، اس کا حل اور جواب پوچھا جاتا تھا اور جس سے معلوم کیا جاتا وہ اپنی مجتہدانہ بصیرت سے کبھی فوراً جواب دے کر سائل کو عمل کا راستہ بتاتا تھا جیسا کہ کسی نے میراث کا ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ دوران خطبہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا، اور آپ نے اسی وقت اس کا حل بتایا وہ جواب آج بھی مسئلہ منبریہ کے نام سے مشہور ہے، کبھی سائل سے کہا جاتا کہ بعد میں اس کا جواب دیا جائے گا، چنانچہ غور و فکر میں کبھی ایک مہینہ گزر جاتا تھا چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مہر اور میراث مفوضہ کے مسئلے کا جواب ایک مہینے کے بعد دیا تھا۔ (سنن ابی داؤد، ج ۱ ص ۲۸۸)

اور جب انہیں معلوم ہوا کہ اس مسئلہ کا رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی جواب دیا تھا تو ایسی خوشی ہوئی تھی کہ زندگی میں عظیم کارنامے انجام دینے پر انہیں اتنی خوشی و مسرت

نہیں ہوئی ہوگی، جتنی اس مسئلہ کے حل اور رسالت مآب ﷺ کے جواب کے ساتھ مطابقت وموافقت سے ہوئی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کی فطرت میں کیسا عظیم اجتہادی ملکہ ودیعت کیا گیا تھا۔ اور بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضری، صحبت و خدمت نے صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایسا جلا ونور بخشا تھا کہ مشکل سے مشکل مسئلے کو حل کرنا اور اس پر عمل کرنا انہیں آسان تھا۔ ان اکابر مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجتہدانہ صلاحیت اور فقیہانہ بصیرت، مزاج شریعت سے مناسبت اور اس میں رسوخ وپختگی نے انہیں مرجع خلائق بنایا تھا، مسائل کے حل میں سب کی نگاہیں انہی کی طرف اٹھتی تھیں اور انہی کے بتائے ہوئے مسئلوں پر عمل کیا جاتا تھا۔ مذکورہ بالا مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہر مجتہد نے جن مسائل کو حل کیا یہ انفرادی اجتہادی مسائل کا ذخیرہ ہر مجتہد کے انداز فکر ونظر کا شاہد اس کی اجتہادی آراو نظریات کا جامع اور اس کی اصابت رائے کا شاہکار ہے۔

مذکورہ بالا مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہادی کام کی ابتدا عہد رسالت میں مدینہ منورہ سے ہوئی جیسا کہ گزر چکا، پھر جیسے جیسے اسلامی قلمرو کی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، ان کی اجتہادی سرگرمیوں کا دائرہ بھی اسلامی مملکت کے مرکزی شہروں میں وسعت اختیار کرتا گیا، ان کی تعلیمی وتربیتی مساعی سے ان کے طلبہ اور شاگردوں میں اجتہادی سلیقہ پروان چڑھتا گیا، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے اس بنیادی فریضے کو اسلامی قلمرو کے وسیع تر علاقے کے مرکزی شہروں میں انجام دینا شروع کیا۔

ان سات مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کے جس مجتہدانہ کام کا آغاز عہد رسالت ﷺ میں مدینہ سے ہوا تھا وہ سارے اسلامی قلمرو میں پھیلا اور ان مکثرین صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہادی کام کا سلسلہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی وفات پر ساتویں دہائی کے وسط میں اختتام پذیر ہوا اور ان کے نامور شاگردوں نے اس سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن اس کا دائرہ انفرادی کوششوں تک

محدود رہا، اور اسلامی قلمرو کی مقامی اور وقتی ضرورتوں کو پورا کرتا رہا۔ مگر شورائی نظام اجتہادی جس کا آغاز حضرت عمر رضی اللہ عنہم نے اپنے دور خلافت میں کیا تھا وہ اکابر مجتہدین کے اسلامی قلمرو میں مامور کئے جانے سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔

عہد رسالت ﷺ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی خدمت افتاء

فتوے دینا رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی تھا، قرآن میں اس کا ذکر ہے:

یستفتونک (النساء:۱۷۶،۱۷۷)

صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ سے فتویٰ لیتے ہیں، شرعی حکم معلوم کرتے ہیں۔
چنانچہ رسالت مآب ﷺ فتویٰ دیتے تھے، آپ نے بعض مہاجر و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کی بھی تربیت کی تھی اور وہ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی اجازت سے فتویٰ دیتے تھے۔
ان میں چھ صحابہ رضی اللہ عنہم کو شہرت حاصل تھی: تین مہاجر اور تین انصار تھے، چنانچہ حضرت سہل بن ابی خیثمہ ساعدی رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں:

کان الذین یفتون علی عھد رسول اللہ ﷺ ثلاثۃ من، المھاجرین و ثلاثۃ من الانصار، عمر، و عثمان و علی و ابی بن کعب و معاذ بن جبل، و زید بن ثابت.

(الطبقات الکبریٰ، ج ۲ ص ۳۵۱)

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فتویٰ دیتے تھے ان میں تین حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم تھے۔ اور تین حضرت ابی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم انصاری تھے۔

علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ ھ) فرماتے ہیں مجھے احادیث و آثار کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ زمانہ رسالت میں افتاء کی خدمت انجام دینے والے صحابہ آٹھ

تھے، میں نے انہیں دو شعروں میں نظم کیا ہے، وہ شعر یہ ہیں:

وقد كان في عصر النبي ثمانية　　　يقومون بالافتاء قومة قانت

فاربعة اهل الخلافة، معهم　　　معاذ، ابي، و ابن عوف، ابن ثابت

(الحاوی للفتاویٰ، ج ۱ص ۱۶۲)

حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں آٹھ صحابہ فتاویٰ دینے کا ایسا اہتمام کرتے جیسے کوئی فرمانبردار اطاعت الٰہی کرتا ہے، ان میں چار خلفا راشدین، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم تھے اور ان کے ساتھ حضرت معاذ، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم بھی یہ خدمت انجام دیتے تھے۔

مورخ علامہ عبدالرحمٰن ابن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ نے کتاب المدہش میں عہد رسالت میں مفتیان صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد چودہ نقل کی ہے، موصوف کا بیان ہے:

من كان يفتي على عهد رسول الله ﷺ : ابوبكر و عمر و عثمان و على عبدالرحمن بن عوف و ابن مسعود و ابى و معاذ و عمار و حذيفة، وزيد بن ثابت و ابو الدردا و ابو موسىٰ و سلمان (المدہش، ص ۵۱)

عہد رسالت میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم فتوے دیتے تھے وہ ۱۔ حضرت ابوبکر عبداللہ بن عثمان تیمی قرشی (۵۱ ق ھ۔۱۳ھ/ ۵۷۳ء۔۶۳۴ء)، ۲۔ حضرت عمر (۴۰ ق ھ۔ ۲۴ھ/۵۸۴ء۔۶۴۴ء)، ۳۔ حضرت عثمان (۴۷ ق ھ۔۳۱ھ/ ۵۷۷ء۔۶۵۶ء)، ۴۔ حضرت علی (۲۳ ق ھ۔۴۰ھ/۶۰۰۔۶۶۱ء)، ۵۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (۴۴ ق ھ۔ ۳۲ / ۵۸۰ء۔۶۵۲ء)، ۶۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی (۰۰۰۔۳۲ھ/...... ۶۵۳ء)، ۷۔ حضرت ابی بن کعب الانصاری (۰۰۰۔۲۱ھ/ ۰۰۰۔۶۴۲ء)، ۸۔ حضرت معاذ بن جبل خزرجی انصاری (۲۰ ق ھ۔۱۸ھ/۶۰۳۔۶۳۹ء)، ۹۔ حضرت عمار بن یاسر (۵۷ ق ھ۔۳۷ھ/ ۵۶۷۔۶۵۷ء)، ۱۰۔ حضرت حذیفہ بن الیمان

(۰۰۰۔۳۶ھ/۰۰۰۔۶۵۶ء)، ۱۱۔ حضرت زید بن ثابت خزرجی انصاری (۱۱ ق ھ۔ ۴۵ھ/ ۶۱۱۔ ۶۶۵ء)، ۱۲۔ حضرت ابو الدردا مویمر بن مالک (۰۰۰۔۳۲ھ/ ۰۰۰۔۶۵۲ء)، ۱۳۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری (۲۱ ق ھ۔۴۴ھ/۶۰۲۔۶۶۵ء)، ۱۴۔ حضرت سلمان فارسی (۰۰۰۔۳۶ھ/۰۰۰۔۶۵۶ء) رضی اللہ عنہم تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت ﷺ میں مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کے فتووں پر عمل کیا جاتا تھا اوران کی فقہی بصیرت وتقلید کوراہ نجات سمجھا جاتا تھا۔

خلافت راشدہ میں رائے اور فتووں پر عمل

خلافت راشدہ میں بھی رائے اور فتووں پر عمل کیا جاتا تھا، چنانچہ فقہا سبعہ میں قاسم بن محمد بن ابی بکر المتوفی ۱۰۶ھ کا بیان ہے:

ان ابابكر الصديق رضي الله عنه كان اذا نزل به امر يريد فيه مشاورة اهل الراى واهل الفقه، و دعا رجالا من المهاجرين والانصار، عمر و عثمان و عليا و عبدالرحمن بن عوف و معاذ بن جبل و ابى بن كعب و زيد بن ثابت، و كل هولاء يفتى فى خلافة ابى بكر، و انما تصير فتوى الناس الى هؤلاء، فمضىٰ ابوبكر على ذلك، ثم ولى عمر فكان يدعو هولاء النفر، وكانت الفتوىٰ تصير و هو خليفة الى عثمان و ابى وزيد. (الطبقات الکبریٰ، ج۲ص۳۵۰)

بلاشبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی نیا مسئلہ اور واقعہ پیش آتا وہ اس میں اہل الرائے اور اہل فقہ سے مشورہ لینے کا ارادہ فرماتے تو مہاجرین و انصار میں سے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت

معاذ بن جبل، حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کو بلاتے تھے۔ اور یہی لوگ خلافت صدیقی میں فتوے دیتے تھے۔ اور لوگوں کی طرف سے جو سوالات آتے وہ انہی کو پہنچائے جاتے تھے کہ فتاویٰ کے مرجع تھے اور انہی کا فتویٰ چلتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں یہی معمول تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حکمرانی کا زمانہ جب شروع ہوا تو وہ بھی انہی لوگوں کو بلاتے تھے اور انہی کے فتووں پر عمل جاری تھا۔ اور فتوے حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کو پہنچائے جاتے تھے۔

(حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے دورِ فرمانروائی میں، یہ خود فتوے دیتے تھے)۔

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں چھ مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کی آرا کی پیروی

امام احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ ''کتاب العلل'' میں بلند پایہ فقیہ و حافظ حضرت مسروق کا بیان نقل کرتے ہیں۔

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں چھ صحابہ رضی اللہ عنہم ۱۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (۴۰ ق ھ۔ ۲۴ھ/ ۵۸۴۔ ۶۴۴ء) ۲۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔ ۳۲ھ/ ۰۰۰۔ ۶۵۲ء) ۳۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (۲۳ ق ھ۔ ۴۰/ ۶۰۰۔ ۶۶۱ء) ۴۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔ ۲۱ھ/ ۰۰۰۔ ۶۴۲ء) ۵۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (۱۱۔ ۴۵ھ/ ۶۱۱۔ ۶۶۵ء) ۶۔ حضرت ابوموسیٰ عبداللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ (۲۱ ق ھ۔ ۴۴ھ/ ۶۰۲۔ ۶۶۵ء) فتویٰ دیتے تو ان کے قول پر بات ٹھہرتی ان میں تین صحابی اپنے قول اور فتوے کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں

چھوڑ دیتے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اور حضرت زید حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اپنی رائے اور فتویٰ سے دست بردار ہو جاتے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج۲ص ۳۸۸)

اب یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تفقہ، فقہی بصیرت اور تفریع مسائل کا نام ہی رائے ہے۔ عہد رسالت، خلافت راشدہ اور عہد صحابہ سے اس سنت پر عمل برابر جاری و ساری تھا۔

عظیم مجتہدین کی عظیم تر مجتہدین کے حق میں اپنی فقہی آرا سے دست برداری

یہاں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ مذکورہ بالا صورت میں ایک عظیم مجتہد کا دوسرے عظیم تر مجتہد کے مقابلے میں اپنی رائے کو چھوڑ کر دوسرے مجتہد کی رائے کو اختیار کرنا، اجتہاد کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ امام ابوالحسن الکرخی (۲۶۰۔۳۴۰ھ/۸۷۴۔۹۵۲ء) فرماتے ہیں:

ان تقليد المجتهد لغيره ممن هو اعلم منه و ترك رايه لرايه ضرب من الاجتهاد فى تقوية راى الاخر فى نفسه على رايه بفضل علمه و تقدمه و معرفة وجوه النظر والا ستدلال فلم، يحل فى تقليده اياه من ان يكون مستعملا لضرب من الاجتهاد يو جب عنده رجحان قول من قلده. (اصول الجصاص، ج۲ص ۳۷۳)

بلاشبہ ایک مجتہد کا اپنے سے بڑے مجتہد و عالم کی تقلید کرنا اور اپنی اجتہادی رائے کو اس کی اجتہادی رائے کے مقابلے میں نظر انداز کرنا، دوسرے مجتہد کی رائے کو اپنی رائے کے مقابلے میں چھوڑنا

دراصل اس کی (۱) علمی برتری اور علم میں اس کی پیش قدمی کی وجہ سے ہے۔ (۲) اس کی وجوہ نظر کی معرفت اور استدلال کے پیش نظر ترجیح دینا، اور اس کی تقلید کرنا، اس امر سے خالی نہیں کہ وہ اجتہاد کی ایک قسم پر عمل پیرا رہا، جس نے اس امر کو اس کے خیال میں ضروری کر دیا کہ اس نے جس کی تقلید اختیار کی ہے اس کے قول کو اپنے قول پر ترجیح دے۔

چھ مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تین صحابی رضی اللہ عنہم کوفی

چنانچہ مذکورہ بالا چھ علماء میں سے تین حضرت علی رضی اللہ عنہم، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا شمار مجتہدین فقہا کوفہ سے ہے۔ (طبقات الفقہاء، ص ۱۲) اور دوسرے تین حضرات علماو مجتہدین کا تعلق بقیہ اسلامی بلاد سے ہے۔

مذکورہ بالا چھ صحابہ رضی اللہ عنہم کا شمار ان مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہے جنہیں فقہ ونظر میں بلند مقام حاصل تھا جو عہد رسالت ﷺ میں بھی فتویٰ دینے کے اہل تھے اور فتویٰ دیتے تھے، چنانچہ مورخ ابن سعد ۱۶۸۔۲۳۰ھ نے ''طبقات الکبریٰ'' میں ایک مستقل باب:

ذکر من کان یفتی بالمدینہ ویقتدی بہ من اصحاب رسول اللہ ﷺ.

قائم کیا ہے اس میں ان مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کو نام بنام گنایا ہے۔
(الطبقات الکبریٰ، ج ۲ ص ۲۳۴)

مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم میں تین صحابہ رضی اللہ عنہم پر ابواب احکام کی انتہا

امام بخاری کے استاد علی بن المدینی المتوفی ۲۳۴ھ کا بیان ہے کہ احکام سے متعلق

صحابۂ رسول ﷺ کا علم تین صحابہ پر منتہی ہوا، انہی سے وہ علم سیکھا اور روایت کیا گیا۔

ا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ۲۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، ۳۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ ان میں سے ہر ایک کے شاگرد تھے جوان کے قول پر عمل کرتے اور لوگوں کو فتوے دیتے تھے۔ (الجامع، ج۲ص۲۸۹)

مذکورہ بالا بیان سے بھی یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں عوام الناس ان کے فتووں پر عمل پیرا رہتے تھے، غور فرمائیں کیا یہ تقلید شخصی نہیں؟

حضرت ابن مسعودؓ وزید بن ثابتؓ اور ابن عباسؓ کے شاگرد اپنے استادوں کے اقوال اور فتاویٰ کے مقلد و ناشر

مورخ علامہ خطیب بغدادی المتوفی ۴۶۳ھ نے بسند متصل علی بن المدینی المتوفی ۲۳۴ھ کا بیان ان الفاظ میں زینت کتاب کیا ہے:

لم يكن من اصحاب النبی ﷺ احد له اصحاب يقومون له بقوله فی الفقه الا ثلاثة، عبدالله بن مسعود وزيد بن ثابت و ابن عباس و كان لكل واحد منهم اصحاب يقومون لقوله ويفتون الناس. (سیر اعلام النبلاء، ج۲ص۴۳۸)

حضور اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایسا نہ تھا جس کے شاگرد فقہ میں اس کے اقوال پر جمے رہتے اور عمل کرتے اور اس کے فقہی مذہب کو اختیار کرتے ہوں۔ مگر صرف تین صحابی رضی اللہ عنہم۔ ا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، ۲۔ حضرت زید بن ثابت اور ۳۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم ایسے تھے کہ ان میں سے ہر ایک کے شاگرد ان کے قول کو اختیار کرتے اور لوگوں کو اس کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ شیخ بخاری رحمۃ اللہ علیہ، علی بن المدینی رحمۃ

اللہ علیہ سے ایک نامور مجتہد خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام رہ گیا ہے ابواب احکام کی جن ائمہ مجتہدین پر انتہا ہوتی ہے وہ تین نہیں چار ہیں، ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم (پہلی صدی ہجری) میں مطلق تقلید ہی نہیں، تقلید شخصی کا بھی عوام میں رواج ہو چلا تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجلس کا موضوع سخن

صحابہ رسول ﷺ مسجد میں بیٹھ کر پیش آنے والے مسئلوں کے حکموں کے متعلق آپس میں بحث و مباحثہ کرتے رہتے تھے یہ فقہی بصیرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طبیعت میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجالس میں موضوع سخن ہی فقہی مسائل ہوتے تھے۔ چنانچہ حاکم نیشاپوری المتوفی ۴۰۵ھ المستدرک میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کرتے ہیں۔

اصحاب النبی ﷺ اذا اجلسوا کان حدیثهم معنی الفقه الا ان یقرأ رجل سورة او رجلا ان یامر بقرأة سورة (المستدرک، ج اص ۲۸۶)

حضور اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب بیٹھتے ان کا موضوع سخن فقہ اور فقہی مسائل ہوتے تھے مگر یہ کہ کوئی صحابی کوئی سورت پڑھنی شروع کرتا یا کوئی صحابی کسی کو کوئی سورت کی تلاوت کی فرمائش کرتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس میں موضوع سخن فقہی مسائل ہوتے تھے یا پھر قرآن کی تلاوت ہوتی تھی۔

امام ابوبکر جصاص المتوفی ۳۷۰ھ ''احکام القرآن'' میں فرماتے ہیں:

ان اصحاب رسول اللہ ﷺ مجتمعون فی المسجد یتذاکرون حوادث المسائل فی الاحکام۔

(احکام القرآن للجصاص، ج ۲ص ۵۹۰)

اصحاب رسول ﷺ مسجد میں بیٹھ کر پیش آنے والے مسئلوں کے
حکموں کے متعلق آپس میں بحث مباحثہ کرتے رہتے تھے۔

حضرت عمر کا صحابہ رضی اللہ عنہم کو فقہی بصیرت حاصل کرنے کی ترغیب وتاکید اور اس سنت متوارثہ پر قرآن وسنت کی رہنمائی

امام ابوبکر جصاص التوفی ۳۷۰ھ ''احکام القرآن'' میں رقمطراز ہیں:
محمد سیرین (۳۳۔۱۱۰ھ/ ۶۵۳۔ ۷۲۹ء) احنف بن قیس (۰۰۰۔۶۷ھ/ ۰۰۰۔۶۸۶ء) سے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قیادت وسیادت سے بہرہ مند ہونے سے پہلے فقہی بصیرت (اور مسائل کے حل کا فہم) حاصل کرو، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم مسجد میں بیٹھ کر پیش آنے والے مسئلوں کے احکام میں مباحثہ کرتے تھے۔ (ان کے بعد) تابعین بھی اس طریقے و روش پر گامزن رہے اور ان کے بعد آنے والے فقہاء کا ہمارے زمانے (۳۷۰ھ/ ۹۸۰ء) چوتھی صدی ہجری تک یہ سلسلہ بدستور قائم ہے۔ اس حقیقت کا انکار رذیل اور جاہل لوگ کرتے ہیں جنہوں نے ملتی جلتی سنن و اثار کو اٹھا کر دیکھا ان کے مطالب و معانی اور احکام کو نہ پاسکے ان میں بحث کرنے اور ان سے فقہی احکام نکالنے سے عاجز آگئے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

رب حامل فقه غير فقيه و رب حامل فقه الیٰ من هو افقه منه (سنن ترمذی، ج۲ص۹۰)

بہت سے فقہی حدیثوں کے راوی فقیہ نہیں اور بہت سے فقہی حدیثوں کے سننے والے ان کا منشاء و مطلب زیادہ اچھا سمجھتے ہیں۔

اس حقیقت سے منکر جماعت کی مثال ایسی ہے جیسی مثال اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے:

مثل الذين حملوا التوراة ثم لم يحملوها كمثل الحمار يحمل اسفارا (الجمعۃ:۵)

ان لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا تھا پھر انہوں نے اس پر عمل نہ کیا، ان کی مثال گدھے کی سی ہے جو کتابیں لادے ہوئے ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ان تُبدلکم تسؤکم (المائدہ:۱۰۱،۱۰۲)

یعنی وہ (باتیں جو یہ پوچھتے ہیں) تم پر کھولی جائیں تو تم کو بری لگیں گی۔

اس سے مراد عبداللہ بن حذافہ وغیرہ کے بے محل و بے جا سوالات ہیں جیسے ''من ابی'' ''میرا باپ کون ہے؟ اور ''این انا'' میں کہاں ہوں؟ جن سے ہر شائستہ انسان کو ناگواری ہوتی اور تکلیف پہنچتی ہے۔ اس قسم کے فضول ولایعنی سوالات کی قباحت و ممانعت کا اظہار اس آیت شریفہ میں یوں کیا گیا ہے۔

وان تسئلوا عنها حین ینزل القرآن تبدلکم (ایضاً)

اور اگر تم انہیں دریافت کرتے رہو گے اس زمانے میں جب کہ قرآن اتر رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔

اس قسم کے سوالات کی شریعت میں اجازت نہیں۔ لیکن ایسے سوالات جن سے حق تعالیٰ کی رضا جوئی اور احکام الٰہی کی تعمیل کرنا مقصود ہو وہ اس کے زمرے میں داخل نہیں، یہی وجہ ہے کہ نت نئے مسائل کے متعلق احکام الٰہی کے اظہار و بیان سے کسی سائل کو ناگواری نہیں بلکہ خوشی و مسرت ہوتی ہے۔ (اس لئے ان پر عمل سے ہر ایک کی دینی و دنیوی زندگی سنورتی ہے چنانچہ ایسے تمام سوالات جن کا تعلق معاش کے شعبوں سے ہو یا معاد کے، ان سے مقصد احکام کی بجا آوری ہے، وہ سب ''عفو'' درگزر کے دائرے میں داخل ہیں) چنانچہ آیت شریفہ میں ارشاد ہے:

عفا اللّٰہ عنها

اللہ تعالیٰ نے ان کی بات سے درگزر کی۔

یعنی اس قسم کے دینی مسائل میں بحث و تکرار پر تم سے باز پرس نہیں کی اور ان

مسائل کے حقائق تم پر روشن کردیئے، (ذرا غور فرمائیں یہ فقہی بصیرت کیسا عظیم احسان الٰہی ہے)۔

اس مقام پر ''عــفــو'' درگزر کرنے کا مطلب ایسے سوالات سے درگزر کرنا، اجازت دینا سہولت فراہم کرنا، اور لگائی ہوئی پابندی کو ڈھیل دینا، آسانی کرنا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فتاب علیکم وعفا عنکم: (البقرہ:۱۸۷)

اس نے تم پر رحمت سے توجہ فرمائی اور تم سے درگزر کی۔

یہاں عفاعنکم کے معنی سھل علیکم کے ہیں یعنی سہولت بخشی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے:

الحلال ما احل اللہ والحرام ما حرم اللہ وما سکت عنہ فھو عفو۔

حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا اور جس سے اللہ تعالیٰ نے سکوت وخاموشی اختیار کی وہ عفو ودرگزر کی حدود میں داخل ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے اس میں سہولت دی گئی ہے فائدہ اٹھانے کی گنجائش رکھی گئی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عفوت لکم عن صدقۃ الخیل والرقیق (سنن ترمذی، ج۱ ص۱۳۴)

میں نے تم سے گھوڑے اور غلام کی زکوٰۃ سے درگزر کی۔

(احکام القرآن للجصاص، ج۲ ص۵۹۰)

مذکورہ بالا ارشادات نبوی سے اجتہاد کے موقع ومحل کی تعین بھی ہوجاتی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہادی طریقے کی پیروی

شمس الائمہ سرخسی المتوفی ۴۸۳ھ الحر رفی اصول الفقہ میں لکھتے ہیں کہ حضور اکرم

ﷺ کے ارشاد:

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم.

میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ستاروں کی طرح رہنما ہیں ان میں سے تم جس کی پیروی کروگے راستے پاؤ گے، کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی اقتداء احکام الٰہی کی طلب وجستجو میں ان کے طریقے پر چلنے میں پوشیدہ ہے۔ نہ ان کی تقلید کرنے میں، اور ان کا طریقہ رائے واجتہاد پر عمل کرنا تھا اور یہی آپ نے اس ارشاد کا کہ میرے بعد آنے والوں کی پیروی کرو اور میرے خلفاء رضی اللہ عنہم کے طریقے پر چلتے رہو کا مطلب تھا کہ جن باتوں میں حکم صریح نہ پاؤ ان میں ان کے طریقہ اجتہاد ورائے پر گامزن رہو۔ (اصول الجصاص، ج ۲ ص ۳۸۶)

بعض مجتہد اکابر واصاغر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بکثرت فتووں کے اسباب

اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے (فتوے اور) روائتیں کم ہونے کا سبب یہ ہے کہ تابعین کے فائدہ اٹھانے سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے تھے (یہی وجہ ہے کہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے) حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے بکثرت (فتوے اور) روایتیں مروی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجۃ اللہ البالغہ میں رقمطراز ہیں:

فصارت قضایاہ وفتاواہ متبعۃ فی مشارق الارض ومغاربھا (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱ ص ۲۸۱)

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں اور فتووں کی اسلامی قلمرو کے مشرق ومغرب میں ہر طرف پیروی کی جاتی تھی۔ یہ بھی تقلید تھی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے زیادہ زمانہ پایا انہوں نے حکمرانی کی ان سے سوالات کئے گئے، انہوں نے لوگوں کے فیصلے چکائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام تر صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے امام تھے جن کی اقتدا اور پیروی کی جاتی تھی اور یہ جو افعال واعمال

کرتے تھے ان کی نظر میں رکھا جاتا تھا۔ ان کی طرف توجہ دی جاتی تھی، ان سے فتوے پوچھے جاتے، وہ ان کا جواب دیتے تھے، انہوں نے حدیثیں سنی تھیں اور وہ حدیثیں سناتے تھے، یہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے، ان کے علاوہ دوسرے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (۵۱ق ھ۔۱۳ھ/۶۳۴ء) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (۴۷ق ھ۔ ۳۶ھ/۵۷۷۔ ۶۵۶ء) حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ (۲۸ق ھ۔ ۳۶ھ/ ۵۹۶۔۶۵۶ء) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ (۲۸ق ھ۔۳۶ھ/ ۵۹۴ء۔۶۵۶ء) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (۲۳ق ھ۔۵۵ھ/۶۰۰۔۶۷۵ء) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ (۴۴ق ھ۔۳۲ھ/۵۸۰۔۶۵۲ء)، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح عامر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ (۴۰۔۱۸ھ/ ۵۸۴۔ ۶۳۹ء)، حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ (۲۲ق ھ۔ ۱۵ھ/ ۶۰۰۔ ۶۷۱ھ) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔۲۱ھ/۰۰۰۔۶۴۲ء) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔ ۱۴ھ/۰۰۰۔ ۶۳۵ء)، حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ (۳۸ق ھ۳۴ھ/۵۸۶۔۶۵۴)، حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔۲۰ھ/۰۰۰۔۶۴۱ء)، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (۲۰ق ھ۔۱۸ھ/۶۰۳۔ ۶۳۹ء) اور انہی جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بہت کم روایتیں منقول ہیں۔ ان اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کثرت سے روایتیں منقول نہیں جس کثرت سے کم عمر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں جیسے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ (۱۶ق ھ۔ ۷۵ھ/ ۶۰۷۔ ۶۹۷ء)، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ (۱۰ق ھ۔۷۴ھ/۶۱۳۔ ۶۹۳ء)، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ عبدالرحمٰن بن صخر رضی اللہ عنہ (۲۱ق ھ۵۹ھ/۶۰۲۔ ۶۷۹ء)، حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (۱۰ق ھ۔۷۳ھ/۶۱۳۔۶۹۲ء)، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ (۷ق ھ۔ ۶۵ھ/ ۶۱۶۔۶۸۴ء)، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ (۳ق ھ۔ ۶۸ھ/۶۱۹۔ ۶۸۷ء)، حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ (۱۲ق ھ۔۷۴ھ/۶۱۱۔۶۹۳ء)، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (۱۰ق ھ۔۹۳ھ/۶۱۲۔۷۱۲ء)، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔۷۱ھ/۰۰۰۔۶۹۰)۔

اورانہی جیسے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہ ہیں، ان مذکورہ بالا تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا شمار فقہاء صحابہ میں کیا جاتا ہے، یہ رسالت مآب ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔

اوران سے کم عمر صحابہ رضی اللہ عنہ جیسے حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔۵۸ھ/ ۰۰۰۔۶۷۸ء)، حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔۷۸ھ/ ۰۰۰۔۶۹۷ء)، حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔۵۲ھ/ ۰۰۰۔۶۷۲ء)، حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ (۲۔۶۵ھ/ ۶۲۳۔۶۸۴ء)، حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ (۲۰ ق ھ۔۶۰/ ۶۰۳۔۶۸۰ء)، حضرت سہل بن سعد مساعدی رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔۹۱ھ/ ۰۰۰۔۷۱۰ء)، حضرت عبداللہ بن یزیدی الخطمی رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔تقریباً ۷۰ھ/ ۰۰۰۔۶۹۰ء)، حضرت مسلمہ بن مخلد الزرقی رضی اللہ عنہ (۱۔۶۲ھ/ ۶۲۲۔۶۸۲ء)، حضرت ربیعہ بن کعب الاسلمی رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔تقریباً ۶۳ / ۰۰۰۔۶۸۳ء)، حضرت ہند بن حارثہ اسلمی رضی اللہ عنہ (۰۰۰۔تقریباً ۵۰ھ/ ۰۰۰۔تقریباً ۶۷۰ء)، حضرت اسماء بن حارثہ اسلمی رضی اللہ عنہ (۱۴ ق ھ۔۶۶ھ/ ۶۰۶۔۶۸۶ء)، یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرتے اور ساتھ رہتے تھے چنانچہ ان سے زیادہ روایتیں منقول ہیں اوران دونوں میں اورانہی جیسے صحابہ ان میں علم زیادہ رہا اس لئے کہ یہ زیادہ مدت تک زندہ رہے اوران کی عمریں بھی لمبی ہوئیں اور تابعین کو ان کے علم سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، اور بیشتر بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے پہلے وفات پاگئے اوران اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ علم نہیں پھیلا اس لئے بھی کہ اس وقت انہی صحابہ رضی اللہ عنہم کی بڑی تعداد موجود تھی۔ (الطبقات الکبریٰ، ج۲ص۳۷۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اجتہاد میں مرتبہ ومقام

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایسے بلند ترین فقیہ تھے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے مجتہد اعظم وخلیفہ راشد سے فقہی مسائل میں سو سے زیادہ مسئلوں میں اختلاف رکھتے تھے، ابن حزم فرماتے ہیں:

اما اختلافهما فلو تقصی یبلغ ازیدمن مائة مسئلة.

(الاحکام فی اصول الاحکام، ج۶ص۶۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے مابین اختلافی مسائل کو اگر شمار کیا جائے تو ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ نکلے گی۔

فقہ وبصیرت کا گھاٹ

ابن سعد نے بسند متصل حضرت مسروق کوفی علیہ الرحمہ کا بیان نقل کیا ہے:

لقد جالست اصحاب محمد ﷺ، فوجدتهم کالاخاذ، فالا خاذ یروی الرجل والا خاذیروی الرجلین و الإخاذیروی العشرة والا خاذیروی المائة والا خاذ لونزل به اهل الارض لا صدرهم، فوجدت عبدالله بن مسعود من ذالک الاخاذ. (طبقات، ج۲ص۳۴۳)

مجھے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہم نشینی کی سعادت حاصل رہی ہے، چنانچہ میں نے انہیں گڑھوں (تالاب) کی طرح پایا (کوئی کم علم والا کوئی زیادہ علم والا) کوئی ایک آدمی کو سیراب کرتا کوئی دو کو سیراب کرتا، کوئی دس کو اور کوئی سو دوسو کو سیراب کرتا۔ ان میں ایسا بھی تالاب تھا کہ اگر اس سرزمین والے سب ہی آتے تو وہ سب کو سیراب کر کے لوٹا تا تو میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کو (فقہی بصیرت میں) ایسا ہی تالاب پایا۔

علامہ بدرالدین زرکشی المتوفی ۷۹۴ھ ''البحر المحیط'' میں رقمطراز ہیں:

واما ابن مسعود کان فقیه الصحابة منتدبا بالفتوی

وکذلک ابن عباس و زیدبن ثابت ممن شهدله الرسول بانه افرض الائمة رضی الله عنهم . المعتبر تصدیة لهذا المعنی من غیر نکیر. ولاشک فی کون العشر ة من اهل الاجتهاد و کذلک من انتشرت فتاوی کابن مسعود و عائشة و غیرهم کثرت فتاواهم غیر ان الذی اشتهر منهم الفتاویٰ والاحکام جماعة مخصوصه. (البحر المحیط، ج۶ص ۲۱۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی فتوے سے وابستگی رہی ہے اس لئے وہ فقہی وفقیہ وصحابی کے لقب سے مشہور تھے، یہی حال حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے مسائل میراث کے سب سے بڑے عالم ہونے کی شہادت دی ہے اور وہ یہ خدمت برابر سرانجام دیتے رہے اس امر میں کسی کا اختلاف نہیں، اور عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کے مجتہدین ہونے میں بھی شک وشبہ نہیں ہے، اور ایسے صحابہ رضی اللہ عنہم جن کے فتوے شائع ہیں جیسے ابن مسعود اور حضرت عائشہ اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جن کے فتوے کثیر تعداد میں موجود ہیں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جو احکام (حلال وحرام) سے متعلق مسائل میں شہرت رکھتے ہیں وہ ایک مخصوص اور محدود جماعت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا روایتی معیار

اہل علم میں سے کسی کو اس بات میں شک نہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو فقہ ودرایت اور اتقان واحتیاط اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری و

قربت کا جو مرتبہ و مقام حاصل تھا وہ کم ہی صحابہ رضی اللہ عنہم کو حاصل ہوگا۔ چنانچہ امام عمرو بن میمون یمانی ثم کوفی المتوفی ۷۵/۷۴ھ، کا بیان ہے:

مجھے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہمنشینی کی برسوں سعادت حاصل رہی ہے۔ میں نے انہیں حدیثیں بیان کرتے ہوئے نہیں سنا ایک بار انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سنائی تو احتیاط کا یہ عالم تھا کہ انہیں سہو کا اندیشہ و خطرہ ہوا اور خوف طاری ہوگیا پھر فرمایا رسول اللہ ﷺ نے اس طرح سے فرمایا تھا یا اس کے قریب قریب بات کہی تھی یا اسی قسم کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے، علم میں ان کا یہ مقام تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے وقت گھبراہٹ طاری ہوجاتی تھی، بیان روایت میں احتیاط کا یہ حال تھا۔ (اصول الجصاص، ج ۲ص ۲۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا بلند معیار کا اندازہ مورخ اسلام علامہ شمس الدین الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ کے بیان سے کیا جاسکتا ہے وہ ''تذکرہ'' میں رقمطراز ہیں:

ابو عبدالرحمن عبدالله ابن ام عبدالهذلی، صاحب رسول الله ﷺ، وخادمه و احدالسابقین الاولین، ومن کبار البدریین، ومن نبلاءالفقهاء والمقرئین، کان ممن یتحری فی الاداء ویتشدد فی الروایة ویزجر تلامذته عن التهاون فی ضبط الالفاظ. (تذکرۃ الحفاظ، ج۱ص۱۳)

حضرت ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن ام عبد ہذلی رضی اللہ عنہ، ۱۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں، ۲۔ ان کے خادم ہیں، ۳۔ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہیں۔ ۴۔ بڑے بدری صحابہ میں ہیں، ۵۔ نہایت بلند پایہ فقہا اور، ۶۔ قاریوں میں سے ہیں، ۷۔ ان صحابہ میں سے ہیں جو بیان روایت میں متشدد و بہت سخت۔ ۸۔ اور بہت محتاط

تھے۔۹۔وہ اپنے شاگردوں کو الفاظ حدیث کے ضبط میں سستی اور،۱۰۔بے احتیاطی پرسختی سے روک ٹوک کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا روایتی معیار کتنا سخت اور بلند تھا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مجتہدین کو ہدایت

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہم پر ایسا زمانہ بھی گزرا کہ ہم فیصلہ نہیں کرتے تھے، فتویٰ نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ اس وقت ایسے مسائل (اجتہادیہ) پیش نہیں آتے تھے۔ پس اگر کسی کو حکم بتانا ہو تو کتاب سے بتائے اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو سنت رسول اللہ ﷺ سے بتائے، اور اگر آپ ﷺ کی سنت میں بھی نہ ہو۔

تو پھر اپنی رائے سے حکم بتائے اور فیصلہ صادر کرے۔ (اصول الفقہ للجصاص، ج۲ص ۲۳۶)

لہٰذا اگر نئے مسائل میں اجتہاد سے کام لینے کا پہلے سے رواج نہ ہوتا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مجتہدین کو اپنی اجتہادی رائے اور فقہی بصیرت سے مسئلے کا حکم پیش کرنے کی ہدایت نہ فرماتے، اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس امر پر ان کی نکیر کرتے، یہ بات (ان پر نکیر نہ کرنا) اس امر کی شاہد ہے کہ ان کے یہاں اجتہادی رائے پر عمل کا معمول اور دستور تھا۔ (ایضا، ج۲ص ۲۳۱)

اسی لئے جس میں اجتہاد کی اہلیت وصلاحیت نہ ہو اس کو اجتہاد کی ہرگز اجازت نہیں۔ (ایضا، ج۲ص ۲۳۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مذہب وفتووں کی تشکیل وتدوین

علامہ ابن القیم الجوزیہ المتوفی ۷۵۱ھ نے ''اعلام الموقعین'' میں امام محمد بن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ کا بیان نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

لم یکن احدله اصحاب معروفون، حرروا فتیاه و مذهبه غیر ابن مسعود رضی الله عنه (اعلام الموقعین، ج۱ص۲۵)

کوئی مجتہد صحابی ایسا نہ تھا سوائے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے جس کے مشہور و معروف شاگرد اس کے فتووں اور اس کے مذہب کو قیدِ تحریر میں لائے ہوں۔

سب سے پہلے تشکیل و تدوین مذہب و فتووں کی جمع و ترتیب کی سعادت صرف عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ کو حاصل ہے اور وہ بھی مرکزِ علم کوفہ میں۔

چنانچہ امام فخر الاسلام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ان کان الراوی معروفاً بالفقه، والتقدم فی الاجتهاد، کالخلفاء الراشدین، والعبادلة الثلاثة، وزیدبن ثابت، و معاذبن جبل، وابی موسی الاشعری و عائشة، رضوان اللّٰہ تعالیٰ اجمعین، وغیرهم ممن اشتهر بالفقه والنظر، حدیثهم حجة، یترک به القیاس، وان کان الراوی معروفاً بالعدالة والحفظ دون الفقه، مثل ابی هریرة، وانس بن مالک رضی الله عنهما، فان وافق حدیثه القیاس، عمل به، وان خالفه لم یترک الحدیث الاللضرورة. (اصول البزدوی، ص۱۵۸، اصول السرخسی، ص۳۳۸)

راوی کو اگر تفقہ اور اجتہاد میں شرف تقدم و شہرت حاصل ہے جیسا کہ خلفاء راشدین اور عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، اور عبداللہ بن عمر، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم ہیں، ان کے علاوہ بھی صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جن کو فقہ و نظر میں شہرت حاصل ہے ان کی حدیث حجت ہے ان کی حدیث کے مقابلے میں قیاس کو چھوڑا جائے گا۔ اور راوی اگر عدالت اور حفظ

میں مشہور و معروف ہے لیکن فقہ میں مشہور نہیں جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ و حضرت انس رضی اللہ عنہما ہیں ایسے راوی کی حدیث اگر قیاس کے مطابق ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر اس کی حدیث قیاس کے مخالف ہے تو اس حدیث کو نہیں چھوڑا جائے گا مگر ضرورت کی وجہ سے یعنی قیاس کا دروازہ مطلقاً بند نہ کیا جائے۔ بلکہ قیاس کیا جائے گا۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ مذکورہ بالا ائمہ مجتہدین کی مختصر جماعت کو یہ امتیاز و خصوصیت اس لئے حاصل تھی کہ ان برگزیدہ شخصیات کے اجتہادات پر صحت و سلامتی کی مہر تصدیق بارگاہ رسالت سے ثبت ہو چکی تھی اور انہیں افتاء و تعلیم کی اجازت حاصل تھی، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ فتاوی عزیزی میں رقمطراز ہیں:

کسانیکہ بحضور آں جناب ﷺ بپایۂ اجتہاد کامل رسیدہ بودندہ آنحضرت ﷺ اجتہادات ایشان را تصویب فرمودند، و بفتویٰ و تعلیم اجازت فرمودہ بودند، مثل حضرت عمر، و علی، و مثل عبداللہ بن مسعود، و معاذ بن جبل و زید بن ثابت و امثالہم (فتاویٰ عزیزی، ج ا ص ۱۱۸)

رسول اللہ ﷺ کے حضور میں جنہیں اجتہاد کامل نصیب تھا اور حضور اکرم ﷺ نے ان کے اجتہادات پر مہر تصدیق ثبت فرمائی اور انہیں فتویٰ و تعلیم دینے کی اجازت دی تھی جیسے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت معاذ بن جبل، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور انہی کی طرح بعض دوسری شخصیات ہیں۔

شاگردان ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فقہی مرتبہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی نظر میں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی حضرت ابن عباس رضی

اللہ عنہما قدر کرتے اور جب وہ آتے، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کی دعوت کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مسروق کا یہ بیان نقل کیا ہے:

كان ابن عباس رضى الله عنهما اذاقدم عليه اصحاب عبدالله بن مسعود رضى الله عنه صنع لهم طعاما ودعاهم، قال، صنع لنا مرة طعاما فجعل يسال، و يفتى وكان يخالفنا فما كان يمنعنا ان نرد عليه الا كنا على طعامه (اصول الجصاص، ج۲ص۱۵۶)

حضرت بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے شاگرد آتے، تو وہ ان کے لئے کھانا تیار کراتے، انہیں بلاتے تھے، مسروق نے کہا: ایک بار انہوں نے ہمارے لئے کھانا تیار کیا۔ پھر مسائل پوچھنے اور فتویٰ دینے لگے، اور مسائل میں ہماری مخالفت کرنے لگے، ہمیں جواب دینے سے یہی بات مانع رہی کہ ہم ان کے یہاں کھانے پر مدعو تھے، (یہ موقع بحث ومباحثہ کے لئے موزوں نہیں تھا اس لئے ہم نے اس سے گریز کیا۔)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے شاگردوں کا عہد صحابہ میں اجتہاد اور خدمت افتاء

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں اجتہاد کرتے تھے اور ان کے فتووں کو مانا جاتا تھا، چنانچہ امام ابواسحاق الشیرازی الشافعی المتوفی ۶ ۷ ۴ھ تحریر فرماتے ہیں:

اصحاب عبدالله بن مسعود رضی الله عنه كشريح والاسود وعلقمه كانوا يجتهدون فی زمن الصحابة، ولم ينكر عليهم احد. (کتاب اللمع)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد جیسے قاضی شریح، اسود اور علقمہ رضی اللہ عنہم، عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں اجتہاد کرتے تھے اور کسی نے ان پر نکیر نہیں کی۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی کوفہ میں تعلیمی خدمات کا فیضان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی تعلیمی خدمات کے متعلق محمد بن سیرین المتوفی ۱۱۰ھ کے بھائی نامور عالم انس بن سیرین بصری (۳۴ـ۱۲۰ھ/ ۶۷۵ـ۷۳۸ء) کا بیان قاضی حسن بن خلا المتوفی ۳۶۰ھ نے بسند متصل "المحدث الفاصل" میں زینت کتاب کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

قدمت الكوفة قبل الجماجم فرايت فيهااربعة الاف يطلبون الحديث واربعمائة قد تفقهوا (المحدث الفاصل، ص ۵۶۰)

میں دیر جماجم کے واقعہ یعنی ۸۲ھ سے پہلے کوفہ میں گیا تو میں نے دیکھا کہ یہاں چار ہزار طلبہ حدیث پڑھتے تھے۔ اور چار سو طلبہ فقیہ بن چکے اور فقہی بصیرت حاصل کر چکے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے عہد تابعین میں صرف کوفے میں چار سو فقیہ موجود تھے۔ دوسرے اسلامی قلمرو کے بلاد اور دیہات کا کیا ذکر؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی تعلیمی وتدریسی خدمات

کے عہد اموی میں جو شاندار نتائج و ثمرات اور ان کے دیرپا اثرات کو فقہ میں نکلے اس کی نظیر اسلامی قلمرو کے وسیع و عریض قطعہ میں کہیں اور مشکل سے ملے گی۔

تاریخِ تقلید

اجتہاد اور تقلید کی تاریخ ایک ساتھ شروع ہوتی ہے۔ استادی اور شاگردی ایک ساتھ چلتی ہیں۔ استاد نہ ہو تو شاگرد نہیں اور شاگرد نہ ہو تو استاد، استاد کیسے بنا؟ اجتہاد خود آنحضرت ﷺ کے زمانے سے شروع ہوا تو ظاہر ہے کہ اس کے ماننے والے بھی اسی دور کے لوگ ہوں گے۔ سو اس میں شک نہیں کہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اجتہاد سے جو مسائل بتاتے تھے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی پیروی کرتے تھے اور ہر بات میں ان سے دلیل کا مطالبہ کرنا ان کا طریق نہ تھا۔ عمل کی زیادہ سرحدیں اجتہاد سے عبور کی جاتی تھیں اور علم ہوتے ہوئے بھی زیادہ علم والے کی پیروی کرنا (تقلید اعلم) کسی جہت سے معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کی زندگی میں افتاء کا کام کرتے رہے اور ان کا امت مسلمہ کی اس ذمہ داری کو ادا کرنا آنحضرت ﷺ کے اذن سے ہوتا تھا۔

اگر اس وقت امت کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس کو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے فتوؤں اور فیصلوں کی ضرورت ہو تو یہ اکابر آخر کن لوگوں کو فتویٰ دیتے تھے؟ یہ صورت حال کیا اس کا پتہ نہیں دیتی کہ مطلق تقلید صحابہ رضی اللہ عنہم کے وقت میں جاری تھی اور اسے خیر القرون میں کسی جہت سے عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ میں سینکڑوں ایسے لوگ تھے، جن کی پیروی امت میں جاری تھی اور وہ حضرات اپنے اپنے حلقے میں مجتہد مطلق تھے لیکن جب ائمہ اربعہ نے اصول فقہ مرتب کر لیے اور اسلام کا ذخیرہ علم مدون ہو گیا تو اب وہ کثیر اختلافات سمٹ کر چار میں محدود ہو گئے اور وہ بھی کہیں کہیں۔ ائمہ کی ان محنتوں سے عہد صحابہ رضی اللہ عنہم

کے اختلافات کم ہوتے گئے اور امت وسعت عمل کی سہولت کے ساتھ ساتھ ایک وحدت میں آتی گئی۔ اسلام کا یہ قافلہ چودہ سو سال سے اسی طرح چلا آرہا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ اپنے چار فقہی اختلافات کے باوجود ایک قوم اور ایک امت ہیں۔

اُمت کا آغاز ہی اعتماد سے ہوا ہے

اس دین کی ابتداء اعتماد سے قائم ہوئی اور اب تک اُمت اس اعتماد کے سایہ تلے اپنے اسلاف سے وابستہ رہی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ان الامة اجتمعت علی ان یعتمد واعلیٰ سلف فی معرفة الشریفة فالتابعون اعتمدوا فی ذلک علی الصحابة وتبع تابعین اعتمدو ا علی التابعین وھکذافی کل طبقة ا عتمد العلماء علیٰ من قبلھم والعقل یدل علی حسن ذلک لان الشریعة لایعرف الابالنقل و الاستنباط والنقل لایستقیم الابان یاخذ کل طبقة عمن قبلھا بالاتصال. (عقد الجید ص ۳۶)

بیشک امت کا اس پر اتفاق رہا کہ شریعت جاننے میں وہ سلف پر اعتماد کریں۔ تابعین کرام نے اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر۔ اور اسی طرح ہر طبقہ علماء اپنے سے پہلوں پر اعتماد کرتا رہا۔ عقل بھی اس اعتماد کو تحسین کی نظر سے دیکھتی ہے شریعت کی راہ نقل واستنباط کے سوا کوئی نہیں اور نقل قائم نہیں ہوتی جب تک ہر طبقہ اس میں اپنے سے پہلے طبقے سے متصل نہ ہو۔

دائرہ اجتہاد میں اگر اِمام کو صاحب مذہب کہہ دیا جائے تو ابتدائی دور میں اسے

ہرگز عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک مجتہد صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ایک مجتہد درجے کے صحابی ہیں۔ کسی مسئلے میں ان دونوں اماموں کا موقف ایک تھا۔ اسے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شارح صحیح مسلم ان لفظوں میں نقل کرتے ہیں:

وهو مذهب معاذ بن جبل ومعاوية (شرح صحیح مسلم)

یہ مذہب ہے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کا۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے موقف اور رائے کو بھی مذہب کے لفظ سے ذکر کیا ہے، ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ (۳۱۰ھ) سے نقل کرتے ہیں:

لم يكن احدله اصحاب معروفون حرروه فتياه ومذاهبه فى الفقه غير ابن مسعود رضى الله عنه وكان يترك مذهبه وقوله لقول عمر وكان لايكاد يخالفه فى شئى من مذاهبه (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سوا اور کوئی نہ تھا جس کے اتنے معروف شاگرد ہوں اور فروعات میں اس کے فتووں اور مذاہب کو قلمبند کرتے ہوں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عمرؓ کا فتوےٰ سامنے آنے پر اپنا مذہب اور قول سب چھوڑ دیتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کے کسی مذہب (فتوے) پر اختلاف نہ کرتے تھے۔

اس سے پتہ چلا کہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی امام فقہ کی طرف مذہب کی نسبت ہرگز کوئی عیب نہ سمجھی جاتی تھی۔

سو بعد کے یہ الفاظ کہ یہ مذہب ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اور یہ مذہب ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا، علمی دنیا میں ہرگز کسی وحشت کا سبب نہ ہونا چاہئیں۔ پہلے دور میں تقلید صرف عامی کے لیے نہ تھی بڑے بڑے ائمہ بھی اپنے سے بڑے اہل علم کی پیروی کرتے تھے اور اسے کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم عالم اعلم کی اقتداء میں

(۱)......حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم وفضل اور فقہ وبصیرت میں کسے تردّد ہوسکتا ہے۔آپ نے ارادہ کیا کہ کعبہ میں جتنا سونا چاندی دھرا ہے وہ سب لوگوں میں تقسیم کردوں۔حضرت شیبہ بن عثمان نے کہا۔آپ کو اس کا حق نہیں حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا۔حضرت شیبہ بن عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

قلت ليس ذالك لك قد سبقك صاحباك لم يفعلا ذالك فقال هماالمران يقتدى بهما. (مسند امام احمد ج۳ ص۴۱۰)

میں نے کہا آپ کو اس کا حق نہیں آپ کے دونوں پہلے ساتھیوں نے ایسا نہیں کیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا واقعی وہ دو ایسی ہستیاں ہیں کہ ان کی پیروی کی جانی چاہیے۔

حضور ﷺ تو حق رسالت میں لائق اقتداء ہیں۔یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پیروی کیوں؟ یہ محض اس لیے کہ عالم کے لیے اپنے سے بڑے عالم کی اقتداء میں چلنا جائز ہے گو ایک مجتہد کے لیے دوسرے مجتہد کی تقلید ضروری نہیں۔لیکن اگر کوئی کرے تو یہ شرک فی الرسالت نہیں کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہ کہا کہ آپ نے هما المران يقتدى بهما کہہ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کے ساتھ شریک کردیا ہے۔ اگر تقلید شرک فی الرسالت ہوتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان پر ضرور نکیر کرتے۔

(۲)...... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے علم وفضل اور فقہ وبصیرت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے، صبح کی نماز میں قنوت پڑھنے کا مسئلہ چلا آپ نے کہا۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے اختیار کرلیں تو میں بھی اس کے لیے تیار ہوں۔ حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ (۳۱۰ھ) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

كان يترك مذهبه وقوله لقول عمر و كان لايكاد يخالفه في شئي من مذاهبه ويرجع من قوله الى قوله وقال الشعبي كان عبدالله لايقنت وقال لوقنت عمر لقنت عبد الله. (اعلام الموقعین ج۱ص۱۶)

آپ اپنی تحقیق اور اپنا قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے آگے چھوڑ دیتے تھے اور اپنے فیصلوں میں کبھی ان کا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) خلاف نہ کرتے تھے اپنی بات سے ان کی بات کی طرف رجوع کرتے۔ علامہ شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (فجر کی نماز میں) قنوت نہ پڑھتے تھے، فرماتے اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعائے قنوت پڑھیں تو میں بھی پڑھ لوں گا۔

(۳)...... ایک صحابی نہیں صحابہ رضی اللہ عنہم کا گروہ کا گروہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی پیروی میں کس طرح چلا اسے حضرت ابومسلم الخولانی سے سنیئے:

آپ کہتے ہیں میں دمشق کی جامع مسجد میں آیا تو وہاں ایک علمی حلقہ دیکھا جس میں آنحضرت ﷺ کے ادھیڑ عمر کے کئی صحابہ رضی اللہ عنہم نظر آئے، ان میں ایک نوجوان جس کی آنکھیں سرمگیں تھیں اور اگلے دانت چمکدار تھے بیٹھا تھا، ابومسلم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

كلما اختلفوا في شئي ردوه الى الفتى فتى الشاب

قال قلت لجليس لى من هذا قال هذا معاذبن جبل

(مسند امام احمد ج ۵ ص ۳۲۶)

پیش نظر رہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یہاں بطور قاضی مقدمے نہیں سُن رہے تھے۔ مسائل کا علمی مذاکرہ تھا اور سب اعلم کی طرف رجوع کر رہے تھے اور وہ نوجوان مدینہ منورہ سے حضور ﷺ سے مجتہد ہونے کی سند لے کر آیا تھا۔ ان موجود صحابہ رضی اللہ عنہم کا اپنے اجتہاد سے رکنا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی رائے پر آجانا یہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی تقلید تھی۔

اذا اختلفوا فى شئى اسند واالیه وصدروا عن رايه (ایضاً ص ۲۳۳)

جب صحابہ میں کسی مسئلے میں اختلاف ہو جاتا تو وہ اسے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سپرد کرتے اور اپنی رائے سے رجوع کرتے۔

اہل علم کا فتویٰ وہ علمی رائے ہے جسے وہ صادر کرتے ہیں۔ اس پر انہیں یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ وہ رائے پر چلتے ہیں۔ جو رائے کتاب وسنت کی روشنی میں قائم کی جائے وہ اجتہاد ہے فقہ ہے محض رائے نہیں نہ اسے محض رائے کہہ کر رد کیا جا سکتا ہے۔

(۴)......کوفہ میں دو ہی بڑے عالم تھے، ایک والی کوفہ حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ ان صحابہ رضی اللہ عنہ میں سے ہیں جو بقول صفوان بن سلیم آنحضرت ﷺ کے عہد میں مجاز فتوے ہو چکے تھے۔ کوفہ میں ان دنوں حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ آئے تھے خلافت عثمانی میں یا فتویٰ یہاں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا چلتا تھا یا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگردوں کا۔ ایک مسئلہ میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی رائے اور تھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اور جب حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے کا پتہ چلا تو آپ نے فرمایا:

لا تسئلوني مادام هذا الحبر فيكم (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۷، سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۴۴)

مجھ سے کوئی مسئلہ نہ پوچھا جب تک یہ بڑا عالم تم میں موجود ہے۔

یہ مسئلہ وراثت کے باب میں تھا۔ ایک دفعہ رضاعت میں ایک مسئلہ اٹھا اس وقت بھی حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے یہی کہا:

لاتسئلوني عن شئي ماقام هذا بين اظهرنامن اصحاب رسول الله ﷺ (رواہ الطبرانی، مجمع الزوائد، ج ۴ ص ۲۶۲)

یہ صورت عمل تمام اہل کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تقلید شخصی نہیں تو اور کیا ہے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے تو بقسم کہہ دیا تھا۔

والله لا افتيكم ما كان بها (رواہ عبدالرزاق کمافی کنزالعمال ج ۱ ص ۱۴۷)

بخدا میں تمہیں کبھی فتوے نہ دوں گا جب تک یہ وہاں موجود ہیں۔

(۵)...... ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی منزلتِ علمی سے کون واقف نہیں، آپ (اپنے سے اعلم) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کے ہوتے ہوئے کوئی رائے قائم کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

عن ابن عباس رضي الله عنهما قال اذاحدثنا ثقة عن علي لم نتجاوزها. (فتح الباری ج ۷ ص ۶۰)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جب کوئی ثقہ شخص ہمیں کہہ دے کہ علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کہا ہے تو پھر ہم کسی اور طرف نہ جائیں گے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ ایک دفعہ حج کے ارادہ سے نکلے مکہ کے راستہ میں نازیہ کے مقام پر اپنی سواریاں گم کر بیٹھے اس تلاش اور پریشانی میں حج کا دن بھی گزر گیا۔ قربانی کے دن (۱۰ تاریخ) آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور

مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا:

فقال عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ المعتمر مایصنع اصنع ثم قد حللت فاذا ادرکک الحج قابلا فاحج واھد ماتیسّر من الھدی (موطا امام مالک ص ۱۴۹)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اب آپ وہ کریں جو عمرے والا کرتا ہے (حج کا دن تو گیا) آپ احرام سے نکل آئیں گے جب اگلے سال آپ کو حج ملے تو حج کریں اور جو قربانی میسر ہو دے دیں۔

دیکھیے یہاں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دلیل کا مطالبہ نہیں کرتے نہ حدیث پوچھتے ہیں۔ ان کے اعتماد پر بغیر مطالبہ دلیل عمل کرتے ہیں۔ اور احرام کھول دیتے ہیں۔ اگر کسی عالم کے قول پر اس سے دلیل پوچھے بغیر عمل کرنا ناجائز ہوتا تو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقلید کیوں کرتے ان سے دلیل کیوں نہ پوچھتے؟

تابعین، صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کی پیروی میں

تابعین میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے قول کی پیروی ہرگز کوئی عیب نہ سمجھی جاتی تھی۔ ان میں ایسے لوگ نہ تھے جو کہیں اقوال کو چھوڑو، حدیث کی تلاش کرو۔ ان کے ذہن میں اقوال فقہ حدیث کے مقابل نہ تھے حدیث کا حاصل عمل ہی ان کے ہاں قول فقہ سمجھا جاتا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے:

ان اھل المدینۃ سألوا ابن عباس رضی اللہ عنھما عن المرأۃ طافت ثم حاضت قال لھم تنفر قالوا لانأخذ بقولک وندع قول زید. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۳۷)

مدینہ کے لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا۔

ایک عورت فرض طواف کے بعد ایام میں ہوگئی۔ اب کیا وہ
(طواف وداع کیے بغیر) جاسکتی ہے؟ آپ نے کہا جاسکتی ہے،
انہوں نے کہا ہم آپ کا قول نہ لیں گے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ
کے قول پر رہیں گے۔

مدینہ والے دلیل کی تحقیق میں نہ پڑے۔ انہوں نے یہ نہ کہا کہ اس مسئلے میں حدیث کی تلاش میں نکلو۔ ان کے ہاں فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال پر عمل کرنا کسی قول کو لینا اور کسی کو نہ لینا دین پر عمل کرنے کی ایک راہ تھی۔ یہ تقلید ہے کہ اہل قول پر بایں خیال کہ وہ دلیل کے مطابق بات کہیں گے عمل کرنا اور دلیل کی بحث میں نہ پڑنا یہ وہ راہ ہے جس پر قومیں ہمیشہ چلی ہیں۔ اس سے پتہ چلا مدینہ والوں میں ان دنوں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی تقلید جاری تھی۔

دلیل کی طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے توجہ دلائی کہ مدینہ جاکر حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہ سے پوچھ لینا مگر مقلدین اس قول پر رہے جب تک کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس سے رجوع نہ کرلیا۔ حضرت زیدؓ نے اپنے اس فیصلے کی اطلاع حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بھی دی۔ یہ مجتہدین کا اپنا معاملہ ہے مقلدین اپنے امام کے قول کے پابند رہنے میں کوئی شرعی حرج نہ سمجھتے تھے۔

تقلید کی ایک اور مثال

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مسئلہ پوچھا گیا کہ ایک شخص پر ایک معین مدت کا فرض ہے صاحب مال کو ضرورت پڑی وہ مدت ختم ہونے سے پہلے اپنی رقم واپس مانگتا ہے اور اس قبل از مدت لینے کے بدلے اپنا مال چھوڑتا ہے کیا اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے؟ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں:

فکرہ ذلک ونھی عنہ (موطا امام مالک)

آپ نے اسے ناپسند فرمایا اور اس سے اسے روک دیا۔

سائل نے آپ سے اس قول کی دلیل نہیں پوچھی نہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس پر کوئی دلیل بیان کی یہی تقلید ہے کہ مجتہد کے علمی اعتماد پر کوئی مقلد اس کے قول پر عمل کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس فتوے پر قرآن کریم یا سنت نبوی سے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اس پر بلا طلب دلیل عمل کیا۔ دوسرے کے قول پر یہ بلا طلب دلیل عمل کرنا اور اس پر اعتماد کرنا ہی تو تقلید ہے سو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں تقلید جاری تھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ۱۔ مجتہد یا ۲۔ مقلد۔ غیر مقلد ان دنوں کوئی نہ تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ قرۃ العینین میں لکھتے ہیں۔

صحابہ وتابعین ہمہ در یک مرتبہ نبودند بلکہ بعض ایشاں مجتہد بودند و بعض مقلد قال اللہ تعالیٰ لعلمہ الذین یستنبطونہ وحقیقت اجماع اتفاق مجتہدین است وغیر مجتہدین را در حل وعقد مدخل نیست پس دلیل ثالث از ادلہ اربعہ کہ اخذ بآں واجب است اتفاق مجتہدین لاغیر اگر در مسئلہ بعض اہل تقلید قولی گفتہ باشند و مجتہدین اتفاق نمودہ باشند بر قول دیگر دلیل قطعی کہ اخذ بآں واجب است ہماں قول مجتہدین خواہ بود۔ (قرۃ العینین ص ۲۵۱ مکتبہ سلفیہ لاہور)

اس سے واضح ہوا کہ دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں مقلدین تو تھے مگر غیر مقلدین اس دور میں کہیں نہ تھے۔

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں تقلید کا ایک اور ثبوت

حضرت قبیصہ بن جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم ایک دفعہ احرام باندھے کہیں جارہے تھے کہ راستے میں سامنے سے ایک ہرن گزرا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ

عنہ نے اسے ایک پتھر مارا، آپ کا ارادہ اسے مارنے کا نہ تھا مگر وہ مر گیا۔ اب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ احرام کی حالت میں یہ کسی جانور کو مارنا کیسا؟ یہ مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو نے یہ پتھر عمداً مارا یا خطاءً انہوں نے کہا پتھر تو عمداً مارا تھا مگر ہرن کو مارنے کا ارادہ نہ تھا آپ نے فرمایا تم نے عمد اور خطا کر جمع کر دیا ہے عمد کی صورت میں کفارہ لازم آتا ہے خطا کی صورت میں صدقہ لیکن یہ ایک عجیب صورت حال تھی عمدٗ اور خطا جمع تھے جب کچھ تردد پیدا ہو جائے اس کا فائدہ قصوروار کو پہنچا ہے آپ نے انہیں صدقہ دینے کا حکم دیا ایک بکری ذبح کر کے اس کا گوشت فقرا کو دے دیا جائے۔

یہ حضرات بھی اہل علم تھے وہاں تو نہ بولے لیکن واپس آتے آپس میں کہنے لگے حرم میں جانور کا قتل بڑا سنگین معاملہ ہے ہمیں کفارہ دینا چاہیے اور ایک اونٹ ذبح کرنا چاہیے حدیث میں یہ مسئلہ کہیں مذکور نہ تھا کہ یہ حضرات اس کے مطابق فیصلہ کرتے اب اجتہاد سے چارہ نہ تھا یہ حضرات اپنا اجتہاد کریں یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر عمل کریں۔

یہ صرف تقلید اعلم کا مسئلہ نہ تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ امام فقہ تھے بلا دلیل اگر کسی کا قول قبول کیا جائے تو وہ قول کسی بڑے عالم کا ہونا چاہیے جتنا کسی کا علم اُونچا ہوگا اتنا اس پر اعتماد پختہ ہوگا اس کے فیصلے میں کتاب وسنت کی روح کارفرما ہوگی کسی کی بات بلا دلیل ماننی ہے تو پھر وہ کسی بڑے امام کی بات ہونی چاہیے۔

قبیصہ بن جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہماری بات کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ہوگئی آپ غصہ میں بھرے تشریف لائے اور کوڑے مارنے لگے آپ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے کہا:

قتلت فی الحرم وسفهت الحکم وتغمض الفتیاء

(تفسیر ابن جریر ج ۷ ص ۳۰)

تو نے جانور کو حرم میں مارا میرے حکم کو بے وقوفی سمجھا اور اس فقہی

فتوے کو نظر انداز کیا۔ (یہ کوڑے اس کی سزا ہیں)

معلوم ہوا جس مسئلہ قرآن و سنت کا منصوص فیصلہ نہ ملے اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم بھی فقہ سے کام لیتے تھے۔ امام کے فتوئی کو معمولی سمجھنا ان کے ہاں ایک قابل تعزیر جرم تھا ایسے مسائل میں صرف اتباع عالم کافی نہیں، شیرازۂ امت کو بندھا رکھنے کے لیے تقلید اعلم کی ضرورت ہے۔

ایک اور شبہ اور اس کا جواب

ایک شبہ: اگر اس دور میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقلید ہوتی تھی آج بھی انہی کی تقلید چاہیے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کیوں اختیار کی گئی ہے؟

جواب: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے شک ایک اُونچے درجے کے امام فقہ تھے مگر ان کا مذہب اپنے جملہ اصول و فروع کے ساتھ مدون نہیں ہوا، بطور ضابطہ کے تقلید ان ائمہ علم کی ہونی چاہیے جن کا مذہب اصول و فروع میں مدون ہو چکا ہوا، اور ضرورت کے ہر موقع پر اس کی طرف رجوع کیا جا سکے اسی امت میں اس پیرئے میں جو مذاہب مدون ہوئے وہ صرف چار ہی ہیں۔

پھر ان ائمہ علم کے اپنے فیصلوں میں پہلے دور کے ائمہ علم (حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما) کی پیروی موجود ہے، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو فیصلے ہمیں صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملیں ہم انہیں بسر و چشم قبول کرتے ہیں سو آپ کی فقہ از خود صحابہ رضی اللہ عنہم کی فقہ کو شامل ہے۔

حضرت معین الدین اجمیری نے بجا لکھا ہے:

> امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مقلد ہیں۔ (القول الاظہر، ص ۶)

آگے یہ اللہ رب العزت کی حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر عنایت ہے کہ ان

کا مذہب اصول فروع میں اس طرح مدون ہوا کہ اس کی علمی دنیا میں اور کوئی مثال نہیں ملتی، ان کے قریب قریب اور کسی امام کے مذہب کی تدوین پہنچتی ہے تو فقہ شافعی ہے۔

سو اس امت میں مسائل غیر منصوصہ میں اگر کوئی مذاہب فقہی ضرورتوں کو پورا کر سکتے ہیں تو وہ یہ مذاہب اربعہ ہی ہیں اور اس امت میں ایسے مواقع میں صرف انہی کی پیروی جاری ہوئی ہے۔

عہد رسالت ﷺ
کے
فقہائے کرام

ائمہ فقہ

آنحضرت ﷺ کی علمی تربیت اور آپ کے فیض صحبت سے اس امت میں فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت ابھری، نظم سلطنت میں جس طرح خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اس امت کے قافلہ سالار رہوئے اسلام کی روشنی ہر دائرہ زندگی میں پہنچانے کے لے اور منتہائے عالم تک اس شمع فروزاں کو باقی رکھنے کے لیے فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم آگے بڑھے۔ یہ حضرات حضور خاتم النبیین ﷺ سے اس کام کی سند لے کر چلے اور تاریخ گواہ ہے کہ اس امت میں پھیلتے علم کے چراغ ان ائمہ فقہ کی کاوشوں سے ہی روشن ہیں۔ فقہ کے یہ وہ بارہ امام ہیں کہ اقوام عالم رہتی دنیا تک ان کے علم کی محتاج رہیں گی اور جہاں بھی علم کا کوئی تار اچکا اس میں انہی کی شمع فروزاں ضوفشاں ہوگی۔

یوں تو فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم اور بھی ہوئے لیکن جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے فقہ میں شہرت پائی ان میں یہ بارہ بہت ممتاز ہوئے:

(۱) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (۲) حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ، (۳) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، (۴) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، (۵) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، (۶) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، (۷) حضرت علیٰ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، (۸) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، (۹) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، (۱۰) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، (۱۱) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما، (۱۲) اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ۔

فقہاء کے قول کی پیروی عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتی تھی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مدینہ کے لوگوں نے مسئلہ پوچھا کہ اگر کسی عورت کو طواف افاضہ کے بعد ایام شروع ہوگئے تو وہ واپس ہوسکتی ہے یا طواف وداع کے لیے وہ رُکی رہے انہوں نے فتویٰ دیا وہ جاسکتی ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا فتوے تھا کہ وہ رُکی رہے اور پاک ہونے تک انتظار کرے جب پاک ہوتو

طواف وداع کرے اور پھر وطن واپس ہو۔

دیکھئے عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجتہدوں کا اختلاف ہے اور لوگ ان کے اقوال کی پیروی کر رہے ہیں اور سب لوگ اپنی جگہ مطمئن ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں مجتہد کے قول کی پیروی کرنا کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا نہ اس وقت کوئی ایسا گروہ تھا جو کہے کہ فقہاء کے اقوال کی پیروی کیوں کرتے ہو؟ صرف حدیث پر عمل کرو، یہ قول کیا لیے پھرتے ہو۔ حدیث نہ ملے تو اپنی مرضی کرو، فقہ کی بات نہ لو، فقہاء کی پیروی نہ کرو۔

حدیث کا علم مجتہد کے پاس ہوتا ہے اگر وہ حدیث پیش کردے اور وہ لوگوں کو معلوم ہو، اور اس کا معارض بھی کوئی نہ ہو تو پھر دوسرے مجتہد کی بات چھوڑی جاسکتی ہے ورنہ جو لوگ اس دوسرے مجتہد کی پیروی میں لگے ہیں ان کے لیے اس کی پیروی ہرگز کوئی غلط اقدام نہ ہوگا اور دونوں طرف کے مقلدین اللہ تعالیٰ کے ہاں ماجور ہوں گے۔

یہ بات پختہ ہے کہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں مجتہدین کے قول چلتے تھے اور امت میں ان پر عمل ہوتا تھا اور اسے ہرگز کوئی گناہ نہ سمجھا جاتا تھا نہ عوام اس پر عمل کے لیے اس قول مجتہد پر دلیل کا مطالبہ کرتے تھے مجتہد خود اپنی بات پر دلیل پیش کردے تو یہ اور بات ہے یہاں اتنی بات واضح ہے کہ عوام کے لیے بلا طلب دلیل مجتہد کے قول پر عمل کرنا اس عہد میں بھی جاری تھا اور اسے ہرگز کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں:

عن عكرمة ان اهل المدينة سالوا ابن عباس عن امرأة طافت ثم حاضت قال لهم تنفر قالوا لا ناخذ بقولك وندع قول زيد قال اذا قدمتم المدينة فاسئلوا فقدموا المدينة فسئلوا فكان فيمن سالوا ام سليم فذكرت حديث صفية رواه خالد وقتادة عن عكرمة.

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۳۷)

مدینہ کے لوگوں نے حج کے موقعہ پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

سے مسئلہ پوچھا عورت نے طواف (افاضہ) کرلیا ہے اور اب اسے ایّام شروع ہوگئے ہیں آپ نے کہا '' واپس جاسکتی ہے انہوں نے کہا ہم آپ کے قول کی پیروی نہ کریں گے ، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے قول کو نہ چھوڑیں گے آپ نے کہا جب تم مدینہ جاؤ تو وہاں پوچھ لینا۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو انہوں نے جن سے پوچھا ان میں ام سلیم رضی اللہ عنہا بھی تھیں انہوں نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بیان کی جسے خالد، قتادہ اور عکرمہ نے روایت کیا ہے۔

اس صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ اصحاب رضی اللہ عنہم میں مختلف مدارج کے لوگ تھے۔ (۱) فقیہ بھی تھے۔ اور (۲) فقہاء کے قول پر عمل کرنے والے مقلدین بھی۔ جو اپنے اپنے امام کے قول کو فائق سمجھتے تھے یہ اس وقت تک ہوتا تھا جب تک سنت سامنے نہ آئے اور اجتہاد کا موقع رہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وآں جماعت سلیم الفطرت برمنازل شتی بودہ اند طائفہ مخلوق براستعدادے کہ شبیہ باستعداد انبیاء بودہ نمونہ از نبوت در جوہر طبعیت ایشاں مودع ایشاں سردفتر امت آمدند وبشہادت دل آں داعیہ وآں علوم راتلقی نمودہ اندو پارہ از تحقیق نصیب ایشاں شد وطائفہ استعداد تقلید تمام داشتند وقبول انعکاس آں داعیہ وآں علوم نمودند وحصہ از سعادت یافتند و کلاوعد اللہ الحسنیٰ

(ازالۃ الخلفاء ج ا ص ۵۶۸)

صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ سلیم الفطرت جماعت کئی درجوں میں تھی (۱) ان میں ایسے لوگ بھی رہے جن کی قابلیت انبیاء کرام کی قابلیت کے مشابہ ہو اور ان کی فطرت میں نبوت کا ایک طور ودیعت کیا گیا ہو۔ یہ لوگ اس امت کے سرِدفتر ٹھہرے انہوں نے دل

کی شہادت سے نبوت کے اس داعیہ اور نبوت کے علوم کی تلقی کی اور کچھ مقام تحقیق ان کے نصیب میں ہوگیا اور (۲) دوسرا طبقہ ان میں (صحابہ رضی اللہ عنہم میں) ایسا ہوا جن میں کامل تقلید کی استعداد جلوہ گر تھی۔ انہوں ے نبوت کے اس داعیہ کو (جو پہلے گروہ میں ودیعت ہوا) اور اس کے علوم کو اپنے اندر عکساً قبول کیا یہ بھی الٰہی سعادت پا گئے اور جنت کا وعدہ تو قرآن میں سب صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیا گیا ہے وکلاوعدالله الحسنی والله بماتعملون خبیر۔

اس سے پتہ چلا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں تحقیق وتقلید دونوں سلسلے قائم تھے۔ آگے امت میں جو مجتہدین اور مقلدین چلے انہوں نے یہ طور دور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہی پایا ہے، یہ حقیقت ہے کہ احکام شرعیہ کا علم انہی دوراہوں سے ہوتا ہے (۱) تحقیق اور (۲) تقلید ہے۔

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

علم بہ احکام شرعیہ بہ دو طریق حاصل ے شود (۱) تقلید و (۲) تحقیق وعلم انبیا از جنس علم تقلیدی اصلاً نیست بلکہ آنچہ ایشاں را ازیں علم بدست آمد ہمہ بطریق تحقیق حاصل شد۔ (منصب امامت ص ۵۲)

احکام شرعیہ کا علم دو طریق سے حاصل ہوتا ہے تقلید سے اور تحقیق سے انبیاء کرام کا علم اپنی جنس میں علم تقلیدی نہیں ہوتا، انہیں (اس راہ کا جو علم ملتا ہے وہ بہ طریق تحقیق ملتا ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

پس مشابہ بانبیاء دریں فن مجتہدین مقبولین اند پس ایشاں را از ائمہ فن باید شمرد مثل ائمہ اربعہ...... پس گویا مشابہت تامہ دریں فن نصیب ایشاں گردیدہ بناءً علیہ درمیان جماہیر اہل اسلام از خواص وعوام

بلقب امام معروف گردیدند وبقوت اجتہاد موصوف۔ (ایضاً ص ۵۳)
پس اس فن میں انبیاء کے مشابہ مجتہدین مقبولین ہوئے ہیں انہیں ائمہ فن شمار کرنا چاہیے جیسے کہ چار امام ہوئے ......اس فن میں مشابہت تامہ انہی کو نصیب ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ عامہ اہل اسلام میں خواص ہوں یا عوام یہ حضرات ملقب با مام ہوئے اور مجتہد ہونے کی صفت انہی میں پائی گئی ہے (پس جب یہ امام ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان کے پیرو بھی ہوں گے)

ائمہ اربعہ سے پہلے جلیل القدر فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم ہوئے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی پیروی کی اور تابعین بھی برسوں ان کی تقلید میں چلے یہ فقہ کے وہ بارہ امام ہیں کہ امت کا پورا علم فقہ اُن کا رہینِ احسان ہے۔ ان فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم نے امت میں استخراج واستنباط کی راہیں تو کھولیں لیکن وہ قواعد کو مدون نہ کر سکے اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ سعادت بعد کے مجتہدین کے نام لکھی تھی اور ان میں بھی بازی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ لے گئے۔

نوٹ

پیشتر اس کے کہ ہم عہد رسالت ﷺ کے فقہائے کرام کا علیحدہ علیحدہ ذکر کریں ناانصافی ہوگی۔ اگر اس شخصیت کریمہ کا ذکر نہ کیا جائے جن کی طرف کل فقہائے صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی مشکلات میں رجوع کرتے تھے اور انہیں بلا تامل فقہائے صحابہ رضی اللہ عنہم کا علمی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ہماری مراد یہاں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں جو اہلبیت رسالت میں اس نوعمری میں لائی گئیں کہ معارف رسالت کو اس عمر میں پوری طرح حفظ کرنے کی ان سے بجا طور پر امید کی جا سکے اس عمر میں آپ نے علم رسالت کو اپنے پاس اس طرح محفوظ کر لیا کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد دنیائے اسلام نصف صدی تک ان کے علوم سے منور ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ انشاء اللہ
حافظ شمس الدین الذہبی رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۴۸ھ) حفاظ حدیث کے تذکرہ میں

حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ام عبدالله حبيبة رسول الله ﷺ بنت خليفة رسول الله ﷺ ابى بكر الصديق رضى الله عنه من اكبر فقهاء الصحابة و كان فقهاء اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يرجعون اليها (تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۶)

ام عبداللہ حضور پاک ﷺ کی حبیبہ، رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کی بیٹی بڑے فقہائے صحابہ رضی اللہ عنہم سے تھیں، فقہائے صحابہ رضی اللہ عنہم (اپنے مسائل میں) اُن کی طرف رجوع کرتے تھے۔

اب ہم عہد رسالت ﷺ کے فقہائے کرام کا ترتیب وار ذکر کریں گے۔

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

دینی خدمات

دینی خدمات کے سلسلے میں سب سے اہم کام اسلام کی نشرواشاعت کا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا بے حد اہتمام رکھتے تھے وہ عربی قبائل جو عراق وشام میں آباد تھے نسبتاً آسانی کے ساتھ مسلمان ہو چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں میں تبلیغ کا خاص خیال تھا چنانچہ اکثر قبائل معمولی کوشش سے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے چنانچہ قادسیہ کے بعد دیلم کی چار ہزار عجمی فوج نے اسلام قبول کیا۔ (فتوح البلدان ص ۲۰۹)

غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں نہایت کثرت سے اسلام پھیلا۔

اشاعت اسلام کے بعد سب سے اہم کام دینی تعلیم و تربیت اور شعائر اسلام کی ترویج ہے جس کی کوششیں انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد ہی سے شروع کر دی تھیں۔ قرآن مجید جو اساس اسلام ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے اصرار پر کتابی صورت میں عہد صدیقی میں مرتب کیا گیا اس کے بعد انہوں نے اپنے دور خلافت میں اس کی تعلیم کا اہتمام کیا۔ معلمین اور حفاظ اور مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ جیسے کبار صحابہ کو قرآنی تعلیم عام کرنے کے لیے ملک شام بھیجا۔ غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ان کوششوں سے قرآن کی تعلیم ایسی عام ہوئی کہ ناظرہ پڑھنے والوں کا تو شمار ہی نہیں حافظوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ صرف میری فوج میں تین سو حفاظ ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت قبول کرتے وقت نہایت احتیاط اور چھان بین سے کام لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کسی کام میں مشغول تھے، حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ آئے اور تین دفعہ سلام کر کے واپس چلے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کام سے فارغ ہوئے تو ابوموسیٰ کو بلا کر پوچھا کہ تم واپس کیوں چلے گئے تھے؟ انہوں نے

جواباً کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تین دفعہ اجازت مانگو اگر اس پر بھی نہ ملے تو واپس چلے جاؤ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس روایت کا ثبوت دو ورنہ میں آپ کو سزا دوں گا۔ (مسلم باب الاستیذان)

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو شہادت میں پیش کیا۔ اس طرح کسی عورت کا حمل ضائع کردینے کے مسئلے پر مغیرہ رضی اللہ عنہ نے حدیث روایت کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہادت طلب کی جب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی تو پھر قبول کی۔ (ابوداؤد کتاب الدیات باب دیۃ الجنین)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اپنے خطبوں اور تقریروں میں مسائل فقہیہ بیان فرمایا کرتے تھے اور دور کے ممالک کے حکام کو بھی فقہی مسائل لکھ کر روانہ کیا کرتے تھے۔ مختلف فیہ مسائل کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں پیش کر کے طے کراتے۔ تمام مفتوحہ ممالک میں فقہاء مقرر کیے۔ اور ابن جوزی کے بیان کے مطابق ان کو بیش بہا تنخواہیں دیں، عملی انتظامات کی طرف بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کافی توجہ فرمائی۔ مسجدیں تعمیر کرائیں، امام و مؤذن مقرر کیے، حرم محترم کی عمارت ناکافی تھی ۱۷ھ میں اس کو وسیع کیا، مسجد نبوی کو بھی وسعت دی۔ مسجدوں میں روشنی اور فرش کا انتظام بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا ہر سال خود حج کے لئے جاتے اور خبر گیری کی خدمات انجام دیتے۔ (اسد الغابہ تذکرہ عمر رضی اللہ عنہ)

سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

اسلام میں امت کے اختلاف کے وقت ہدایت کا نشان اور حق کا معیار آپ ہی رہے آپ کے عہد خلافت میں امت میں کچھ اختلافات چلے آنحضرت ﷺ پہلے خبر دے گئے تھے کہ جب امت میں اختلافات چلے تو یہ شخص اس دن ہدایت پر ہوگا۔ هذا یومئذ علی الهدی۔ (جامع ترمذی ج۲ ص۵۶۹ مطبوعہ لکھنؤ)

آپ کو رفیق نبوت ہونے کا اعزاز حاصل ہے آپ کا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کو قرآن وسنت کے نام پر کھلا اور آزاد نہ رہنا چاہیے۔ اپنے اسلام کی پیروی بھی اپنے اوپر لازم کرنی چاہیے، آپ کے انتخاب خلافت کے وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے آپ سے سیرت شیخین کی پابندی کا عہد لیا اور آپ نے اسے قبول کیا اگر یہ شرط کتاب وسنت کے خلاف ہوتی تو آپ کبھی یہ عہد نہ دیتے اس پر اور صحابہ میں سے بھی کسی نے اعتراض نہ کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کو قرآن وسنت کے بعد صالحین امت کے فیصلوں کو بھی ساتھ لے کر چلنا چاہیے باوجود یکہ آپ خود مجتہد تھے۔ اس کے باوجود آپ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی پیروی میں چلے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعض خاص اجتہادی مسئلے

(۱)...... آنحضرت ﷺ اور حضرات شیخین کریمین رضی اللہ عنہم کے عہد سے دیت میں اونٹ کا طریقہ چلا آرہا تھا آپ نے دیت میں ان کی قیمت دینی بھی جائز قرار دی کیوں کہ یہاں اونٹوں میں سوائے مال کے اور کوئی جہت نہیں پائی جاتی، قاضی القضاۃ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور میں یہی فتوے دیا۔ (کتاب الخراج ص ۹۳)

(۲)...... آپ حج تمتع میں حج اور عمرہ کے لیے ایک نیت کرنے کے قائل رہے، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ اس مسئلہ میں متفق نہ تھے۔ اس قسم کے اختلافات میں صحابہ رضی اللہ عنہم بڑوں کا ہمیشہ احترام کرتے وہ کسی طرح اسے نص صریح کی مخالفت نہ سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ منیٰ میں مسافر کے لیے نماز

قصر کرنے کو ضروری سمجھتے تھے۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز قصر نہ کی پوری چار رکعات پڑھائیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی چار پوری کیں اور فرمایا میں امیر المومنین کی مخالفت نہ کروں گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہ نیت امامت چار رکعت پڑھنے کو جائز سمجھتے ہیں۔

(۳)...... حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مطلقہ عورت کو اگر اس کا خاوند دوران عدت مرجائے اس خاوند کا وارث قرار دیتے تھے کہ ابھی وہ عورت دوسرے خاوند کے پاس جانے کی اہل نہیں ہو سکی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے وارث نہ سمجھتے تھے۔

(۴)...... اگر کوئی شخص حالت عدت میں کسی عورت سے نکاح کرے تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاں مستوجب سزا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک وہ نکاح تو جائز نہیں لیکن آپ اسے مستوجب سزا نہ سمجھتے تھے۔

(۵)...... قتل کے مسئلہ میں قاتل پر قصاص آتا ہے یا دیت (اگر مقتول کے وارث اسے منظور کرلیں) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک شخص قتل ہو گیا اس کا کوئی وارث نہ تھا جو دیت کی منظوری دے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحیثیت امیر المومنین اپنے آپ کو اس کا ولی قرار دے لیا اور دیت کی منظوری دے دی پھر دیت میں جتنا مال ملا وہ سب بیت المال میں داخل کرا دیا۔ کیوں کہ آپ نے اپنے لیے حق ولایت بحیثیت امیر المومنین قائم کیا تھا، سو اس دیت پر بھی قبضہ قوم کا ہونا چاہیے تھا۔

اس قسم کے باریک مسائل سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مجتہدانہ نظر کتنی باریک تھی اور کس طرح مسائل میں آپ بال کی کھال اتارتے تھے، جو لوگ آپ کے مسائل تک نہ پہنچ سکے وہ آپ پر ان مسائل میں انگلی اٹھاتے رہے، آپ نے ایک ایسے موقعہ پر بڑے دلسوز انداز میں فرمایا:

> ہم لوگ بخدا حضور ﷺ کے سفر کے ساتھی بھی رہے ہم بیمار پڑتے تو حضور ﷺ ہماری عیادت کے لیے تشریف لاتے ہمارے (صحابہ رضی اللہ عنہم) کے جنازوں کے پیچھے پیچھے چلتے جو

مگر الحمد اللہ ایسا نہ ہوا یہ حضرات اسے ایسی بنیادیں مہیا کر گئے کہ اس پر پھر سراجی اور شریفی جیسی کتابیں لکھی گئیں۔

پہلوں کی پیروی سے ہی قوموں نے عروج پایا ہے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی فکری آزادی کے سخت خلاف تھے، آپ نے فرمایا مسلمانوں نے جو بھی عروج پایا ہے وہ پہلوں کے نقش قدم پر چلنے سے پایا ہے، آپ کے نزدیک نقطۂ وحدت ملت یہ رہا ہے کہ امت نئے نئے اجتہادات سے بچے اور پہلوں کی پیروی کو کافی سمجھے آپ نے فرمایا:

انما بلغتم بالا قتداء والا تباع فلا تلفتنکم الدنیاعن امر بکم (تاریخ طبری ج۵ ص۴۵)

بیشک تم جس مقام پر پہنچے ہو وہ پہلوں کی اقتداء اور اتباع سے ہی پہنچے ہو، دیکھنا دنیا کہیں تمہیں حکم الٰہی سے دوسری طرف نہ کردے۔

جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کسی حکم کو نہ بدلا اپنی سعادت پہلوں کی پیروی میں ہی سمجھی۔ پھر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پیروی میں چلے۔

حافظ ابن حزم (۴۵۷ھ) لکھتے ہیں:

ثم ولی علی فما غیر حکما من احکام ابی بکر وعمر وعثمان ولا ابطل عهداً من عهودهم.

(کتاب الفصل ج۴ ص۹۷)

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ والی حکومت بنائے گئے آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے احکام میں سے کسی حکم کو نہ بدلا ور نہ ان کے دیئے گئے عہود میں سے کسی عہد کو توڑا۔

قاضی نور اللہ شوستری نے بھی مجالس المومنین میں اس کی تائید کی ہے۔

تابعین کرام میں سے جن حضرات نے آپ سے حدیث پڑھی ان میں علقمہ بن قیس (۶۲ھ) ابووائل شقیق بن سلمہ کوفی (۸۲ھ) زید بن وہب (۸۴ھ) حضرت سعید بن المسیب (۹۱ھ) مالک بن اوس (۹۲ھ) ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن (۹۴ھ) ابوعبداللہ قیس بن ابی حازم بجلی (۹۷ھ) اور حسن بن الحسن الیسار (۱۱۰ھ) سرفہرست ہیں۔

آپ کے فقہی فیصلوں کو سب سے زیادہ جاننے والے حضرت سعید بن المسیب ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ص ۶۳)

آپ آنحضرت ﷺ سے بہت کم حدیث روایت کرتے تھے، مبادا کوئی لفظ خلاف احتیاط زبان سے نکل جائے تاہم مسائل کے بیان میں آپ پیچھے نہ رہتے تھے۔ حافظ ابویعلیٰ موصلی حمران بن ابان سے بروایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک حدیث نقل کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

كان قليل الحديث من رسول الله ﷺ

(مسند ابی یعلی، ج ا ص ۱۵۴)

آپ آنحضرت ﷺ سے بہت کم حدیثیں روایت کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آپ کے مقابلہ میں کثیر الحدیث تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کا علم حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کم تھا۔

ملک اموال اور حدود بیت المال میں آپ کا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے اختلاف ہوا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کا ساتھ دیا جمع قرآن کے وقت نسخ مصاحف کے مسئلے میں آپ کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اختلاف ہوا صحابہ رضی اللہ عنہ نے آپ کا ساتھ دیا۔

آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں آپ کے سیکرٹری (الامین العام) رہے، حضور ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کا فیصلہ بمقابلہ انصار قریش کے حق میں ہوا تھا۔ اس لیے آپ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) شروع سے یہ نظر

رکھتے تھے کہ عام مسلمانوں میں قریش کا اکرام امتیازی درجے میں رہے اور ان کی اہانت کسی درجے میں گوارا نہ کی جانی چاہیے قریش کی دو شاخیں مکہ میں بہت ممتاز تھیں۔ بنو ہاشم اور امیہ آپ بنو امیہ میں سے تھے اور قریش کو ہر بات میں مقدم رکھنے کا نظریہ رکھتے تھے، آپ نے اپنے بیٹے عمرو بن عثمان رضی اللہ عنہ کو نصیحت کی:

یابنی ان ولیت من امر الناس شیأً فاکرم قریشاً فانی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من اھان قریشا اھانہ اللہ (مسند ابی یعلیٰ ج ا ص ۵۶ ورواہ احمد فی مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۲۷)

اے بیٹا اگر تجھے کبھی کوئی پبلک عہدہ ملے تجھے لوگوں پر کچھ بھی حق ولایت ملے تو قریش سے عزت واکرام سے پیش آنا کیونکہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے سنا ہے جو قریش کی اہانت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے لوگوں میں گرائے گا۔

آپ نے اپنے اس نظریہ کے مطابق قریش کو ہر موقع پر مقدم رکھا۔ اس سے آپ کے خلاف عام پروپیگنڈہ چل نکلا کہ آپ اپنے رشتہ داروں کو زیادہ آگے لا رہے ہیں اور یہ کنبہ پروری ہے لیکن آپ اسے ایک پالیسی سمجھتے تھے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے چلی آرہی تھی، شام میں یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور ازاں بعد معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو اس اعلیٰ عہدے پر لانے والے کون تھے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں ان اعلیٰ عہدوں پر باقی رکھا تو اسے کوئی غیر شرعی اقدام نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو آپ کے مخالفین بھی مانتے ہیں کہ آپ نے جو لوگ جن عہدوں پر لگائے وہ اس کام پر پورے اُترے اور قلمرو اسلامی ان اقدامات سے مسلسل ترقی پذیر رہی۔

بدعت سے نفرت

آپ ایک دفعہ ایک شخص کے ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ اس شخص نے فرط محبت سے رکن یمانی کا بوسہ لے لیا آپ نے اسے کچھ نہ کہا سمجھ لیا کہ یہ مغلوب الحال

ہورہا ہے مگر جب اس نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو استلام کرانا چاہا آپ نے ہاتھ پیچھے جھٹکا اور کہا کیا کر رہے ہو کیا تم نے کبھی حضور ﷺ کے ساتھ طواف نہیں کیا؟ اس نے کہا: ہاں، آپ نے پوچھا کیا تم نے کبھی آپ کو رکن یمانی کا بوسہ لیتے دیکھا؟ اس نے کہا نہیں؟ پھر آپ نے اُسے کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا مناسب نہیں؟ اس نے کہا ہاں بے شک۔ (مسند امام احمد ج اص ۶۰ـ۶۱)

اس سے آپ کے جذبۂ اتباع سنت اور نفرت از بدعت کا پتہ چلتا ہے روحانیت میں آپ مقام فراست پر تھے۔ یہ وہ مقام ہے جس پر غیب کے دروازے کھلتے ہیں بغیر اس کے کہ وہ نبوت پا جائے۔

تاریخ اسلام میں آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بمعہ اہل وعیال اللہ کی راہ میں ہجرت کی، آپ کی یہ ہجرت ملک حبشہ کی طرف تھی پھر دوسری ہجرت آپ نے مدینہ منورہ کی طرف کی، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ان کے پہلے نکاح کے وقت آپ نے چار سو درہم بطور ہدیہ دیئے جس سے انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر ادا کیا۔

خلافت تامہ وہ ہوتی ہے کہ خلیفہ کی وفات خلافت میں ہو، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت تا آخر نہ رہی، اس لیے اسلام میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم چار ہی سمجھے گئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کچھ لوگ اُٹھے اور انہوں نے آپ سے خلافت چھوڑنے کا مطالبہ کیا آپ نے اس نہایت اذیت ناک صورت حال کا مقابلہ کیا مگر خلافت سے دستبردار نہ ہوئے اگر آپ خلافت چھوڑ دیتے تو خلافت راشدہ شیخین کریمین تک محدود ہو کر رہ جاتی یہ مغربی جمہوریت ہے جس میں سربراہ چُنے بھی جاتے ہیں اور اُتارے بھی جاتے ہیں اسلام میں کسی سربراہ کو اس وقت تک اُتارا نہیں جا سکتا جب تک وہ کھلے کفر کا ارتکاب نہ کرلے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسلامی سیاست کے اس اصول پر اتنے پختہ عمل کرنے والے تھے کہ آپ نے جان کی قربانی دے کر خلافت کے اس اصول کو باقی رکھا کہ خلیفہ وقت اور امام المسلمین کو عوامی تحریک سے نہیں اتارا جا سکتا۔

نوٹ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات بے شک خلافت میں ہوئی مگر

آپ کی خلافت کا پہلی خلافتوں سے تسلسل نہ رہا تھا۔ آپ کی خلافت کا آغاز شوریٰ و انتخاب سے نہیں، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی صلح سے ہوا تھا۔

عراق میں حکومت کی بہت سی زمین غیر آباد پڑی تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جنہوں نے اسے قابل زراعت بنایا۔ آپ نے انہیں اس زمین کا مالک بنا دیا آپ کے پاس حضور ﷺ کی یہ ہدایت موجود تھی۔

من احیی ارضاً میتۃً فھی لہ

جس نے بے آباد زمین آباد کی وہ اسی کی ہے۔

لیکن یہ وہ زمینیں تھیں جو حکومت کی ملک تھیں اور امیر المؤمنین کو ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق تھا اس سے ان زمینوں کو مزارعین کی ملک میں دینے کا کوئی جواز نہیں نکلتا جن کے باضابطہ مالک موجود ہوں۔

ہمیں اس وقت یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے وقت کے ایک بڑے فقیہ تھے، آپ نے کتاب و سنت پر پوری فقاہت سے عمل کرایا۔ آپ جب خلیفہ نہ تھے اس وقت بھی آپ کی مجتہد اور مفتی ہونے کی حیثیت مسلم تھی آپ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں علمی موضوعات پر مرجع خلائق ہوتے تھے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

آپ رضی اللہ عنہ امیر المومنین، خلفاء راشدین میں سے چوتھے خلیفہ راشد اور ان دس خوش نصیب صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک ہیں جن کو دنیا میں ہی جنت کی خوشخبری سنائی گئی، آپ رضی اللہ عنہ کا نام مع کنیت ابوتراب علی بن ابی طالب ہے، آپ رضی اللہ عنہ کعب بن غالب کے پوتے، ہاشمی النسب اور قرشی الحسب ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے ابن عم اور آنحضور ﷺ کی چہیتی صاجزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر اور حسنین رضی اللہ عنہما کریمین وبدرین کے والد گرامی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے والد، بطحاء کے سردار، قابل ستائش انسان اور علمبردار تھے، آپ رضی اللہ عنہ کے والد، ابوطالب نے نبی کریم ﷺ کی یتیمی کی حالت میں کفالت اور کم سنی میں پرورش اور پیغمبری کی حالت میں مدد کی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ، فاطمہ بنت اسد الہاشمیہ رضی اللہ عنہا بڑی نیک ومتقی خاتون تھیں، چشمۂ رحمت اور عین رأفت تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کی والدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سابقین اسلام میں سے ہیں، آپ رضی اللہ عنہا مہاجرین میں پیش پیش رہیں۔ حضور اکرم ﷺ ان کی زیارت کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے اور ان کے گھر میں آرام فرماتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اپنا کرتہ مبارک ان کے کفن میں لگایا اور اپنے آنسوؤں سے ان کو دنیا سے رخصت کیا۔ آپ رضی اللہ عنہا، ظہور اسلام سے تقریباً نوسال پیشتر پیدا ہوئے۔ پھر بیت نبوی ﷺ میں پروان چڑھے اور بچپن میں ہی اسلام قبول کیا۔ حضور اقدس ﷺ نے ان کی تربیت وتادیب فرمائی اور ان کو بیش بہا انعامات سے نوازا اور ان کی تعلیم کا خوب انتظام فرمایا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، اخلاق نبوی ﷺ سے متصف اور صفات نبوی ﷺ سے موصوف ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دین کی تعلیم خود حضور ﷺ سے حاصل کی، آپ رضی اللہ عنہ نیک فطرت، سلیم الطبع اور تقدیر الٰہی پر راضی رہنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ کو خوب عزتوں سے نوازا اور آپ رضی اللہ عنہ کا ذکر

خیر لوگوں میں عام کیا آپ رضی اللہ عنہ نے کبھی کسی بت یا مورتی کو سجدہ نہیں کیا اور نہ ہی شیطانی راہ کی پیروی کرتے ہوئے بت پرستی کی اور نہ ہی ان کے لیے نذر و نیاز پیش کی اور نہ بتوں کے سامنے کبھی تضرع والتجاء کی اور نہ ہی ان بتوں کے لیے جانور ذبح کیے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے نہ کسی حجر کو چھوا اور نہ کسی شجر کا طواف کیا۔

آپ رضی اللہ عنہ خوب رو اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے، آپ رضی اللہ عنہ نہ زیادہ دراز قد تھے اور نہ کوتاہ قد۔ آپ رضی اللہ عنہ کا جسم مائل بہ فربہی تھا، آنکھیں بڑی تھیں مونڈھے چوڑے اور ہاتھ کھردرے تھے، سر پر بال کم تھے، بڑے منکسر المزاج تھے، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی مفلس ہیں۔ سردیوں میں گرمیوں کا لباس اور گرمیوں میں سردیوں کا لباس زیب تن فرماتے۔ آپ رضی اللہ عنہ مہمان کا بڑا اکرام فرماتے تھے۔

آپ رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب بہت زیادہ ہیں، آپ رضی اللہ عنہ طیب الشمائل، محمود الفضائل، جمیل الصفات، صاحب الکرامات، امام العارفین، قدوۃ العالمین، اور باب مدینۃ العلم ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ امام عادل تھے، کبھی غلط فیصلہ نہیں فرمایا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے پاس سے سائل کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتا۔ مکہ میں مقیم ہوئے تاکہ امانت داروں کو ان کی امانتیں لوٹائیں۔ پھر دور دراز کے سفر کے لیے رات کے وقت خفیہ طور پر ہجرت فرمائی۔ آپ عبادت خداوندی سے بڑا شغف رکھنے والے اور بڑی بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کرنے والے تھے۔ کم کھانا اور عظیم کام سرانجام دینا آپ کو پسند تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ دین کی تعظیم کرتے اور فقراء ومساکین سے محبت کرتے تھے، آپ رضی اللہ عنہ صاحب دل آدمی تھے اور زبان سے اکثر ذکر جاری رہتا تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی ساری زندگی اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے، حدودِ الٰہیہ کو قائم کرتے ہوئے اور عبادت وخشوع اور عاجزی میں گزار دی۔ جب عمر مبارک ساٹھ سال کے قریب پہنچی تو ۴۰ھ میں ابن ملجم نے آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

اور آپ رضی اللہ عنہ کی روح مبارک اللہ رب العالمین کے حضور پرواز کر گئی۔

آپ بلاشبہ شہر علم کا دروازہ تھے

آپ بلاشبہ شہر علم کا دروازہ تھے کوفہ آپ رضی اللہ عنہ کی مسند علمی تھا اور وہیں آپ کی مسند خلافت تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۳۲ھ) پہلے سے ہی کوفہ میں فقہ و حدیث کا درس دے رہے تھے۔ ان کی وفات سے کوفہ میں جو علمی خلا پیدا ہوگیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہاں جانے سے کسی حد تک پورا ہوگیا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد کچھ ایسے لوگ بھی جمع تھے جو عبداللہ بن سبا یہودی کے ایجنٹ تھے اور سبائی سازش کے پروگرام کے تحت مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام سے اتنی روایات بنائیں کہ ان کی ہر روایت مشتبہ ہونے لگی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کہا ہوگا یا نہ کہا ہوگا۔ سو احتیاط اسی میں سمجھی جاتی رہی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہی روایات سبائی سازش سے محفوظ سمجھی جائیں۔ جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کریں۔ کوفہ کا یہی علمی حلقہ قابل اعتماد رہ گیا تھا۔ اس علمی حلقہ کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی جلا بخشی تھی اور وہاں کے لوگوں کو ان حضرات سے علمی استفادہ کا پورا موقع مل چکا تھا۔ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

> کان اهل الکوفة قبل ان یاتیهم (علی) قدا خذو الدین
> عن سعد بن ابی وقاص و ابن مسعود و حذیفة و عمار
> و ابی موسیٰ و غیرهم ممن ارسله عمرالی الکوفه.
>
> (منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۵۷)

یہ وہ نابغۂ روزگار ہستیاں تھیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے اس سرزمین میں اتری تھیں اور کوفہ کو دار الفضل ومحل الفضلاء بنا دیا تھا۔ افسوس کہ یہ سرزمین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علوم کو اچھی طرح محفوظ نہ رکھ سکی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام سے

بہت سی روایات یونہی وضع کر لی گئیں۔ سبائیوں نے اپنی مذکورہ سازش سے مسلمانوں کو جو سب سے بڑا نقصان پہنچایا وہ یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام سے روایات گھڑ کر ان کی اصل روایات کو بھی بہت حد تک مشتبہ کر دیا۔ اور اس طرح امت علم کے ایک بہت بڑے ذخیرے سے محروم ہو گئی۔ تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرویات اور ان کے اپنے فقہی فیصلے اہلسنت کی کتب فقہ و حدیث میں بھی بڑی مقدار میں موجود ہیں اور ان کے ہاں حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فقہائے صحابہ رضی اللہ عنہ میں ایک عظیم مرتبہ رکھتے تھے۔

آپ رضی اللہ عنہ کی قوت فیصلہ خداتعالیٰ کا ایک بڑا عطیہ تھا کہ کسی امت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اقضىاهم علی (مشکوٰۃ ص ۳۶۵)

کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

علامۃ التابعین عامر بن شرجیل شعبی رحمۃ اللہ علیہ (۱۰۳ھ) کہتے ہیں کہ اس عہد میں علم ان چھ حضرات سے لیا جاتا تھا۔ ۱۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ۳۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، ۴۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ۵۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، ۶۔ حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ یاد رکھئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے انتظامیہ (خلافت) کی بجائے عدلیہ (قضاء) کے زیادہ مناسب ٹھہرایا ہے۔

فقہ واجتہاد

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو فقہ واجتہاد میں کامل دستگاہ حاصل تھی، بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے فضائل و کمالات کے معترف تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ ملکہ اور خداداد صلاحیت حاصل تھی کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا بھی بآسانی حل ڈھونڈ لیا

کرتے تھے جس کے لئے اعلیٰ ذہانت، عمدہ فطانت اور دقیقہ سنجی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب ''ازالۃ الخفاء'' میں آپ رضی اللہ عنہ کی سرعت فہمی اور دقیقہ سنجی کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں، مثلاً ایک واقعہ یہ نقل کرتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک مجنون بدکار عورت پیش کی گئی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس پر حد زنا جاری کرنے کا ارادہ فرمایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ممکن نہیں کیونکہ مجنون شرعی حدود سے مستثنیٰ ہیں، یہ سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے ارادے سے باز آ گئے'' (مسند احمد ج ا ص ۱۴۰)

ایک دفعہ حج کے دنوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے شکار کا گوشت پکا کر پیش کیا، لوگوں کا اس کے کھانے اور نہ کھانے کے بارے میں اختلاف ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کو کھانا جائز سمجھتے تھے کہ احرام کی حالت میں خود شکار کرنا منع ہے لیکن اگر کوئی دوسرا شخص جو غیر محرم ہو شکار کر لے تو اس کے کھانے میں کیا حرج ہے؟ لوگوں نے اختلاف کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس مسئلہ کا قطعی فیصلہ کس سے معلوم کریں؟ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔ چنانچہ جب ان سے دریافت کیا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''جن لوگوں کو یہ واقعہ یاد ہو وہ شہادت دیں کہ ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ کی خدمت میں جبکہ آپ ﷺ احرام کی حالت میں تھے، ایک گورخر شکار کر کے پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہم تو حالت احرام میں ہیں، لہٰذا یہ ان لوگوں کو کھلا دو جو احرام کی حالت میں نہیں ہیں، یہ سن کر حاضرین میں سے بارہ آدمیوں نے شہادت دی، اسی طرح آپ نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا کہ جس میں کسی شخص نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حالت احرام میں شتر مرغ کے انڈے پیش کیے تھے تو آپ ﷺ کی خدمت میں حالت احرام میں شتر مرغ کے انڈے پیش کیے تھے تو آپ ﷺ نے ان سے بھی اجتناب فرمایا تھا، اس واقعہ کی بھی بعض لوگوں نے شہادت دی، (یہ سن کر) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

اور ان کے رفقاء نے اس کے کھانے سے پرہیز کیا۔ (مسند احمد ج ۱ص ۱۰۰)

ایک مرتبہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ ایک بار پاؤں دھونے کے بعد کتنے دن موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟ فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھو انہیں معلوم ہوگا، کیوں کہ وہ سفر میں رسالت مآب ﷺ کے ساتھ رہتے تھے، چنانچہ وہ شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مقیم ایک دن ایک رات اور مسافر تین دن اور تین رات تک مسح کر سکتا ہے۔

(مسند احمد بن حنبل ج ۱ص ۹۶، ج ۶ص ۵۵)

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی علمی اور اجتہادی شان وعظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مشکل مسائل میں ان کے ہمعصر بھی ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔

مسائل فقہیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وسعت نظر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو مسئلہ آپ کو معلوم نہ ہوتا اس کو براہ راست آنحضرت ﷺ سے دریافت کرایا کرتے تھے، بعض ایسے مسائل جو شرم وحیا یا اور اپنے رشتہ کی نزاکت کی وجہ سے خود نہیں پوچھ سکتے تھے اس کو کسی دوسرے کے واسطہ سے معلوم کرلیا کرتے تھے، چنانچہ مذی کا ناقض وضو ہونا آپ نے اسی طرح دریافت کیا تھا۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے فضل وکمال کی بناء پر بہت سے مسائل میں عام صحابہ رضی اللہ عنہم سے جداگانہ رائے رکھتے تھے، خصوصاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بعض مسائل میں اختلاف تھا، مثلاً حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ حج تمتع کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے عہد مبارک میں محض بے امنی کے باعث جائز تھا، لیکن اب وہ حالات نہیں ہیں اس لیے اب جائز نہیں ہے جب کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر حال میں اسے جائز قرار دیتے۔ تھے، اسی طرح حالت احرام میں نکاح اور حالت عدت میں عورت کی وراثت وغیرہ۔ مسائل میں بھی آراء مختلف تھیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی یوں تو مدینہ منورہ میں گزری لیکن خلافت کا

زمانہ تمام تر کوفہ میں گزرا اور احکامات اور مقدمات کے فیصلے کا زیادہ موقع پیش نہیں آیا، اس لیے آپ کے اجتہادات اور مسائل کی زیادہ تر نشر واشاعت عراق میں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی کے فیصلوں پر ہے۔

حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کے چند فقہی مسائل

(۱)......آپ کا مسلک یہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ قرآن وحدیث میں نہ ملے تو اسے فقہاء کی طرف لوٹانا چاہیے۔

تشاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه رای خاصة.

(رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ موثقون من اہل الصحیح)

جماعت فقہاء سے جو نیک بھی ہوں مشورہ کرلیا کرو اور چند لوگوں کی رائے پر نہ رہا کرو۔

(۲)......آپ کا مسلک تھا کہ دیہات اور چھوٹے گاؤں میں جمعہ کی نماز قائم کرنا درست نہیں ہے، آپ نے فرمایا:

لاجمعة ولا تشريق الافي مصر جامع. (المصنف لعبدالرزاق ج۳ ص ۱۶۷ لابن ابی شیبہ ج ا ص ۴۳۹)

جمعہ اور عید کی نماز شہر کے سوا کہیں نہیں۔

(۳)......آپ رمضان میں بیس رکعت تراویح کے قائل تھے:

دعا القراء في رمضان فامر منهم رجلا ان يصلي بالناس عشرين ركعة (رواہ البیہقی ج ۲ ص ۴۹۵ وراجع لہ اعلاء السنن)

آپ نے رمضان میں قاریوں کو بلایا اور ان میں سے ایک شخص کو کہا کہ انہیں بیس رکعت پڑھائیں۔

امام ترمذی لکھتے ہیں:

واکثر اھل العلم علی ماروی عن علی وعمرو غیرھما من اصحاب النبی عشرین رکعة. (جامع ترمذی ص۹۹)

اور اکثر اہل علم اس پر ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ تراویح بیس رکعت ہیں۔

یہ صرف عراق میں نہ تھا اہل مکہ بھی بیس رکعت تراویح ہی کے قائل تھے، حضرت امام شافعی لکھتے ہیں:

وھکذا ادرکت ببلدنا مکة یصلون عشرین رکعة. (ایضاً)

اور میں نے اسی طرح اپنے شہر مکہ میں لوگوں کو بیس رکعت پڑھتے پایا ہے۔

ان علیاً امر رجلاً یصلی بھم فی رمضان عشرین رکعة. (المصنف لابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۲۴۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھائے۔

(۴)......نماز میں آپ ہاتھ ناف کے نیچے باندھتے تھے سینہ پر نہیں، آپ نے فرمایا:

قال علی رضی اللّٰہ عنه السنة وضع الکف علی الکف فی الصلوٰة تحت السرة. (سنن ابی داؤد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے سنت یہی ہے کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ پر ہاتھ رکھیں۔

یعنی نماز میں بازو نہ باندھے جائیں ہاتھ باندھے جائیں سینے پر کھیاں باندھنا ہاتھ باندھنا نہیں سمجھا جاتا۔

عن علی رضی اللّٰہ عنه قال من سنة الصلوٰة وضع الایدی علی الایدی تحت السرر (المصنف ج ۱ ص ۲۴۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے نماز میں سنت یہ ہے کہ ہاتھ ناف کے نیچے ایک دوسرے پر رکھے جائیں۔

فقیہ کے اوصاف

حضرت علی رضی اللہ عنہ محراب کے پاس بیٹھے تھے، آپ رضی اللہ عنہ کی زبان سے کلمات تشکر وتضرع جاری تھے، لوگ آپ رضی اللہ عنہ کے اردگرد حلقہ بنائے آپ رضی اللہ عنہ سے علمی استفادہ کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا امیر المومنین! آپ رضی اللہ عنہ ہمیں فقیہ (عالم) کے اوصاف سے آگاہ کیجئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ دو زانو ہو کر بیٹھے اور فرمایا کہ کیا میں تم کو حقیقی فقیہ سے آگاہ کر دوں؟ (حقیقی فقیہ) وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے نا امید نہ کرے، ان کو ان امور کی اجازت نہ دے جو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کا ذریعہ بنتے ہیں، اور ان کو اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف نہ کرے اور قرآن کو بے رغبتی ظاہر کرتے ہوئے نہ چھوڑے ایسی عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں فقاہت نہ ہو اور اس فقہ میں کوئی بھلائی نہیں جس پر پرہیز گاری نہ ہو اور اس تلاوت میں کوئی خیر و بھلائی نہیں جس میں تدبر نہ ہو۔ (حلیۃ الاولیاء ج ا ص ۷۷)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امتیازی شان

ایک دن حضور ﷺ نے مسجد سے چند لوگوں کو نکالا اور فرمایا کہ میری اس مسجد میں آرام نہ کرو (یعنی نہ سوؤ) چنانچہ لوگ مسجد سے نکل گئے اور ان کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی نکل گئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم واپس آجاؤ''۔ میں تیرے لیے اسی چیز کو حلال کرتا ہوں جو میں اپنے لیے حلال کرتا ہوں۔''

(حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سو (۱۰۰) قصے، ص۹۱)

فیصلے

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عام طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلوں کو تسلیم کرتے

تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ''اقضانا علی و اقرأنا ابی'' یعنی ہم میں مقدمات کے فیصلے کے لیے سب سے موزوں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور سب سے بڑے قاری حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں'' (طبقات ابن سعد ج۲ ص۱۰۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم کہا کرتے تھے کہ اہل مدینہ میں سب سے زیادہ صحیح فیصلہ کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں''۔

(مستدرک حاکم ج۳ ص۱۳۵)

رسول پاک ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''اقضاهم علی'' کا سرٹیفکیٹ عطا کر دیا تھا اور آنحضور ﷺ بوقت ضرورت قضاء کی ذمہ داری ان کے سپرد فرماتے تھے، چنانچہ جب اہل یمن نے اسلام قبول کیا تو آپ ﷺ نے وہاں کے منصب قضاء کے لیے آپ ہی کو منتخب فرمایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! وہاں نت نئے مقدمات پیش آئیں گے اور مجھے قضاء کا تجربہ اور علم نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ تمہاری زبان کو راہ راست اور تمہارے دل کو استقلال بخشے گا'' حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مقدمات کے فیصلہ میں کسی قسم کا تردد پیش نہ آیا''۔ (مسند احمد ج۱ ص۸۳، مستدرک حاکم ج۳ ص۱۳۵)

حضور اکرم ﷺ نے آپ رضی اللہ عنہ کو قضاء کے چند اصول بھی تعلیم فرمائے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ فرمایا ''علی رضی اللہ عنہ! جب تم دو آدمیوں میں فیصلہ کرنے لگو تو صرف ایک آدمی کا بیان سن کر فیصلہ نہ کرو، اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک دوسرے کا بیان بھی سماعت نہ کرلو''۔ (مسند احمد ج۱ ص۹۶، ۱۴۳)

مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے گواہوں سے جرح وقدح اور ان سے سوال و جواب کرنا بھی آپ کے اصول قضاء میں شامل تھا، چنانچہ ایک مرتبہ ایک عورت نے آپ کی روبرو اپنے متعلق زنا کا اقرار کیا، آپ نے اس سے مسلسل سوالات پر سوالات کیے جب وہ عورت آخر تک اپنے بیان پر قائم رہی تو پھر سزا جاری کرنے کا حکم دیا۔ (ایضاً ص۱۴۰)

ایک دفعہ ایک شخص چوری کے الزام میں گرفتار ہوا اور آپ کی عدالت میں پیش

کیا گیا اور دو گواہوں نے اس کے خلاف گواہی بھی دے دی، آپ نے گواہوں کو دھمکی دی کہ اگر تمہاری گواہی جھوٹی نکلی تو میں تمہیں سخت سزا دوں گا اور تمہارے ساتھ انتہائی سخت سلوک کروں گا، اس کے بعد وہ کسی اور کام میں مصروف ہو گئے، جب اس سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ دونوں گواہ موقع پا کر فرار ہو گئے، آپ نے ملزم کو بے گناہ قرار دے کر رہا کر دیا۔ (تاریخ الخلفاء، بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ)

یمن میں آپ نے دو عجیب و غریب مقدمات کا فیصلہ کیا، یمن کے لوگ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، پرانی باتیں ابھی تازہ تھیں، ایک عورت کا مقدمہ پیش ہوا جس کے ساتھ ایک مہینے کے اندر تین مرد خلوت کر چکے تھے، نو ماہ بعد اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، اب نزاع یہ ہوا کہ وہ لڑکا کس کا قرار دیا جائے؟ ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ وہ اس کا لڑکا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے اس لڑکے کی دیت کے تین حصے کیے، پھر قرعہ اندازی کی، جس کے نام قرعہ نکلا اس کے سپرد کیا اور بقیہ دونوں کو دیت کے تین حصوں میں سے دو حصے اس سے لے کر دلوائے، گویا کہ غلام کے مسئلہ پر قیاس فرمایا، جب آنحضرت ﷺ کو آپ کے فیصلہ کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے تبسم فرمایا۔

(مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۳۵)

وہاں دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ چند لوگوں نے شیر پھنسانے کے لیے ایک کنواں کھودا تھا، شیر اس میں گر گیا، چند اشخاص ہنسی مذاق میں ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے، اچانک ایک کا پاؤں پھسلا اور وہ اس کنوئیں میں جا گرا، اس نے اپنی جان بچانے کی خاطر بدحواسی میں دوسرے کی کمر پکڑ لی، وہ بھی سنبھل نہ سکا اور گرتے گرتے اس نے تیسرے آدمی کی کمر تھام لی، تیسرے نے چوتھے کو پکڑ لیا، غرض چاروں اس کنویں میں گر گئے، اور شیر نے ان چاروں کو مار ڈالا، مقتولین کے ورثاء آپس میں لڑنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو منع کیا اور فرمایا کہ ایک رسول کی موجودگی میں یہ ہنگامہ اور فساد مناسب نہیں ہے، میں تمہارا فیصلہ کرتا ہوں، اگر میرا فیصلہ پسند نہ آئے تو دربارِ رسالت میں اپنا مقدمہ پیش کر کے فیصلہ لے سکتے ہو۔ لوگوں نے رضا

مندی کا اظہار کیا، آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ جن لوگوں نے یہ کنواں کھودا ان کی قوم و قبیلے سے ان مقتولین کی دیت کی رقم اس طرح وصول کی جائے کہ ایک پوری، ایک ایک تہائی، ایک ایک چوتھائی اور ایک آدھی پہلے مقتول کے ورثاء کو ایک چوتھائی دیت، دوسرے کے ورثاء کو ثلث، تیسرے کو نصف اور چوتھے کو پوری دیت دلائی۔ لیکن لوگ اس عجیب وغریب فیصلہ سے راضی نہ ہوئے اور حجۃ الوداع کے موقع پر حاضر ہو کر عدالت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مرافعہ پیش کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کیئے ہوئے فیصلہ کو برقرار رکھا۔ (مسند احمد ج ۱ص ۷۷)

اب ذرا غور کیجئے کہ اصل جرم ان لوگوں کا تھا جنہوں نے آبادی کے قریب شیر پھنسانے کے لیے کنواں کھودا تھا، اس لیے کوئی متعین قاتل نہ ہونے کی وجہ سے قسامت کے اصول سے دیت کو کنواں کھودنے والوں اور ان کے قوم وقبیلوں پر عائد کیا، پہلا شخص اگرچہ اتفاقاً گرا، مگر ایک دوسرے کے دھکیلنے کے نتیجہ کو بھی اس میں خاصا دخل تھا، اس سے پہلے شخص کے گرنے میں اتفاق کا عنصر زیادہ اور قصد کا بہت کم دخل تھا، اس لیے وہ دیت کا کم سے کم مستحق ہوا یعنی ایک چوتھائی، پہلے نے دوسرے کو گویا بالقصد کھینچا مگر انتہائی بدحواسی کے عالم میں اس کو اپنے فعل کے انجام کے بارے سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا اس لیے پہلے کے مقابلہ میں اس میں اتفاق کا دخل کم اور قصد کا کچھ زیادہ تھا اس لیے وہ تہائی کا مستحق قرار پایا، دوسرے مقتول کو پہلے نتائج کو دیکھ کر اپنے فعل کے نتیجے کو سوچنے سمجھنے کا موقع زیادہ ملا اس لیے اس میں اتفاق کے مقابلہ میں قصد کا عنصر زیادہ تھا اس لیے اس کو نصف کا مستحق سمجھا گیا۔ تیسرے نے چوتھے کو کھینچا حالاں کہ وہ سب سے دور تھا اور گزشتہ نتائج کو تیسرے نے خوب غور سے دیکھ بھی لیا تھا اس لیے وہ تمام تر قصد اور ارادہ سے گرایا گیا نیز اس نے دوسروں کی طرح اور کے گرانے کا جرم بھی نہیں کیا اس لیے وہ پوری دیت (خون بہا) کا مستحق تھا۔ (واللہ اعلم)

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک اور مقدمہ کا بڑا دلچسپ فیصلہ فرمایا، دو آدمی تھے، ایک کے پاس تین روٹیاں تھیں اور دوسرے کے پاس پانچ روٹیاں تھیں

دونوں مل کر ایک جگہ کھانے کو بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک تیسرا شخص بھی آ گیا وہ بھی ان کے کہنے پر کھانے میں شریک ہو گیا جب کھانے سے فارغ ہوئے تو (تیسرے آدمی) نے آٹھ درہم اپنے حصے کی روٹیوں کی قیمت دے دی اور چلا گیا۔ جس شخص کی پانچ روٹیاں تھیں اس نے سیدھا سادا حساب یہ کیا کہ اپنی پانچ روٹیوں کی قیمت پانچ درہم لے لیے اور دوسرے کو ان کی تین روٹیوں کی قیمت تین درہم دینے چاہے تو وہ اس پر راضی نہ ہوا اور نصف کا مطالبہ کیا، یہ مقدمہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی عدالت میں پیش ہوا تو آپ نے دوسرے شخص کو نصیحت فرمائی کہ تمہارا رفیق جو فیصلہ کر رہا ہے اسے تسلیم کر لو اسی میں تمہارا فائدہ ہے لیکن اس نے کہا کہ حق کے ساتھ جو فیصلہ ہوگا وہ مجھے منظور ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ حق تو یہ ہے کہ تمہیں صرف ایک درہم ملنا چاہیے اور تمہارے رفیق کو سات درہم ملنے چاہئیں اس عجیب وغریب فیصلے سے وہ حیران وسرگردان ہو گیا آپ نے فرمایا کہ دیکھو! تم تین آدمی تھے، تمہاری تین روٹیاں تھیں اور تمہارے رفیق کی پانچ روٹیاں تھیں تم دونوں نے برابر کھائیں اور ایک تیسرے شخص کو بھی برابر کا حصہ دیا تمہاری تین روٹیوں کے حصے تین جگہ کیے جائیں تو نو ٹکڑے ہوتے ہیں، تم اگر اپنے نو ٹکڑوں اور اس کے پندرہ ٹکڑوں کو جمع کرو تو چوبیس ٹکڑے بنتے ہیں تینوں میں سے ہر ایک نے برابر ٹکڑے کھائے تو اس حساب سے فی کس آٹھ ٹکڑے ہوتے ہیں تم نے اپنے نو میں سے آٹھ خود کھائے اور ایک اس تیسرے شخص کو دیا اور تمہارے رفیق نے اپنے پندرہ ٹکڑوں میں سے آٹھ خود کھائے اور سات تیسرے کو دیئے اس لیے آٹھ درہم میں سے ایک تم اور سات کے تمہارے رفیق حقدار ہیں۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی)

ایک شخص نے دوسرے کو عدالت مرتضوی میں یہ کہہ کر پیش کیا اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ اس نے میری والدہ کی آبروریزی کی ہے، آپ نے فرمایا کہ ملزم کو دھوپ میں لے جا کر کھڑا کر دیا جائے اور اس کے سایہ کو سو کوڑے لگائے جائیں۔

(ایضا بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے قانونی نظائر کا درجہ رکھتے تھے، اس لیے علماء نے

ان کو تحریری شکل میں مدون کر لیا تھا مگر اس زمانہ میں اختلاف آراء کا عمل شروع ہو چکا تھا ، اس لیے ان میں ردوبدل بھی ہونے لگا، چنانچہ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے آپ کے فیصلوں کا تحریری مجموعہ پیش کیا گیا تو اس حصہ کو انہوں نے بے اصل قرار دیا اور فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عقل وہوش کی سلامتی کے ساتھ کبھی بھی ایسے فیصلے نہیں کر سکتے تھے۔ (مقدمہ صحیح مسلم)

علم اسرار شریعت

اہل حکمت کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ وہ ہے جو اپنی عقل وفہم اور علم ودانش کی بناء پر ہر حکم شرعی کی جزوی مصلحتوں اور حکمتوں پر نگاہ رکھتا ہے اور ہمہ وقت اس کے اسرار وحکم کی جستجو اور تلاش میں رہتا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو ہر حکم شرعی کے جزوی مصلحتوں اور حکمتوں سے دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ وہ کلی طور پر تمام احکام شریعت پر ایک مبصرانہ نگاہ ڈال کر ایک کلی اصول طے کر لیتا ہے اور اللہ پاک نے ان احکام میں جو جزوی مصلحتیں اور حکمتیں رکھی ہیں، یہ گروہ ان کی تلاش کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علمی مذاق پہلی قسم کا اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کا فکری ذوق دوسری کا معلوم ہوتا ہے ان کی نگاہ احکام کی نظری کیفیت پر اتنی نہیں پڑتی جتنی ان کی علمی کیفیت پر پڑتی ہے۔ اسی لیے شریعت کے کسی حکم کا انسانی عقل کے خلاف ہونا ان کی نظر میں اتنا اہم نہیں ہے کیونکہ انسان کی عقل خود ناقص ہے وہ کسی حکم شرعی کے لیے صحت اور درستگی کا معیار نہیں بن سکتی۔

تعلیقات بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ''لوگوں سے وہی بات کہو جو وہ سمجھ سکتے ہوں، کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی جائے''۔ (کتاب العلم)

مقصد یہ ہے کہ اگر لوگوں سے ان کی عقل وفہم سے اونچی باتیں کی جائیں تو لازماً وہ اپنی کم عقلی کی بناء پر ان باتوں کو غلط سمجھیں گے اور اس طرح وہ نادرستگی میں خدا اور رسول ﷺ کی تکذیب کے مرتکب ہوں گے۔ اس لیے لوگوں سے ان کی عقل

وفہم کے مطابق گفتگو کرنی چاہئے کہ ہر مصلحت ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

روایات کے الفاظ اگر مختلف معانی کا احتمال رکھتے ہوں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ ہے کہ ان میں سے وہی معنی صحیح ہوں گے جو نبوت و رسالت کی شان کے موافق ہوں۔ مسند احمد بن حنبل کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ کے اصل الفاظ یہ ہیں ”جب کوئی شخص تم سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرتے تو اس کے معنی وہ سمجھو جو زیادہ ہدایت والے زیادہ پرہیزگارانہ اور زیادہ عمدہ ہوں“ (مسند احمد، ص ۱۳۰)

موزوں پر مسح کرنا سنت رسول ﷺ ہے لیکن یہ مسح تلووں کے بجائے پاؤں کے اوپر کیا جاتا ہے اس کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے ”اگر دین کا دارومدار محض رائے پر ہوتا تو پاؤں کے تلوے اوپر پاؤں کی بہ نسبت مسح کے زیادہ مستحق تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں کی پشت پر مسح کیا ہے“۔

(سنن ابی داؤد، باب کیف المسح)

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ ہے کہ چلنے کی وجہ سے اگر گرد وغبار کے دور کرنے کی غرض سے مسح ہوتا تو پاؤں کے تلوؤں پر مسح ہوتا لیکن آنحضرت ﷺ نے تلوؤں پر مسح نہیں کیا بلکہ پاؤں کے اوپر والے حصے پر کیا۔ معلوم ہوا کہ شرعی احکام کے مصالح وحکم کی تعیین میں انسان کی عقل ورائے کو دخل نہیں ہے۔

یہی روایت مسند احمد میں اس طرح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں رسول اللہ ﷺ کو مسح کرتے ہوئے نہ دیکھتا تو سمجھتا کہ پاؤں کے نیچے مسح کرنا اس کے اوپر مسح کرنے سے زیادہ بہتر ہے“ یعنی قیاس کا بظاہر تقاضا یہی تھا مگر حکم شرعی محض ظاہری قیاس پر مبنی نہیں ہے۔

علم تصوف

تصوف جو دین ومذہب کی روح اور جان اور خواص امت کا حصہ ہے، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کے حقائق ومعارف نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ تصوف کے اکثر سلسلے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جا کر منتہی ہوتے ہیں، حضرت جنید

بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ اصول اور امتحان و آزمائش میں ہمارے شیخ الشیوخ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ ہیں''۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ خلافت سے قبل حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس میں بے حد انہماک تھا، لیکن خلیفہ بننے کے بعد مصروفیات کے پیش آنے کی وجہ سے اس فن کی تفصیل بیان نہ کر سکے۔ (ازالۃ الخلفاء ص ۲۷۴)

محدثین کرام کے اصول وضوابط کے مطابق حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے یہ صوفیانہ اقوال پایۂ صحت کو نہیں پہنچتے اور نہ ہی سلسلۂ صحبت کی کڑیاں ثابت ہوتی ہیں، اس لیے کہ اکثر سلسلے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ پر جا کر تمام ہو جاتے ہیں ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیض یافتہ اور صحبت یافتہ سمجھا جاتا ہے مگر محدثین کی روایات سے ان کی تعلیم اور صحبت ثابت نہیں ہوتی بلکہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس بات سے بھی انکار کیا ہے کہ انہوں نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بلاواسطہ کچھ سنا ہے، بہر حال اتنی بات بالاتفاق ثابت ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے خلافت سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں دیکھا تھا اور ان کے دیدار سے مشرف ہوئے تھے اور اس وقت ان کی عمر غالباً چودہ یا پندرہ سال کی تھی۔

واقعۂ شہادت

واقعہ نہروان کے بعد چند خارجیوں نے حج کے موقع پر مجتمع ہو کر حالات حاضرہ پر گفتگو شروع کی اور بالآخر یہ بات طے ہوئی کہ جب تک حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، صفحۂ ہستی پر موجود ہیں، مسلمانوں کو خانہ جنگیوں سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی چنانچہ تین آدمی ان تینوں کے قتل کرنے کے لیے تیار ہوئے، عبدالرحمٰن بن ملجم نے کہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا میرے ذمہ ہے، اس طرح نزال نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اور عبداللہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور تینوں اپنی اپنی مہم پر روانہ ہو گئے، کوفہ پہنچ کر ابن ملجم کے ارادے کو قطام نامی ایک خوبرو عورت نے اور زیادہ تقویب دی

اس نے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس مہم میں کامیاب ہو گیا تو وہ اس سے شادی کرے گی اور اس نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خون کو مہر قرار دیا، غرض رمضان المبارک ۴۰ھ میں تینوں نے ایک ہی دن صبح کے وقت تینوں بزرگوں پر حملہ کیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ تو بچ گئے لیکن حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا پیمانہ حیات لبریز ہو چکا تھا، آپ رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے اور ابن ملجم کو جو مسجد میں سو رہا تھا جگایا، جب آپ نے نماز شروع کی اور سر مبارک سجدہ میں اور دل راز و نیاز میں مشغول تھا کہ اسی حالت میں شقی القلب ابن ملجم نے تلوار کا نہایت کاری وار کر دیا سر پر زخم آیا اور ابن ملجم کو لوگوں نے گرفتار کر لیا۔ (تاریخ طبری ص ۲۴۵۸،۲۴۷)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اتنے شدید زخمی ہوئے کہ جانبر ہونے کی کوئی امید نہ تھی، اس لیے اپنے صاحبزادوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا کر نہایت کار آمد نصائح فرمائے اور محمد بن الحنفیہ کے ساتھ لطف و مہربانی کی تاکید کی حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا امیر المومنین! آپ کے بعد ہم لوگ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کریں؟ فرمایا کہ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، تم لوگ خود اس امر کو طے کر لینا، اس کے بعد مختلف وصیتیں فرمائیں اور قاتل کے متعلق فرمایا کہ اس سے معمولی طور پر قصاص لینا۔ (تاریخ طبری ص ۲۴۶۱)

تلوار زہر آلود تھی، اس لیے اس کا اثر نہایت تیزی کے ساتھ سارے جسم مبارک میں سرایت کر گیا اور ۲۰، رمضان المبارک ۴۰ھ جمعہ کی رات کو یہ علم و عرفان کا آفتاب غروب ہو گیا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے خود اپنے ہاتھ سے آپ رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین فرمائی اور نماز جنازہ بھی خود ہی پڑھائی اور عزی، نام کوفہ کے ایک قبرستان میں سپرد خاک کیا۔

ازواج واولاد

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے بعد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں اور ان سے کثرت کے ساتھ اولادیں ہوئیں،

تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ محسن رضی اللہ عنہ اور زینب کبری رضی اللہ عنہا اور ام کلثوم کبری رضی اللہ عنہ پیدا ہوئیں، محسن رضی اللہ عنہ کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔

۲۔ ام البنین بنت حزام ان سے عباس، جعفر، عبداللہ اور عثمان پیدا ہوئے، عباس کے علاوہ تمام اولاد میدان کربلا میں شہید ہوئی۔

۳۔ لیلیٰ بنت مسعود۔ ان کے ہاں عبیداللہ اور ابوبکر پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق یہ دونوں بیٹے بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شہید ہوئے۔

۴۔ اسماء بنت عمیس۔ ان سے یحییٰ اور محمد اصغر پیدا ہوئے۔

۵۔ صہبا یا ام حبیب ربیعہ۔ یہ ام ولد تھیں، ان سے عمر اور رقیہ پیدا ہوئیں۔ عمر نے نہایت طویل عمر پائی اور تقریباً پچاس سال کی عمر میں مقام ینبوع میں انتقال ہوا۔

۶۔ امامہ بنت ابی العاص۔ یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہیں ان سے محمد اوسط پیدا ہوئے۔

۷۔ خولہ بنت جعفر ان سے محمد بن علی جو محمد بن الحنفیہ کے نام سے مشہور ہیں پیدا ہوئے۔

۸۔ ام سعید بنت عروہ۔ ان سے ام الحسن اور رملہ کبریٰ پیدا ہوئیں۔

۹۔ محیاۃ بن امرؤ القیس۔ ان سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جو بچپن ہی میں فوت ہو گئی۔

ان ازواج کے علاوہ بہت سی باندیاں بھی تھیں جن سے حسب ذیل لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ام ہانی، میمونہ، زینب صغری، رملہ صغریٰ، ام کلثوم صغریٰ، فاطمہ، امامہ، خدیجہ ام الکرام، ام جعفر، جمانہ، نفیسہ۔

غرض حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے چودہ لڑکے اور سترہ لڑکیاں تھیں۔

جن سے سلسلہ نسل جاری ہوا ان کے نام یہ ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، محمد بن الحنفیہ رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود الہذلی رضی اللہ عنہ

آپ کی دو کنیتیں ہیں، ۱، ابوعبدالرحمٰن ۲، ابن ام عبد، سابقین اولین میں سے ہیں۔ جنگ بدر میں شریک ہوئے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ آپ کا شمار ہدایت کے امام اور علم کا خزانہ رکھنے والے چوٹی کے صحابہ میں ہوتا ہے۔ (تذکرہ)

طبیعت میں انتہائی انکسار تھا، یہی وجہ ہے کہ کبر و غرور کا سب سے بڑا دیوا ابوجہل آپ کے ہاتھوں سے مارا گیا ایک رات آنحضرت ﷺ نے انہیں دعا کرتے ہوئے سُنا تو فرمایا عبداللہ اللہ تعالیٰ سے جو مانگو گے مل جائے گا۔

اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو اس ارشاد نبوی ﷺ کی بشارت دی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:۔

من احب ان یقرا القرآن غضا کما انزل فلیقرا علی قرأۃ ابن ام عبد (سنن ابن ماجہ ص ۱۴)

جو شخص قرآن کریم کو اسی طرح تازہ بتازہ پڑھنا چاہے جیسا کہ وہ اُترا ہے تو وہ ام عبد کی قرأت پر پڑھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب عراق میں کوفہ کی چھاؤنی قائم کی اور وہاں نہایت اونچے درجہ کے لوگوں کو جو عرب کا دماغ سمجھے جاتے تھے آباد کیا تو آپ نے اہل کوفہ کے نام ایک خط میں لکھا:

تم عرب کا دماغ اور ان کے سر کی چوٹی ہو...... میں تمہارے پاس عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو معلم بنا کر بھیج رہا ہوں، بخدا میں نے عبداللہ کو تمہارے پاس بھیج کر تمہیں اپنے اُوپر ترجیح دی ہے (ورنہ میں انہیں اپنے پاس رکھتا)۔ (رواہ الحاکم فی المستدرک)

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اس طرح نقل کیا ہے:

میں نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو تم پر گورنر اور عبداللہ بن مسعود

رضی اللہ عنہ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے یہ دونوں آنحضرت ﷺ کے جلیل القدر صحابی ہیں ان سے علم سیکھو ان کی اقتداء کرو اور میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھیج کر تمہیں اپنے آپ پر ترجیح دی ہے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۳۶)

حافظ ذہبی لکھتے ہیں آپ حدیث بیان کرنے میں بے حد محتاط اور روایت کے سلسلہ میں کڑی شرائط رکھتے تھے جب قال رسول اللہ ﷺ کہہ کر حدیث شروع کرتے تو آپ پر لرزہ طاری ہو جاتا آپ نے قرآن پاک خود آنحضرت ﷺ سے پڑھا اور یہ وہ شرف ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی کسی کسی کو نصیب رہا آپ کے تلامذہ علم و فضل میں کسی دوسرے صحابی کو آپ پر فضیلت نہ دیتے تھے آپ چونکہ خود حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی برتری کے قائل تھے اس لیے قرآن وسنت کے بعد ان لوگوں کی پیروی کو بھی اپنے لیے حق کی راہ جانتے تھے۔ آپ کہتے اگر کوئی مسئلہ کتاب وسنت میں نہ ملے تو پھر نیک لوگوں کی پیروی کی جائے۔

آپ فرماتے ہیں:

فلیقض بما قضیٰ به الصالحون (سنن نسائی ج ۲ ص ۳۰۵)

اس صورت میں پہلے صالحین کا فیصلہ اختیار کرنا چاہیے۔

معلوم ہوا کہ اس دور میں بھی صالحین کی پیروی کوئی عیب نہ سمجھی جاتی تھی، عراق کی دینی مسند آپ سے آباد ہوئی مگر آنحضرت ﷺ سے تعلق اتنا گہرا تھا کہ وفات سے کچھ دن پہلے مدینہ منورہ آ گئے اور وہیں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے کس قدر مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں آخری آرامگاہ کے طور پر مدینہ منورہ کی پاک مٹی نصیب ہوئی۔

دے کہاں یہ رتبہ مشت خاک قاسم کا
کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے بن کے غبار

آنحضرت ﷺ سے قرب وربط

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ جنہیں حضور ﷺ نے یمن کا گورنر بنا کر

بھیجا جب وہ اور ان کے بھائی یمن سے واپس آئے تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ کے پاس اس قدر آتے جاتے دیکھا گویا آپ ان کے گھر کے فرد ہوں آنحضرت ﷺ سے اس قدر قرب و ربط کس کو نصیب ہوتا ہے یہ دونوں حضرات اس پر حیران تھے۔ یہ خدا کی دین ہے وہ جسے چاہے دے۔

عن ابی اسحق حدثنی الا سود بن یزید قال سمعت ابا موسی الا شعری رضی اللّٰہ عنہ یقول قدمت انا واخی من الیمن فمکثنا حینا مانری لا عبد اللّٰہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رجل من اھل بیت البنی ﷺ لمانری من خولہ ودخول امہ علی النبی ﷺ

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۳۱، صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۲، جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۲۲)

ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں اور میرا بھائی جب یمن سے آئے اور مدینہ میں کچھ عرصہ ٹھہرے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو آنحضرت ﷺ کے اہل بیت میں سے ہیں کیونکہ آپ اور آپ کی والدہ کا حضور ﷺ کے ہاں اس قدر آنا جانا تھا۔

صاحب سر رسول حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ (۳۵ھ) سے پوچھا گیا حضور ﷺ کا سب سے قریبی کون ہے؟ کہ ہم اس سے علم سیکھیں۔ آپ نے فرمایا:

ما اعلم احدا اقرب سمتا و ھدیا و دلا بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم من ابن ام عبد. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۳۱)

میں کسی کو نہیں جانتا جو حضور اکرم ﷺ سے سیرت میں عادت میں اور چال میں عبداللہ بن مسعودؓ سے زیادہ قریب ہو۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ پہنچے تو انہوں نے آپ سے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ انہوں نے کہا کوفہ سے اس پر آپ نے

فرمایا کہ کیا تمہارے پاس ابن مسعود رضی اللہ عنہ نہیں ہیں جو حضور ﷺ کے اتنا قریب رہے کہ شاید ہی یہ قرب اور کسی کو ملا ہو آپ نے کہا:

افلم یکن فیکم صاحب النعلین والو سادة والمطهرة (ایضاً)

کیا تمہارے ہاں وہ صاحب نہیں ہیں جو حضور ﷺ کے ساتھ ساتھ آپ کا جوتا اُٹھائے پھرتے تھے آپ کا تکیہ اٹھایا ہوا تھا اور وہ آپ کا لوٹا اُٹھانے والے تھے۔

حضور ﷺ کے ہاں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا علمی مرتبہ

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا:

استقرؤ االقرآن من اربعة من عبدالله بن مسعود رضی الله عنه فبدأ به و سالم مولیٰ ابی حذیفه رضی الله عنه و ابی بن کعب رضی الله عنه، ومعاذ بن جبل رضی الله عنه (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۳۱، صحیح مسلم ج ۲ ص ۵۹۱، مشکوٰۃ ص ۵۷۴)

چار آدمیوں سے قرآن پڑھو اور آپ نے سب سے پہلے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔

اللہ کے ہاں حضرت اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مقام

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ (۳۵ھ) اس حقیقت صادقہ پر بھی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع نقل کرتے ہیں:

ولقد علم المحفظون من اصحاب النبی ﷺ ان ابن ام عبد هو من اقربهم الی الله زلفیٰ (جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۲۲)

آنحضرت ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں جو علم کے حفاظ ہوئے ان سب نے جانا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اللہ کے ہاں سب سے زیادہ قرب پانے والوں میں

سے تھے۔

یہ صرف حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی شہادت نہیں جملہ اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اللہ کے قرب میں گویا سبقت لے جاچکے ہیں جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ کہا تو ابوموسےٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے کہا:۔

اما لئن قلت ذاک لقد کان یشهد اذا غبنا ویوذن له اذا حجبنا. (صحیح مسلم ج۲ص۲۹۳)

آپ نے جب ایسا کہہ ہی دیا ہے تو اس کی وجہ بھی جان لیں۔آپ اس وقت بھی حضور ﷺ کے پاس ہوتے تھے جب ہم آپ سے دور ہوتے اور آپ کو حضور ﷺ کے پاس اس وقت بھی آنے کی اجازت ہوتی جب ہم ماذون نہ ہوتے تھے۔

اس میں حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ یہ جتلانا چاہتے ہیں کہ اس میں ہماری کوئی کوتاہی نہیں۔حضور ﷺ نے خود انہیں (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو) اپنے پاس حاضری کا اُذن عام دے رکھا تھا اور وہ قربِ نبوی ﷺ اور قرب الٰہی کی یہ دولت لوٹتے رہے اور ہم دیکھتے رہ گئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی فرماتے ہیں:

والذی لا اله غیره مامن کتاب الله سورة الا انا اعلم حیث انزلت ومامن اٰية الا انا اعلم فیما انزلت ولو اعلم احدا هو اعلم بکتاب الله منی تبلغه الابل لرکبت الیه. (صحیح مسلم ج۲ص۲۹۳)

قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں قرآن کی کوئی سورت نہ اتری مگر یہ کہ میں جانتا ہوں کہاں اتری اور کوئی آیت نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ کس مسئلے میں اتری اور اگر

آج بھی مجھے پتہ ملے کہ کوئی ایسا شخص بھی ہے جو کتاب اللہ کو مجھ سے زیادہ جانتا ہے اس کے پاس اُونٹ جا سکتے ہیں تو میں وہاں بھی رخت سفر باندھ کر جاؤں گا۔ یہ اس لیے کہ وہ خوشہ علم بھی مجھ سے دور نہ ہو میں جا کر اسے بھی اس سے پالوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شان قیادت

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا:

لو کنت مومرا احدا من غیر مشورۃ لامرت ابن ام عبد. (جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۲۲، مشکوٰۃ ص ۵۷۸، سنن ابن ماجہ)

اگر میں کسی کو بغیر مشورہ دیگر اصحاب کے امیر مقرر کرتا تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کرتا۔

اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سمجھانا چاہتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں انتظام امت کی پوری شان ہے۔ آپ امت میں خلافت کی پوری ذمہ داریاں ادا کر سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ فقہاء میں انتظام کی پوری شان ہوتی ہے۔

آپ کی انتظامی صلاحیتوں کی ایک اور بھی شہادت ملتی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو جہاں کوفہ میں معلم بنا کر بھیجا وہاں وزارت کی کچھ ذمہ داریاں بھی آپ کے سپرد کیں۔ اس سے پتہ چلا کہ جہاں آپ فقہ وحدیث کے صدر معلم تھے وہاں آپ اس لائق تھے کہ سلطنت کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

آپ کے چند فقہی مسائل

صحابہ رضی اللہ عنہم میں کئی علمی اختلافات پیدا ہوئے یہ فرقہ بندی کے اختلافات نہ تھے۔ شریعت محمدیہ (ﷺ) کی وسعت عمل کے مختلف پیرائے تھے ان سب میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شخصیت سب سے نمایاں رہی۔ آپ کے اجتہادی مسائل پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہاں ہم ضمنی طور پر ان کی فقہ کے چند مسائل کا

تعارف کرار ہے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہی علمی جانشین ہوئے اور آپ کی فقہ زیادہ تر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہی مکتب فکر ہے جس طرح ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سرفہرست ہیں۔ فقہاء صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سرتاج ہیں۔

تاہم چند مسائل ہم بطور نمونہ پیش کرر ہے ہیں۔

(۱)...... جب کتاب وسنت میں کھلے طور پر کوئی مسئلہ نہ ملے تو آپ اجتہاد کے قائل تھے اور فقہ کی ضرورت محسوس کرتے تھے لیکن اجتہاد سے پہلے آپ اکابر امت کی پیروی کو ضروری سمجھتے تھے جو آپ کی نظر میں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما تھے۔ آپ نے قیاس واستنباط کو چوتھے درجے میں رکھا ہے۔ (سنن نسائی ج ۲ص ۳۰۵)

(۲)......آپ ابتداء نماز کے سوا کہیں رفع یدین کے قائل نہ تھے، آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایک دفعہ کہا کیا میں تمہیں ایک ایسی نماز نہ پڑھاؤں جس طرح حضور ﷺ پڑھایا کرتے تھے؟ آپ نے پھر نماز پڑھائی اور ابتداء نماز کے بعد کہیں رفع یدین نہ کی۔ (سنن نسائی ج ۱ص ۱۵۸)

(۳)......آپ جمعہ کی نماز سے پہلے چار رکعت (سنت) پڑھتے تھے۔ (المصنف ج ۱)

(۴)......آپ فاتحہ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ آپ کا مسلک یہ تھا کہ امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہے۔ قرآن کا کوئی حصہ سورۃ فاتحہ ہو یا مازاد علی الفاتحہ آپ اسے امام کے پیچھے پڑھنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ (المغنی لابن قدامہ ج ۱ص ۵۶۸، طحاوی ج ۱)

(۵)......آپ کے ہاں وتر کی نماز مغرب کی نماز کی صورت میں ہے کہ تین رکعات ہوں، دو کے بعد التحیات کے لیے بیٹھے اور ایک سلام سے تین رکعات وتر پڑھے۔ سوائے اس کے کہ وتر کی تیسری رکعت میں سورت بھی ملائی جاتی ہے، دونوں نمازوں میں اور کوئی فرق نہیں۔

آپ نے فرمایا:

الوتر ثلث کوتر النهار صلوٰة المغرب (طحاوی شریف ج ا ص ۱۴۳)
وتر تین ہیں جیسا کہ دن کے وتر تین ہیں اور وہ مغرب کی نماز ہے
وہ دن کے وتر اور یہ رات کے وتر۔

اصول فقہ

قرآن وحدیث، اجماع اور قیاس فقہ اسلامی کی عمارت کے چار ستون ہیں اور یہی اصول فقہ کے موضوع فن بھی ہیں۔ ان چاروں میں سے دو موخر الذکر کی ضرورت نبی ﷺ کے بعد پیش آئی کیونکہ مہبط وحی والہام کی موجودگی میں اجماع و قیاس کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اجماع

اجماع کو عملی حیثیت سے رواج دینا گو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا خاص طرۂ امتیاز ہے تاہم اصولی حیثیت سے پہلے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کو مستحسن قرار دیا اور فرمایا:

"ماراى المسلمون حسناً فهو عندالله حسن وما راواسينا فهو عندالله سئى" (مسند احمد ج ۲ ص ۳۷۹)
جس چیز کو تمام مسلمان بہتر سمجھ لیں وہ خدا کے نزدیک بھی بہتر ہے اور جس کو بُرا سمجھ لیں وہ خدا کے نزدیک بھی بُری ہے اور یہی درحقیقت اجماع کی اصلی روح ہے۔

قیاس

اصول فقہ کا چوتھا رکن ہے جو درحقیقت قرآن، حدیث اور اجماع ہی کی ایک شاخ ہے۔ لیکن توسیع فقہ اور نئے نئے مسائل کی بند گرہوں کو کھولنے کے اعتبار سے وہ خاص اہمیت رکھتا ہے یہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید اور احادیث میں تمام جزئیات مذکور نہیں

ہیں اور نہ اس قدر احاطہ ممکن تھا اس لیے علت مشترکہ نکال کر ان جزئیات غیر منصوصہ کو احکام منصوصہ پر قیاس کرنا فقیہ یا مجتہد کا سب سے اہم فرض ہے اور درحقیقت یہی وہ موقع ہے جہاں اس کی قوت اجتہاد تفریع مسائل و استنباط احکام کا امتحان ہوتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عملاً قیاس شرعی سے کام لے کر آئندہ نسلوں کے لئے وسیع شاہراہ قائم کردی اور ضمناً بہت سے ایسے قاعدے مقرر کردیئے جو آج ہمارے اصول فقہ کی بنیاد ہیں۔ ہم یہاں ان کے چند قیاسی مسائل نقل کرتے ہیں جس نے ان کی قوت استنباط کا اندازہ ہوگا۔

حج یا عمرہ کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی احرام باندھ لے اور دشمن کے حائل ہوجانے سے حج یا عمرہ کے ارکان کو پورا نہ کرسکے تو وہ صرف قربانی کا جانور بھیج کر احرام کھول دے اور آئندہ جب کبھی موقع آئے اپنے ارادے کو پورا کرے۔ جیسا کہ خود آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر کیا تھا۔ لیکن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ''مجبوری'' کو علت مشترکہ قرار دے کر مریض یا دوسرے مجبور اشخاص کے لئے بھی یہی حکم جاری فرماتے ہیں، چنانچہ ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ میں عمرہ کے لئے احرام باندھ چکا تھا کہ اتفاقاً سانپ نے ڈس لیا اور اب جانے کی طاقت نہ رہی تو فرمایا تم صرف قربانی بھیج کر احرام کھول دو اور جب ممکن ہو عمرہ ادا کرو۔ (موطا امام محمد ص ۲۳۲)

اس قیاس سے دو اہم اصول معلوم ہوتے ہیں۔ (۱) اشتراک علت اشتراک حکم کا باعث ہے۔ (۲) سبب کا خاص ہونا حکم کے عام ہونے پر کچھ اثر نہیں ڈالتا۔ علم فرائض کا ایک قاعدہ ہے کہ میت سے جس کو زیادہ قرابت ہوگی اسی کو وراثت میں ترجیح دی جائے گی۔ مثلاً حقیقی بھائی کو علاتی یا اخیافی بھائی پر صرف اس لئے ترجیح ہے کہ اول الذکر ماں وباپ دونوں طرف سے قرابت ہے برخلاف موخر الذکر دونوں کے کہ ان میں صرف ایک حیثیت پائی جاتی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس اصول کو دیگر قرابت داروں میں بھی پیش نظر رکھتے ہیں مثلاً ایک میت نے زید اور بکر دو چچازاد بھائی چھوڑے اور زید کو اس رشتہ کے علاوہ میت کے اخیافی بھائی ہونے کا بھی شرف ہے تو ابن مسعود

رضی اللہ عنہ اس صورت میں از دیادِ قرابت کی علت مرجحہ نکال کر زید کو بکر پر ترجیح دیتے ہیں۔لیکن جمہور علماء اہل سنت عصبہ ہونے کی حیثیت سے ان دونوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔(التوضیح والتلویح)

اجتہاد

مذکورہ مسائل قیاسی کے علاوہ فقہ اسلامی کی بہت سی پیچیدہ گرہیں، صرف ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ناخن اجتہاد سے حل ہوئیں۔آپ استنباط احکام وتفریع مسائل پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں اور نصوص شرعیہ میں ناسخ ومنسوخ، موقت وموبد کی تفریق کر کے صحیح استنباط حکم کی راہ پیدا کر لیتے تھے، مثلاً ایک دفعہ استفتاء آیا کہ ایک حاملہ عورت جس سے اس کا شوہر مر جائے عدت کیا ہے؟ چونکہ قرآن مجید میں عدت کے متعلق مختلف احکام ہیں۔سورہ بقرہ میں عام حکم یہ ہے:

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشراً.

تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑیں تو وہ (عورتیں) اپنے آپ کو چار مہینے دس دن تک روکے رکھیں۔

اور سورہ نساء میں خاص حاملہ عورتوں کے لئے جن کے شوہر مر گئے ہوں یہ حکم ہے۔

واو لات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن.

اور جو عورتیں حاملہ ہوں ان کی مدت یہ ہے کہ اپنا حمل وضع کریں۔

اس بناء پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ جس میں زیادہ مدت صرف ہو اس کو اسکی عدت قرار دیا جائے تاکہ دونوں آیات کا توافق ہو جائے لیکن ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حاملہ عورت کے حق میں سورہ بقرہ کی آیت کو سورہ نساء کی آیت سے منسوخ قرار دے کر وضع حمل عدت قرار دی اور فرمایا میں اس کے لئے مباہلہ کر سکتا ہوں کہ سورہ بقرہ سورہ نساء کے بعد نازل ہوئی ہے۔ (التوضیح والتلویح)

یہ مسئلہ کہ جہری نمازوں میں مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ آج تک احناف اور دیگر فرقہ اسلامیہ کے درمیان ایک معرکتہ الآراء بحث ہے اور اس کا کسی طرح فیصلہ نہیں ہونے پایا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ بحث پیدا ہوچکی تھی۔ چنانچہ ایک شخص نے بطور استفتاء کے اس مسئلے کو پیش کیا انہوں نے جواب دیا:

انصت فان فی الصلوٰۃ شغلاً سیکیفک ذاک الامام.

(موطا امام محمد ج ا ص ۹۶)

خاموش رہو کیونکہ نماز میں توجہ قائم نہیں رہتی، امام کا پڑھنا تمہارے لئے کافی ہے۔

اس جواب میں درحقیقت حسب ذیل تین دلیلوں کی طرف اشارہ ہے جو آج بھی احناف کے لئے مخالفین کے مقابلہ میں بمنزلہ سپر ہے۔

واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا.

''جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور خاموش رہو''۔

(۲) مقتدی کی قرأت سے نماز میں توجہ قلب باقی نہیں رہتی۔

(۳) آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

من کان له امام فقراۃ الامام قراۃ له.

یعنی جو امام کے پیچھے ہو اس کے لئے امام کی قرأت کافی ہے۔

ایک مرتبہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس فرائض کا استفتاء آیا کہ ایک میت نے اپنے ورثہ میں ایک لڑکی ایک پوتی اور ایک بہن چھوڑی ہے اس کی جائداد کس طرح تقسیم ہوگی انہوں نے جواب دیا کہ لڑکی اور بہن نصف کی مستحق ہیں اور پوتی محروم الارث ہے اس استفتاء کے ساتھ ہی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھی یہی استفتاء آیا۔ انہوں نے فرمایا اگر میں رسول خدا کے فرمان پر ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دوں تو میں گمراہ ہوں گا۔ بیشک لڑکی نصف پائے گی لیکن دوثلث پورا کرنے کے لئے ایک سدس پوتی کو بھی ملے گا اور جو باقی رہے گا

وہ بہن کا حصہ ہے۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۴۲۸ و بخاری ج ۲ ص ۹۹۷)

یہ جواب جب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو فرمایا جب تک یہ بڑا عالم ہم میں موجود ہے اس وقت تک ہم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ آج یہی فتویٰ تمام مسلمانوں کا معمول بہ ہے۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تبحر علمی و ملکہ اجتہاد کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم معترف تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ان کو دیکھتے تو چہرہ بشاش ہو جاتا اور فرماتے کیف ملی علما (مستدرک حاکم بمناقب طبقات ابن سعد قسم اول جزء ثالث ص ۱۱۰)

ایک ظرف ہے جو علم سے بھرا ہوا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے چند کوفیوں نے ان کے تقویٰ، حسن خلق، اور تبحر علمی کی بے حد تعریف کی۔ انہوں نے پوچھا کیا تم سچے دل سے کہتے ہو؟ بولے ہاں۔ فرمایا تم لوگوں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی جو تعریف کی ہے میں ان کو اس سے بھی بہتر خیال کرتا ہوں۔ (طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۱۰)

ایک مرتبہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ اگر کسی کے حلق سے بیوی کا دودھ چلا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ اس پر حرام ہو جائے گی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ موجود تھے انہوں نے (روک کر کہا) آپ یہ کیا فتویٰ دیتے ہیں؟ رضاعت صرف دو سال تک ہے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے خوش ہو کر تعریف کے لہجہ میں لوگوں سے کہا جب تک یہ عالم تم میں موجود ہے مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ (موطا امام مالک ص ۲۲۳)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے جو تہبند کو ٹخنوں سے نیچے لٹکائے تھا کہا تہبند ذرا اوپر کر کے باندھو اس نے کہا اے عبداللہ تم بھی تہبند اوپر کرو۔ بولے میں تمہارے جیسا نہیں ہوں میری ٹانگیں پتلی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

جب اس ردوقدح کا حال سنا تو اس شخص کو کوڑے لگوائے کہ تو نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے شخص سے منہ زوری کی۔ (اصابہ ج ۳ ص ۱۳۰)

نامعلوم مسائل میں رائے زنی سے احتراز

ایک طرف تو ان کی قوت اجتہاد و جلالت شان کا یہ حال تھا لیکن دوسری طرف حزم واحتیاط کا یہ عالم تھا کہ نامعلوم مسائل میں رائی زنی سے کام نہ لیتے تھے اور اپنے شاگردوں کو ہمیشہ ہدایت فرماتے تھے کہ جس چیز کو تم نہیں جانتے اس کے بارے میں یہ نہ کہا کرو کہ میری رائے اس میں یہ ہے یا میرا خیال یہ ہے بلکہ صاف کہہ دیا کرو میں نہیں جانتا۔ (اعلام الموقعین ص ۶۴)

مسروق جو کہ ان کے خاص تلامذہ میں سے ہیں بیان کرتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اکثر حسرت وافسوس کے ساتھ فرمایا کرتے کہ عنقریب ایسا زمانہ آنے والا ہے جبکہ علماء باقی نہ رہیں گے اور لوگ ایسے جاہلوں کو سردار بنالیں گے جو تمام امور کو محض اپنی رائے وعقل سے قیاس کرینگے۔ (اعلام الموقعین ص ۶۴)

ایک مرتبہ ان کے پاس یہ استفتاء آیا کہ ایک عورت کا نکاح ہوا لیکن اس میں مہر کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا یہاں تک کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ کیا حکم ہے وہ عورت مہر وراثت کی مستحق ہے یا نہیں؟ چونکہ اس کے متعلق واقفیت نہ تھی اس لئے باوجود ضد واصرار کے ایک مہینے تک خاموش رہے لیکن جب زیادہ مجبور ہو گئے تو بولے کہ میرا فیصلہ یہ ہے کہ وہ مہر مثل اور وراثت کی مستحق ہے اور اس کو عدت میں بیٹھنا چاہئے پھر فرمایا اگر صحیح ہے تو خدا کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہے خدا اور رسول ﷺ اس سے بری ہیں اس وقت حاضرین میں دو صحابی رضی اللہ عنہ، حضرت جراح رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسنان رضی اللہ عنہ موجود تھے انہوں نے اٹھ کر کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ رسول ﷺ نے بروع بنت واشق کے حق میں بھی یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ اس توافق سے ابن مسعود کو غیر معمولی مسرت حاصل ہوئی۔

(ابوداؤد باب فیمن تزوج ولم یسم صداقہا)

فتویٰ سے رجوع کرنا

اگر کوئی فتویٰ دیتے اور بعد میں اس کے خلاف پاتے تو فوراً رجوع کر لیتے ایک مرتبہ ایک شخص نے کوفہ میں یہ مسئلہ دریافت کیا کہ ایک شخص نے نکاح کے بعد اپنی بیوی کو ہاتھ نہیں لگایا تو اس کے بعد اس کی ماں سے نکاح کر سکتا ہے تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔ لیکن جب مدینہ آ کر دریافت کیا تو معلوم ہوا ربیبہ لڑکیوں کے سواء تمام صورتوں میں ناجائز ہے۔ چنانچہ انہوں نے کوفہ واپس آ کر مستفتی سے ملاقات کی اور اپنے فتویٰ سے رجوع کر کے فسخ نکاح کا حکم دیا۔ (موطا امام مالک ص ۱۹۳)

معاصرین سے استفادہ

نامعلوم مسائل میں ان کو اپنے اہل علم معاصرین سے استفادہ کرنے میں عار نہ تھا ایک مرتبہ انہوں نے اپنی بیوی سے ایک لونڈی خریدی اور شرط یہ لگائی کہ اگر فروخت کی جائے گی تو قیمت ان کی بیوی کو ملے گی۔ چونکہ ان کو خود اس بیع کی تکمیل میں شک تھا۔ اس لئے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فتویٰ پوچھا انہوں نے جواب دیا کہ بیع مشروط سے ملکیت حاصل نہیں ہوتی تم اس کے قریب نہ جاؤ۔ (موطا امام محمد ص ۳۴۲)

امام محمد نے کتاب آثار میں روایت کی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں جو مجتہد تسلیم کیے جاتے تھے وہ باہم فقہی مسائل میں بحث و مذاکرہ کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ ایک ساتھ اور عمر رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ ایک ساتھ امام شعبی کا بیان ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ، زید رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ باہم ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے اسی وجہ سے ان کے مسائل باہم ملتے جلتے ہیں۔

عہدۂ قضاء

آپ ۲۰ھ میں کوفہ کے قاضی مقرر کیے گئے عہدہ قضاء کے علاوہ خزانہ کی

افسری، مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اور والی کوفہ کی وزارت کے فرائض بھی ان کے متعلق تھے چنانچہ فرمان تقرری کے الفاظ یہ ہیں:

"انی بعثت الیکم عمار بن یاسر امیر او ابن مسعود معلماً وزیراً وقد جعلت ابن مسعود علی بیت مالکم وانھما لمن النجبا من اصحاب محمد (ﷺ) من اھل بدر فاسمعوا لھما واطیعو واقتدوا بھما وقد اثرتکم بابن ام عبد علی نفسی". (اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۵۸)

میں نے تم پر عمار بن یاسر کو امیر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بیت المال کی افسری بھی دی ہے یہ دونوں آنحضرت ﷺ کے ان ذی عزت اصحاب میں سے ہیں جو کہ معرکہ بدر میں شریک تھے۔ اس لئے ان کو سمعاً وطاعۃً کہو اور اتباع کرو حقیقت یہ ہے کہ میں نے تمہارے لیے ابن ام عبد کو (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) اپنی ذات پر ترجیح دی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کامل دس سال تک نہایت مستعدی وخوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے اس طویل عرصہ میں بساط سیاست پر گوناگوں انقلاب ہوئے خلیفہ دوم نے وفات پائی۔ خلیفہ ثالث نے مسند خلافت پر قدم رکھا اور خاص کوفہ کی عنان حکومت اہل کوفہ کے احتجاج وشکایت پر یکے بعد دیگرے مختلف والیوں کے ہاتھ آئی لیکن وہ جس احتیاط اور انصاف کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے تھے اس لحاظ سے کسی کو ان سے شکایت پیدا نہ ہوئی۔ لیکن فطری رحم دلی، نرمی، اور تلطف کے باعث عفو، درگذر اور چشم پوشی ان کا مخصوص شیوہ تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ اس راز سے بھی واقف تھے کہ بارگاہ عدالت میں جب کسی مجرم پر کوئی جرم ثابت ہو جائے تو اس کے ساتھ نرمی، درگذر کرنا درحقیقت نظام حکومت ارکان واساطین کو متزلزل کر دیتا ہے اس وجہ سے وہ اپنی طبعی نرمی وشفقت کے باوجود قانون عدالت کے اجراء میں کبھی دریغ نہ فرماتے، ایک دفعہ ایک شخص نے اپنے

برادرزادہ کوشراب خوری کے جرم میں پیش کیا، ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے تحقیقات کے بعد حد جاری کرنے کا حکم دے دیا لیکن جب دُرّے پڑنے لگے تو اس کا دل رحم وشفقت سے بھر آیا اور منت وساجت کے ساتھ سفارش کرنے لگا۔ انہوں نے فرمایا تو نہایت ظالم چچا ہے اس کو حد شرعی کا مستحق ثابت کر کے چھوڑ دینے کی سفارش کرتا ہے جواب ممکن نہیں ہے، اسلام میں سب سے پہلے ایک عورت پر حد جاری کی گئی جس نے چوری کی تھی آنحضرت ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم صادر فرمایا اور فرمایا تم لوگوں کو اعراض وچشم پوشی سے کام لینا چاہئے کیا تم پسند نہیں کرتے کہ خدا تمہیں بخش دے، بعض دفعہ ایک جرم مجرموں کے اختلافی حیثیات کے لحاظ سے ان کو مختلف سزاؤں کا مستوجب قرار دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ اس نکتہ سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ ایک دفعہ ان کو اطلاع دی گئی کہ مسیلمہ کذاب کے متبعین میں سے کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں جو اس کو رسول خدا کہتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے چند سپاہی بھیج کران کو گرفتار کرالیا اور سب کی توبہ قبول کر کے چھوڑ دیا۔ لیکن ان کے سرگروہ ابن نواحہ کے لئے قتل کی سزا تجویز کی لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو بولے ابن نواحہ اور ابن اثال دو شخص مسیلمہ کذاب کی طرف سے رسول اکرم ﷺ کی طرف سفیر بن کر گئے تھے، آنحضرت ﷺ نے پوچھا کیا تم مسیلمہ (کذاب) کی رسالت پر ایمان رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا! ہاں'' تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم دونوں سفیر نہ ہوتے تو تم کو میں قتل کرا دیتا۔ اس بنا پر جب وہ اس باطل عقیدہ سے باز نہیں آیا تو رسول اللہ ﷺ کی خواہش کا پورا کرنا ضروری تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب کوفہ سازش، فتنہ، اور بدامنی کا مرکز ہو گیا تو عہدۂ قضاء کے لحاظ سے قدرۃً ابن مسعود کو بھی غیر معمولی دشواریاں پیش آئیں۔ ایک دفعہ عقبہ بن ولید کے دور امارت میں ایک ساحر کا مقدمہ پیش ہوا جو امیر کوفہ کے سامنے اپنی شعبدہ بازی دکھار ہا تھا لیکن فیصلہ کے صادر ہونے سے پہلے ہی جندب نامی شخص نے اس کو قتل کر دیا کیونکہ یہ صریحا معاملات حکومت میں مداخلت تھی اس لئے انہوں نے قاتل کی گرفتاری کا حکم دے کر دربار خلافت کو مفصل واقعہ سے مطلع کیا وہاں

سے حکم آیا کہ معمولی تنبیہ وتوبیخ کے بعد چھوڑ دو۔ اور لوگوں کو سمجھاؤ کہ آئندہ اس قسم کے واقعات کا اعادہ نہ ہونے پائے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حکم کی تعمیل کی اور اہل کوفہ کو جمع کر کے فرمایا صاحبو، صرف شک وشبہ پر کوئی کام نہ کرو اور عدالت کو اپنے ہاتھوں میں نہ لو مجرموں اور خطا کاروں کو سزا دینا ہمارا فرض ہے تم کو اس میں مداخلت کی ضرورت نہیں۔

(تاریخ طبری ص ۲۸۴۵)

اسی سال والی کوفہ عقبہ بن ولید پر شراب خوری کا الزام لگایا گیا ایک جماعت نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ وہ تخلیہ میں شراب پیتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا جاسوسی میرا فرض نہیں۔ اگر ایک شخص چھپ کر کوئی کام کرتا ہے تو میں اس کی پردہ دری کے درپے نہیں ہوسکتا ولید نے یہ جواب سنا تو ناراض ہو کر ان کو بلاوا بھیجا اور پوچھا کہ کیا مفسدین کو ایسا ہی جواب دینا مناسب تھا؟ میں چھپ کر کون سا کام کرتا ہوں! یہ تو اس شخص کے لئے کہا جاسکتا جو مشکوک ہو۔ غرض اسی سوال وجواب میں بات بڑھ گئی اور دونوں ایک دوسرے سے کشیدہ خاطر اٹھے۔ (تاریخ طبری ص ۲۸۴۵)

خزانہ کی افسری

ابن مسعود رضی اللہ عنہ عہدۂ قضاء کے ساتھ خزانہ کی افسری پر بھی مامور تھے کوفہ عظمت وسعت وکثرت محاصل کی وجہ سے اس کا بیت المال نہایت اہمیت رکھتا تھا اس سے لاکھوں روپے کی وظائف جاری تھے فوجی مراکز ہونے کے ناطے ہزاروں فوجیوں کی تنخواہ جاری تھی اور خراسان، ترکستان اور آرمینیہ پر وقتاً فوقتاً جو فوج کشی ہوتی رہتی اس کے مصارف ادا کئے جاتے اسی بنا پر دوسرے اہم مشاغل کے ساتھ اس شعبہ کی اس طرح نگرانی کرنا کہ ایک حبہ بھی ادھر نہ ہونے پائے درحقیقت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی انتظامی قابلیت بیداری مغز اور حساب فہمی کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

ذاتی حیثیت سے ابن مسعود رضی اللہ عنہ زہد وبے نیازی کے اقلیم کے بادشاہ تھے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمتوں کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتے تھے۔ لیکن قومی سرمایہ کے تحفظ میں اس قدر سخت تھے کہ اعزا واحباب افسر اور والی ملک کے ساتھ بھی کسی قسم کی

رعایت ملحوظ نہ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ والی کوفہ نے بیت المال سے کچھ قرض لیا اور ناداری کے باعث ایک عرصہ تک ادا نہ کر سکے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مہتمم بیت المال کی حیثیت سے نہایت سختی سے مطالبہ شروع کر دیا یہاں تک کہ ایک دن تلخ کلامی کی نوبت پیش آئی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جھلا کر چھڑی زمین پر پھینک دی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے! چونکہ یہ نہایت مستجاب الدعوات مشہور تھے اس لئے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے خوف زدہ ہو کر کہا دیکھو میرے لیے بددعا نہ کرنا بولے بخدا، اگر مجھے خوف خدا نہ ہوتا تو تیرے لئے سخت قسم کی بددعا کرتا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کا یہ انداز دیکھا تو تیزی سے کاشانہ امارت سے باہر نکل آئے۔ اس واقعہ کی رپورٹ دربار خلافت میں پہنچی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور سعد بن ابی وقاص کو معزول کر کے ولید بن عقبہ کو والی بنا کر بھیجا۔ حضرت عبداللہ بھی اس ناراضگی سے مستثنٰی نہ تھے تاہم وہ ایک عرصہ تک اپنے عہدے پر برقرار رہے۔ (تاریخ طبری ص ۲۸۱۱)

معزولی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخیر عہد خلافت میں جب مختلف سازشوں کا بازار گرم ہوا تو ان سازشوں نے زیادہ دیر تک ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے عہدے پر رہنے نہ دیا اور آپ بھی یکا یک معزول کر دیے گئے، معزولی کی خبر نے کوفہ کی علمی دنیا کو ماتم کدہ بنا دیا احباب، معتقدین، تلامذہ اور اعیان شہر کی ایک بڑی جماعت نے جمع ہو کر اس فرمان عزل کی سخت مخالفت اور ناراضگی ظاہر کی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مصر ہوئے کہ آپ کوفہ سے تشریف نہ لے جائیں۔ اگر اس کی پاداش میں آپ کو کوئی مصیبت پہنچے گی تو ہم اسے روکیں گے۔ تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا نہیں میرے اوپر امیر کی اطاعت فرض ہے اگر بالفرض میں امیر کی اطاعت نہ کروں تو ہوسکتا ہے میری وجہ سے کوئی فساد برپا ہو جائے اور صرف میں مسلمانوں کے درمیان فتنہ کا سبب بن جاؤں اور اس کی ابتداء میری طرف سے ہو۔ غرض یہ کہ عمرہ کی نیت کر کے ایک جماعت کے

ساتھ حجاز کی طرف روانہ ہو گئے۔ (الاصابۃ)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین

ابن مسعود رضی اللہ عنہ جب حجاز تشریف لا رہے تھے تو مدینہ منورہ کے راستے میں ایک مقام ہے جو ربذہ کہلاتا ہے وہاں پر ابوذر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا آپ نے وفات کے بعد ان کی تدفین کی، ایک مفصل واقعہ تاریخ طبری میں یوں مذکور ہے کہ یہ واقعہ ۸ ذی الحجہ ۳۱ھ کا ہے جب ابوذر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو فرمایا دیکھو بیٹی کوئی قافلہ تو نہیں آرہا بیٹی نے دیکھ کر فرمایا ابھی کوئی قافلہ نہیں آرہا پھر کوئی تھوڑی دیر گزری کہ ابوذر نے بیٹی سے کہا کہ بکری ذبح کرے اور اس کو پکائے تو انہوں نے بکری ذبح کی اور اس کا گوشت تیار کیا۔ پھر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ابھی میری موت کے بعد ایک قافلہ آئے گا مجھے دفن کرے گا تم ان سے کہہ دینا کہ آپ لوگ اس وقت تک سوار نہ ہوں جب تک یہ گوشت نہ کھالیں جب کھانا مکمل تیار ہو گیا تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیٹی کو ایک دفعہ دوبارہ دیکھنے کا حکم دیا اور فرمایا دیکھو کوئی قافلہ تو نہیں آرہا وہ گئیں اور دیکھا کہ واقعی ایک قافلہ آرہا ہے واپس آکر باپ کو بتایا کہ وہاں تو ایک قافلہ آرہا ہے آپ نے فرمایا میرا منہ قبلہ کی طرف کر دو انہوں نے حکم کی تعمیل کی پھر یہ جملہ ارشاد فرمانے لگے: بسم اللّٰہ و باللہ وعلی ملۃ رسول اللہ ﷺ اور یہ کہہ کر آپ کی وفات ہو گئی یہ دیکھ کر بیٹی گھر سے باہر نکل آئیں اور راستہ میں آکر کھڑی ہو گئیں۔ یہاں تک کہ قافلہ آپ کو دیکھ کر رک گیا آپ نے ان سے کہا اللہ آپ پر رحم کرے ذرا ابوذر سے مل لیں۔ وہ قافلہ والے بولے کہاں ہیں ابوذر۔ بیٹی نے بتایا کہ وہ وہاں رہتے ہیں اور ابھی ان کی وفات ہو گئی ہے لہٰذا آپ ان کے کفن دفن کا انتظام کریں وہ قافلہ فدیت ابی وامی یعنی میرے ماں باپ آپ رضی اللہ عنہ پر فدا ہوں کہہ کر اتر پڑے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی قافلہ کے امیر تھے جو کوفہ سے مکہ جا رہے تھے۔ جب آپ کو ان کی وفات کی علم ہوا تو ان کی نعش سے لپٹ کر رونے لگے اور ساتھ ساتھ یہ الفاظ بھی ادا فرما رہے تھے کہ صدق رسول اللہ ﷺ یموت وحدہ ویبعث

وحدہ ''اللہ کے رسول ﷺ کی بات بالکل سچ ہوگئی کہ (ابوذر رضی اللہ عنہ) اکیلے ہی مریں گے اور اکیلے ہی حشر کے روز اٹھائے جائیں گے''۔ پھر آپ نے ان کو غسل دیا اور کفن پہنا کر نماز جنازہ پڑھائی۔ اور ان کو وہیں دفن کردیا جب ان تمام امور سے فارغ ہوگئے اور یہ ارادہ کیا کہ اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوجائیں تو ابوذر کی صاحبزادی بولیں کہ میرے والد نے مجھ سے قبل از وفات کہا تھا کہ ان قافلہ والوں کو میرا اسلام پہنچا دینا اور ان کو قسم دے کر یہ کہنا کہ آپ اس وقت تک سوار نہ ہوں جب تک یہ کھانا نہ کھالیں، آپ نے ان کی بات مان لی اور کھانا کھا کر فوراً روانہ ہوگئے اور واپس پہنچ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ابوذر رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع دی اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی بیٹی چونکہ (ربذہ'' میں اکیلی رہ جاتیں) اس لئے ان کو اپنے ساتھ لے آئے اور ان کے اصل خاندان سے ملا دیا اس کے بعد ابن مسعود رضی اللہ عنہ عمرہ سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ مقیم ہوگئے اور بقیہ قافلہ جو آپ کو چھوڑنے آیا تھا واپس کوفہ چلا گیا۔ (الطبری الجزالثالث ص ۳۵۴)

علالت اور وفات

۳۲ھ میں جب آپ کی عمر مبارک ساٹھ سے متجاوز ہوچکی تھی۔ ایک شخص نے حاضر خدمت ہوکر عرض کیا ''خدا مجھے آپ کی زیارت سے محروم نہ کرے''۔ میں نے گزشتہ رات خواب میں دیکھا ہے کہ حضور ﷺ ایک بلند منبر پر تشریف فرما ہیں۔ اور آپ رضی اللہ عنہ سامنے ہیں اسی حالت میں ارشاد ہوتا ہے ابن مسعود رضی اللہ عنہ میرے بعد تمہیں بہت تکلیف پہنچائی گئی آؤ میرے پاس چلے آؤ۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جب اس شخص سے یہ سنا تو فرمایا کہ بخدا تم نے یہی خواب دیکھا ہے۔ بولا ہاں فرمایا تم میرے جنازے میں شریک ہوکر ہی کہیں جاؤ گے۔ یہ خواب چند روز میں حقیقت میں بدل گیا آپ اس طرح بیمار ہوئے کہ لوگوں کو آپ کی زندگی سے مایوسی ہوگئی۔ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آخری لمحات میں عیادت کے لئے تشریف لائے اور اس طرح گفتگو شروع فرمائی۔ حضرت عثمان: آپ کیا چاہتے ہیں؟ حضرت عبداللہ! خدا کی رحمت۔ حضرت عثمان: آپ کے لئے طبیب بلاؤں؟ حضرت عبداللہ! مجھے طبیب ہی

نے بیمار کرڈالا۔ حضرت عثمان: آپ کا وظیفہ جاری کردوں؟ حضرت عبداللہ! مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ حضرت عثمان آپ کی صاحبزادیوں کے کام آئے؟ حضرت عبداللہ! کیا آپ کو میری لڑکیوں کے محتاج اور فقیر ہونے کا خطرہ ہے؟ میں نے انہیں حکم دیا ہے کہ ہر رات سورہ واقعہ پڑھ لیا کریں کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جوکوئی سورہ واقعہ ہر رات میں پڑھے گا کبھی فاقہ میں مبتلا نہ ہوگا۔ (اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۵۷)

لیکن ان مذکورہ سوال و جواب کا حاصل یہ نہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حالت میں وفات ہوئی تھی کہ دونوں کے دل صاف نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ طبقات ابن سعد میں یہ بات موجود ہے کہ وفات سے پہلے دونوں نے دل صاف کرالئے تھے۔ جو معمولی رنجشیں تھیں وہ دور ہوگئی تھیں۔ (طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۶۰)

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو جب سفر آخرت کا یقین ہوگیا تو انہوں نے زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اوران کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور اپنے مال واسباب اور اولاد نیز اپنی تجہیز و تکفین سے متعلق مختلف وصیتیں فرمائیں اور ساٹھ برس سے کچھ زیادہ عمر پاکر ۳۲ھ میں اس دار فانی سے انتقال فرمایا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

مستند اور صحیح روایت کے مطابق آپ کی نماز جنازہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور آپ کو حضرت عثمان بن مظعون کے برابر جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

(طبقات ابن سعد باب ذکر، اوصی بہ ابن مسعود ص ۱۵۹)

اولاد

آپ کے دو بیٹے عبدالرحمٰن اور ابوعبیدہ ہیں اور آپ کی بیٹیاں بھی ہیں۔ جبکہ آپ کی زوجہ کا نام زینب ثقفی ہے۔ آپ کا ایک پوتا جس کا نام قاسم بن عبدالرحمٰن ہے۔

فقیہ مکہ حضرت امام عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

حضور ﷺ کی وفات کے وقت آپ کی عمر تیرہ سال تھی۔ آپ نے علم حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا علم میں اس اونچے مقام پر پہنچے کہ آپ کو حبر الامہ کہا جانے لگا۔ (اصابہ ج ۲ ص ۳۳۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہ قرآن کریم کے بڑے اچھے مفسر ہیں اگر یہ ہماری عمر کے ہوتے (یعنی خود حضور ﷺ سے علم حاصل کرتے) تو ہم میں سے کوئی شخص علم میں ان کے پایہ کا نہ ہوتا۔ آپ نے ہی انہیں ترجمان القرآن کا لقب دیا۔ (ایضاً)

آپ کی والدہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی سگی بہن تھیں۔ آپ کے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ انہیں ولادت کے بعد حضور ﷺ کے پاس لے آئے اور آپ نے اپنا لعاب دہن ان کے منہ میں ڈالا اور دُعا فرمائی۔ آپ نے اللھم علمه الکتاب بھی آپ کے حق میں کہا۔ (صحیح بخاری، ج ا ص ۵۳۱)

ایک اور موقعہ پر آپ نے ان کے لیے دعا فرمائی:

اللّٰھم فقھه فی الدین و علمه التاویل. (مسند احمد ج ا ص ۳۲۸)

اے اللہ انہیں دین میں فقہ عطا فرما اور ان پر مراداتِ قرآن کھول دے۔

ایک دفعہ یہ بھی فرمایا:

اے اللہ! اس سے علم کی روشنی پھیلا۔ (اسد الغابہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ باوجودیکہ ان کے استاد تھے مگر وہ آپ کا احترام کرتے اور وہ آپ کو بدریوں کے ساتھ بٹھاتے تھے۔ حضرت عطاء (۱۱۴ھ) فرماتے ہیں میں نے ان سے زیادہ کسی کی مجلس فقہ سے بھرپور نہ دیکھی۔ آپ فرماتے ہیں:

ان اصحاب الفقه عنده واصحاب القرآن عنده واصحاب الشعر عنده يصدرهم كلهم من وادواسع.

(الاصابہ ج۲ص ۳۳۳)

فقہ کے لوگ بھی آپ کے پاس بیٹھے ہوتے تفسیر کے لوگ بھی آپ کے ہاں بیٹھا کرتے اہل ادب بھی وہاں آئے ہوتے۔ ہرایک دور کے علاقوں سے آیا ہوتا تھا۔

آپ کی نماز جنازہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن حنفیہ نے پڑھائی اور فرمایا:

والله مات اليوم حبر هذه الامة. (تذکرۃ الحفاظ ج۱)

بخدا آج اس امت کا سب سے بڑا عالم دنیا سے چل بسا۔

آپ کے خصوصی شاگردوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے قاسم بن محمد، علامہ ابن سیرین، عطا، مجاہد، نافع، عمرو بن دینار، علامہ شعبی اور سعید بن جبیر سرفہرست ہیں۔ مکہ میں فقہ کی بنیاد آپ نے ہی رکھی۔ آپ نے اپنے فقہی ذہن سے اتنے فتاوے مرتب فرمائے کہ بقول حافظ ابن قیم (۷۵۱ھ) بیس جلدوں میں لکھے گئے۔ (اعلام الموقعین ج۱ص۱۳)

دنیا میں فقہ کی یہ پہلی کتاب تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے چند فقہی مسائل

اگر کوئی مسئلہ آپ کو قرآن و حدیث میں نہ ملتا تو آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں کی پیروی کرتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تقلیدِ اعلم اس دور میں بھی جاری ہو چکی تھی اگر وہاں انہیں اس کا فیصلہ نہ ملتا تو اپنی رائے قائم فرماتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دین میں رائے قائم کرنا عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہرگز کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا اور یہ دینی رائے ہوتی تھی حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ

لکھتے ہیں: قال برایہ۔آپ اپنی رائے سے بات کہتے۔ (الاصابہ ج ۲ ص ۳۲۳)

(۱)......آپ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو تین قرار دیتے تھے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے نزدیک وہ حدیث جس میں ہے کہ حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہی سمجھی جاتی تھی موول تھی جو اپنے ظاہر پر مبنی نہیں سمجھی گئی، امام نسائی نے اس پر اسی لیے یہ باب باندھا ہے۔

باب طلاق الثلٰث المتفرقة قبل الدخول بالزوجة.

(سنن کبریٰ للنسائی ج ۳ ص ۱۵۳)

وہ تین طلاقیں جو علیحدہ علیحدہ دی جائیں اس عورت کو جو اپنے گھر نہ لائی گئی تھی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اس عورت کے بارے میں ہے جو ابھی گھر نہ لائی گئی ہو اور نہ بسائی گئی ہو۔

(۲)......آپ تین وتر کے قائل تھے حافظ ابوجعفر الطحاوی (۳۲۱ھ) لکھتے ہیں:

وقدروی عن سعید بن جبیر ویحیٰ بن الجزار عن ابن عباس فی وتر رسول الله ﷺ مفرداً مایدل علیٰ انه ثلٰث فمن ذلک ماحدثنا ابوبکره قال حدثنا ابوداؤد...... عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ کان یوتر بثلٰث. (طحاوی ج ۱ ص ۱۴۰)

بایں ہمہ جب آپ کو خبر دی گئی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے وتر ایک رکعت بھی پڑھے ہیں تو آپ نے فرمایا:

اصاب انه فقیه (صحیح بخاری، ج ۱ ص ۵۳۱)

انہوں نے صحیح کیا وہ بے شک فقیہ ہیں۔

اس میں آپ کہہ گئے کہ ایک وتر مستقل نماز کے طور پر حضور ﷺ اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی نہیں ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو یہ بات کی

ہے اپنے استنباط سے کی ہے۔ وہ فقیہ ہیں اور فقیہ کو اجتہاد کا حق ہے گو اس میں وہ خطا کرے وہ اجر کا مستحق ہے۔

(۳)...... حضرت سعید بن جبیر کہتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا نماز میں صرف شروع کے وقت رفع یدین کی جائے۔ نماز میں کسی اور موقعہ پر (رکوع کرتے یا رکوع سے اٹھتے) رفع یدین نہ کی جائے،

لاترفع الایدی الافی سبع مواطن اذا قام الی الصلوٰۃ...... الحدیث. (المصنف، ج۱ص۲۱۴)

الذین ھم فی صلوتھم خاشعون) مخبتون متواضعون لایلتفتون یمیناً ولا شمالاً ولا یرفعون ایدیھم فی الصلوٰۃ

(۴)...... آپ خطبہ جمعہ کے وقت تحیۃ المسجد پڑھنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

(تفسیر ابن عباس ص ۲۸۴)

گویا حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے جو یہ حدیث مروی ہے کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو بھی تم تحیۃ المسجد پڑھو یہ اپنے ظاہر پر مبنی نہیں سمجھی گئی۔

اذا جاء احدکم یوم الجمعۃ والامام یخطب فلیرکع رکعتین (ایضاً)

جب تم میں کوئی جمعہ کے دن آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ لے۔

اس میں والامام یخطب سے مراد والامام ارادان یخطب ہے کہ امام منبر پر آ گیا ہے اور خطبہ دینے کو ہے اس وقت نماز تحیۃ المسجد پڑھی جا سکے گی، مشہور تابعی حضرت امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ امام منبر پر آجائے تو اس وقت سے ہی مقتدیوں کے لیے نہ کسی کو بات کرنے کی اجازت ہے نہ کسی کے لیے نماز پڑھنے کا موقع ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ، حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا موقف بھی یہی ہے۔

اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ ولا کلام۔ (صحیح مسلم ج۱)

جب امام آ جائے تو پھر نہ کوئی نماز پڑھے اور نہ بات کرے۔

عن علی وابن عباس وابن عمر کانوا یکرھون الصلوٰۃ والکلام بعد خروج الامام۔ (عمدۃ القاری ج۶ ص۲۲۰)

یہ دو مذہب آپ کے سامنے ہیں۔ یہ مذہب کسی کا نہیں کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو بھی مقتدی تحیۃ المسجد پڑھ لے۔ سو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث آپ کے منبر پر تشریف فرما ہونے سے متعلق ہے آپ نے عملاً خطبہ شروع کر دیا ہو تو آپ اس میں تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم نہیں دے رہے اگر ایسا ہوتا تو آپ ان روایات کی رو سے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خطبہ جمعہ شروع کر چکے تھے) اپنے خطبہ سے رُک نہ جاتے اور انتظار نہ فرماتے کہ وہ اپنی نماز تحیۃ المسجد پڑھ لے اور آپ خطبہ پھر سے شروع فرمائیں۔

اس پس منظر میں حضرت سلیک غطفانی کے اس واقعہ میں مندرجہ ذیل امور زیر نظر رکھے جائیں:

(۱)......جاء سلیک الغطفانی یوم الجمعۃ ورسول اللہ ﷺ قاعداً علی المنبر فقعد سلیک۔ (صحیح مسلم ج۱ ص۲۸۷، سنن کبریٰ امام نسائی ج۱ ص۵۲۸)

جمعہ کے دن سلیک غطفانی آئے اور حضور پاک ﷺ منبر پر بیٹھے تھے سو سلیک بھی بیٹھ گئے۔

(۲)...... ان النبی ﷺ حیث امرہ ان یصلی رکعتین امسک عن الخطبۃ حتی فرغ من رکعتیہ ثم عاد الی الخطبۃ۔ (المصنف ج۱ ص۴۴۷)

بے شک نبی ﷺ نے جب آپ کو دو رکعت پڑھنے کے لئے کہا تو خود خطبہ سے رُک گئے یہاں تک کہ وہ اپنی دو رکعتوں سے فارغ ہوا تب آپ اپنے خطبہ کی طرف لوٹے۔

(۳)......امام جب خطبہ شروع کرے تو مقتدیوں پر اس وقت چپ رہنا واجب ہو جاتا ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

ثم ینصت اذاتکلم الامام (صحیح بخاری ج۱ص۱۲۱)

جب امام بولے تو آنے والا نمازی چپ رہے۔

(۴)......اور یہ بھی فرمایا:

اذاقلت لصاحبک یوم الجمعة انصت والامام یخطب فقدلغوت (ایضاج۱ص۱۲۸)

جب تو نے اپنے کسی ساتھی کو خطبہ جمعہ کے وقت کہا چپ رہو تو تو نے بھی لغو کہا۔ (یعنی بولنا ہی نہ چاہئے تھا)

ان تمام روایات کی روشنی میں جمہور سلف صالحین کا موقف یہ ہے کہ امام کے خطبہ پڑھنے کے وقت کوئی شخص تحیۃ المسجد نہ پڑھے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا موقف تھا۔

علامہ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

قال مالک واللیث وابوحنیفة والثوری وجمهور السلف من الصحابة والتابعین لایصلیهما وهو مروی عن عمرو عثمان وعلی رضی الله عنهم وحجتهم بالانصات. (شرح صحیح مسلم ج۱ص۲۸۷)

امام مالک لیث ؒ ، ابوحنیفہ، سفیان الثوری اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کا یہی موقف ہے کہ خطبہ جمعہ کے وقت کوئی شخص دو رکعت تحیۃ المسجد نہ پڑھے۔

سو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکورہ بالا میں **والامام یخطب** کا مطلب یہی لیا گیا ہے اور **والامام** اراد ان **یخطب** جیسے قرآن کی آیت **اذاقمتم الی الصلوٰة فاغسلوا وجوهکم** کا یہ معنی نہیں کہ نماز میں کھڑے ہو کر پھر منہ دھو بلکہ مراد یہ ہے کہ

اذا اردتم ان تقوموا الصلوٰۃ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو۔ قرآن کے اس محاورے سے اس حدیث کا مطلب سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی فقہی خدمات

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ فقہ کی سنگ بنیاد ہیں، اس کی تشریح کے لیے ایک دفتر چاہیے، اس لیے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں، تاہم ان کی فقہ دانی کا سرسری اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ابوبکر محمد بن موسیٰ خلیفہ مامون الرشید کے پوتے نے جو اپنے زمانہ کے امام تھے، ان کے فتاویٰ ۲۰ جلدوں میں جمع کیے تھے۔

مکہ میں فقہ کی بنیاد ان ہی نے رکھی، وہ تمام فقہاء جن کا سلسلہ مکہ کے شیوخ تک پہنچتا ہے، وہ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کے خوشہ چین تھے، ایک فقیہ و مجتہد کے لیے قیاس ناگزیر ہے، کیونکہ وقتاً فوقتاً بہت سے ایسے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جو حضرت حامل شریعت علیہ السلام کے عہد میں نہ تھے، اور ان کے متعلق کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، ایسے وقت میں مجتہد کا یہ فرض ہے کہ وہ منصوصہ احکام اور ان میں علت مشترک نکال کر ان پر قیاس کر کے حکم صادر کرے، ورنہ فقہ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو وہ پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے، اگر اس سے جواب مل جاتا تو ٹھیک، ورنہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کی طرف رجوع کرتے، اگر اس سے بھی مقصد برآری نہ ہوتی تو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ دیکھتے، اگر اس سے بھی عقدہ حل نہ ہوتا تو پھر اجتہاد کرتے مگر اسی کے ساتھ قیاس بالرائے کو برا سمجھتے تھے، چنانچہ وہ اس کی مذمت میں کہتے ہیں کہ ''جو شخص کسی مسئلہ میں ایسی رائے دیتا ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نہیں ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب وہ خدا سے ملے گا تو اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا۔''

علم فقہ میں تعمق کا قصہ

ابوسلمہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے تھے کہ جس

شخص کے متعلق مجھ کو پتہ چلتا کہ اس نے آنحضرت ﷺ سے کوئی حدیث سنی ہے تو میں خود اس کے مکان پر جا کر اس سے وہ حاصل کرتا حالانکہ اگر میں چاہتا تو راوی کو اپنے یہاں بلوا سکتا تھا، ابو رافع رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے غلام تھے اس لیے ان کو آنحضرت ﷺ کے افعال دیکھنے اور اقوال سننے کا زیادہ موقع ملتا تھا، ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کے پاس کاتب لے کر آتے اور پوچھتے کہ آنحضرت ﷺ نے فلاں فلاں دن کون سا عمل فرمایا اور کیا بات ارشاد فرمائی، ابو رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے اور کاتب قلمبند کرتا جاتا، اسی تلاش وجستجو نے ان کو اقوال و اعمال نبوی ﷺ کا سب سے بڑا حافظ بنا دیا تھا، اکثر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو علم اور مرتبہ میں ان سے کہیں زیادہ تھے، ان کے مقابلہ میں اپنے قصور علم کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ یہ فتویٰ دیتے تھے کہ حائضہ عورت طواف رخصت کئے بغیر لوٹ جائے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے کہا تم حائضہ عورت کو طواف رخصت چھوڑنے کا فتویٰ دیتے ہو، انہوں نے کہا ہاں، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا یہ فتویٰ نہ دیا کرو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا میں تو یہی فتویٰ دوں گا، اگر آپ کو شک ہے تو فلاں انصاریہ سے جا کر پوچھ لیجئے کہ حضور ﷺ نے اس کو یہ حکم دیا تھا یا نہیں؟ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جا کر پوچھا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ صحیح نکلا۔ چنانچہ ہنستے ہوئے واپس آئے اور بولے تم نے سچ کہا تھا۔ (مسند احمد، ۱/۱۹۲۶)

ایک الجھن کا حل

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مسور بن مخرمہ میں محرم کے سر دھونے کے بارہ میں اختلاف ہوا، یہ کہتے تھے محرم سر دھو سکتا ہے، مخرمہ اس کے خلاف تھے اس پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے عبداللہ بن حنین کو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس تحقیق کے لئے بھیجا، یہ اس وقت کپڑا آڑ کئے ہوئے کنوئیں پر نہا رہے تھے، عبداللہ نے سلام کیا، انہوں نے پوچھا کون؟ کہا میں ہوں عبداللہ بن حنین! ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا ہے کہ آنحضرت ﷺ احرام کی حالت میں کس طرح سر دھوتے تھے، ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے عملاً نقشہ کھینچ کر بتا دیا۔ (سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب المحرم یغسل راسہ)

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی فقہی بصیرت

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہ میں آنحضرت ﷺ کے کسی قول وفعل کے بارے میں اختلاف ہوتا تو وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرتے۔ اس بارے میں کہ آنحضرت ﷺ نے کہاں سے احرام باندھا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بہت اختلاف ہے، سعید بن جبیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "اے ابن عباس! مجھ کو حیرت ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم آپ کے احرام باندھنے کی جگہ کی تعیین میں بہت زیادہ اختلاف رکھتے ہیں" انہوں نے کہا میری معلومات اس بارے میں سب سے زیادہ ہیں، چونکہ آنحضرت ﷺ نے ایک ہی حج کیا ہے اس لیے لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا، اس کا سبب یہ ہے کہ جب آپ نے ذوالحلیفہ کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد احرام باندھا اور لبیک کہنا شروع کیا، جو لوگ اس وقت موجود تھے انہوں نے اسی کو یاد رکھا، پھر جب آپ اونٹنی پر سوار ہوئے اور وہ چلی تو پھر آپ نے لبیک کہا، اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ یہ سمجھے کہ آپ نے یہیں ابتداء کی ہے، چنانچہ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب آپ اونٹنی پر سوار ہو کر چلے اس وقت سے لبیک کہنا شروع کیا، اس کے بعد جب آپ بلندی پر چڑھے اس وقت سے کہنا شروع کیا، لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ نے مسجد میں احرام باندھا، اس کے بعد جب اونٹنی چلی اور جب بلند مقام پر چڑھے دونوں مرتبہ لبیک کہا۔ (سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب وقت الاحرام)

ایک بے مثال علمی محفل کی سرگزشت

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا حلقہ درس بہت وسیع تھا، سینکڑوں طلب گار روزانہ ان کے خرمن کمال سے خوشہ چینی کرتے تھے، ان کی زندگی کا ہر لمحہ درس وتدریس کے لیے وقف تھا کبھی کوئی شخص ان کے چشمہ فیض سے ناکام واپس نہ ہوا، اس عام فیض کے علاوہ بعض مجلسیں خصوصیت کے ساتھ درس وتدریس اور علمی مذاکروں کے لیے مخصوص تھیں اور ان میں باقاعدہ ہر علم وفن کی جدا جدا تعلیم ہوتی تھی، ابو صالح تابعی بیان

کرتے تھے کہ

''میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف ایک ایسی علمی مجلس دیکھی کہ اگر سارا قریش اس پر فخر کرے تو بھی بجا ہوگا، اس مجلس کا یہ حال تھا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے مکان کے سامنے آدمیوں کا اتنا اژدحام تھا کہ ان کی کثرت سے آمدورفت مشکل تھی، میں نے جاکر اس اژدحام کی اطلاع دی تو مجھ سے پانی مانگا میں پانی لایا، انہوں نے وضو کیا، وضو کر کے بیٹھ گئے، پھر مجھ سے کہا جاؤ، قرآن کے جس شعبہ کے متعلق جو سائل ہوں ان کو اطلاع دو، میں نے اطلاع دی، دیکھتے ہی دیکھتے سائلوں سے سارا گھر اور تمام حجرے بھر گئے، جس نے جو سوال کیا اس کے سوال سے زیادہ اس کو جواب دے کر رخصت کیا، پھر مجھ سے کہا جاؤ، حرام وحلال اور فقہ کے سائلوں کو بلاؤ، میں نے ان لوگوں کو اطلاع دی چنانچہ ان کا جم غفیر آیا اور جن کو جو سوالات کرنا تھے، پیش کیے، فرداً فرداً سب کو نہایت تشفی بخش اور ان کے سوالات سے زیادہ جواب دے کر رخصت کیا پھر فرمایا کہ اب تمہارے دوسرے بھائیوں کی باری ہے اس کے بعد فرائض وغیرہ کے سائلوں کو بلایا، ان کی تعداد بھی اتنی بڑی تھی کہ پورا گھر بھر گیا، ان کے پیشرووں کی طرح ان کے سوالات سے زیادہ جوابات دے کر فارغ ہوئے تو مجھ سے کہا کہ عربی زبان شعر وشاعری اور ادب وانشاء کے سائلوں کو بلا لاؤ چنانچہ میں نے اطلاع دی، یہ لوگ آئے ان کے ہجوم کا بھی وہی حال تھا ان لوگوں نے جو سوالات کئے ان کے سوالات سے زیادہ جوابات دیئے، ابو صالح یہ واقعہ بیان کر کے کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی اتنی بڑی مجلس نہیں دیکھی تھی۔ (مستدرک حاکم، ۳/ ۵۳۸۔ سیر الصحابہ ۲/ ۲۶۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا خطبہ

ابن عباس رضی اللہ عنہما درس کے ان مستقل حلقوں کے علاوہ کبھی کسی نماز کے بعد تقریر اور خطبہ کے ذریعے سے تعلیم دیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن شقیق بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عصر کے بعد ہم لوگوں کے سامنے تقریر کی، اور اتنی دیر تک کرتے رہے کہ آفتاب غروب ہو گیا، اور تارے نکل آئے۔ لوگوں نے نماز کی آوازیں بلند کرنا شروع کیں ایک تمیمی نے مسلسل نماز کہنا شروع کیا، ابن عباس رضی اللہ عنہما بولے تیرا ناس ہو، تو مجھ کو سنت کی تعلیم دیتا ہے میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا ہے آپ ظہر، عصر اور مغرب وعشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھتے تھے، عبد اللہ بن شقیق کے دل میں یہ بات کھٹکتی رہی، انہوں نے جا کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہاں یہ صحیح ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافر وقصرھا)

ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازیں اکٹھے پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات (کسی مجبوری کی وجہ سے) ظہر کی نماز کو اتنا تاخیر سے پڑھتے کہ بالکل آخر وقت تک موخر کرتے اور عصر کی نماز کو وقت شروع ہوتے ہی پڑھ لیتے۔ مغرب، عشاء میں بھی یہی صورتحال ہوتی۔ اس طرح بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نمازوں کو جمع کیا تھا حالانکہ درحقیقت دونوں کو ان کے وقت میں پڑھا گیا۔ البتہ میدان عرفات میں ظہر وعصر اور مزدلفہ میں مغرب وعشاء کی نمازیں ایک ہی وقت میں پڑھی جاتی ہیں۔

مسئلہ بتانے میں احتیاط

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد حضرت عطاء، حضرت طاؤس اور حضرت عکرمہ بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کیا یہاں کوئی مفتی ہے؟ میں نے کہا پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ اس نے کہا میں جب بھی پیشاب کرتا ہوں اس کے بعد منی نکل آتی ہے۔ ہم نے کہا وہی منی جس سے بچہ

بنتا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! ہم نے کہا اس سے تمہیں غسل کرنا پڑے گا وہ انا للہ پڑھتا ہوا پشت پھیر کر واپس چلا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جلدی جلدی نماز پوری کی اور سلام پھیرتے ہی کہا، اے عکرمہ! اس آدمی کو میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ حضرت عکرمہ اسے لے آئے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم نے جو اس آدمی کو مسئلہ بتایا ہے وہ تم نے اللہ کی کتاب سے لیا ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔ انہوں نے فرمایا کیا تم نے یہ مسئلہ حضور ﷺ کی سنت سے لیا ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔ انہوں نے فرمایا کیا تم نے حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے لیا ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔ انہوں نے فرمایا پھر کس سے لیا ہے؟ ہم نے کہا ہم نے اپنی رائے سے اسے بتایا ہے۔ انہوں نے فرمایا اسی وجہ سے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ پھر اس آدمی کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا ذرا یہ بتاؤ کہ پیشاب کے بعد جب منی نکلتی ہے تو کیا اس وقت تمہارے دل میں شہوت ہوتی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا کیا اس کے نکلنے کے بعد تم اپنے جسم میں سستی محسوس کرتے ہو؟ اس نے کہا نہیں فرمایا یہ منی معدہ کی خرابی کی وجہ سے نکلتی ہے، لہٰذا تمہارے لئے وضو کافی ہے۔

(کنز العمال، ۵/ ۱۱۸ و حیاۃ الصحابہ، ۳/ ۱۹۰)

ابن عباس رضی اللہ عنہما تشہد سیکھتے ہیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے التحیات سکھائی اور ارشاد فرمایا کہ حضور ﷺ نے بھی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں التحیات سکھائی تھی:

التحیات للہ والصلوات والطیبات المبارکٰت للہ

(کنز العمال، ۴/ ۲۱۷۔ حیاۃ الصحابہ، ۳/ ۲۰۵)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی علمی شان

حضرت ابو صالح کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایسی

زبردست مجلس دیکھی ہے کہ سارے قریش والے اس پر فخر کریں تو بجا ہے۔ یہ واقعی قابل فخر مجلس ہے میں نے ایک دن دیکھا کہ بہت سے لوگ ان کے گھر کے باہر راستہ پر جمع ہیں اور اتنے زیادہ ہیں کہ آنے جانے کی بالکل جگہ نہیں ہے۔ میں نے اندر جا کر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بتایا کہ دروازے پر بہت سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا میرے لئے وضو کا پانی رکھو چنانچہ وہ وضو کر کے بیٹھ گئے اور فرمایا باہر جاؤ اور لوگوں میں اعلان کرو کہ جو قرآن اور اس کے حروف اور اس کی کسی چیز کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہے وہ اندر آجائے، چنانچہ میں نے باہر جا کر یہ اعلان کیا تو ایک بہت بڑی تعداد اندر آئی جس سے سارا گھر حجرہ بھر گیا اور انہوں نے جو بات بھی پوچھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا جواب دیا اور جتنا انہوں نے پوچھا اتنا بلکہ اس سے کہیں اور زیادہ اپنے پاس سے انہیں بتایا پھر فرمایا اب اپنے دوسرے بھائیوں کو اندر آنے کا موقع دے دو چنانچہ وہ باہر چلے گئے پھر مجھ سے فرمایا باہر جا کر اب یہ اعلان کرو کہ جو قرآن کی تفسیر اور شرح کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہے وہ اندر آجائے، چنانچہ میں نے باہر جا کر یہ اعلان کیا تو ایک بہت بڑی تعداد اندر آئی جس سے سارا گھر اور حجرہ بھر گیا اور انہوں نے جو بات بھی پوچھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا جواب دیا اور جتنا ان لوگوں نے پوچھا اتنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اپنے پاس سے بیان کر دیا پھر فرمایا اب اپنے دوسرے بھائیوں کو اندر آنے کا موقع دے دو چنانچہ وہ لوگ چلے گئے پھر مجھ سے فرمایا باہر جا کر اعلان کر دو کہ جو حلال حرام اور فقہی مسائل پوچھنا چاہتا ہے وہ اندر آجائے، حسب معمول یہ لوگ بھی اتنی بڑی تعداد میں آئے کہ سارا گھر بھر گیا، ان کے سوالات سے بڑھ کر جواب دینے کے بعد آپ نے ان سب کو رخصت ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ یہ لوگ باہر چلے گئے پھر مجھ سے فرمایا باہر جا کر یہ اعلان کر دو کہ جو میراث وغیرہ جیسے مسائل پوچھنا چاہتا ہے وہ اندر آجائے چنانچہ میں نے باہر جا کر یہ اعلان کر دیا تو بہت بڑی تعداد اندر آئی جس سے سارا گھر اور حجرہ بھر گیا اور ان لوگوں نے جو بھی پوچھا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا جواب دیا اور اتنا ہی اور اپنے پاس سے بیان کر دیا پھر فرمایا اب اپنے دوسرے بھائیوں کو موقع

دے دو چنانچہ وہ لوگ باہر چلے گئے پھر مجھ سے فرمایا باہر جا کر اعلان کر دو کہ جو عربی، لغت، اشعار اور انوکھے کلام کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے وہ اندر آ جائے۔ میں نے باہر جا کر یہ اعلان کر دیا جس پر ایک بہت بڑی تعداد اندر داخل ہوئی جس سے سارا گھر اور حجرہ بھر گیا اور ان لوگوں نے جو بات بھی پوچھی اس کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا اور اتنا ہی مزید اپنے پاس سے بیان کر دیا۔ اگر سارے قریش حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس مجلس پر فخر کریں تو انہیں فخر کرنے کا حق پہنچتا ہے اور میں نے اس جیسا منظر اور کسی کے ہاں نہیں دیکھا۔ (حلیۃ الاولیاء، ۱/۳۲۰)

تم نبوت کے گھرانے سے بولتے ہو

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے مجھ سے ایک مسئلہ پوچھا جو انہیں یمن سے حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا۔ میں نے انہیں اس کا جواب دیا تو فرمایا میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ تم نبوت کے گھرانے سے بولتے ہو۔ (طبقات ابن سعد، ۲/۱۸۴)

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی علمی صفات

حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کئی عمدہ صفات کی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تمام لوگوں پر فوقیت رکھتے تھے وہ گزشتہ علوم کو خوب جانتے تھے اور جب ان کے مشورے کی ضرورت ہوتی تو بہت سمجھداری کا مشورہ دیتے اور بردباری اور جود و سخا ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں نے کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جو ان سے زیادہ حضور ﷺ کی حدیثوں کو اور حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے فیصلوں کو جاننے والا ہو اور ان سے زیادہ سمجھداری کی رائے والا ہو اور اشعار کو عربی لغت کو، قرآن کی تفسیر کو، حساب اور میراث کو اور گزشتہ واقعات کو ان سے زیادہ جاننے والا ہو اور ان سے زیادہ درست رائے والا ہو کسی دن وہ اپنی مجلس میں بیٹھتے تو صرف دین کی سمجھ کے بارے میں بات کرتے اور کسی دن صرف قرآن کی تفسیر

کے بارے میں بات کرتے اور کسی دن صرف حضور ﷺ کے غزوات کے بارے میں بات کرتے اور کسی دن اشعار کے بارے میں اور کسی دن عرب لڑائیوں کے بارے میں بات کرتے اور میں نے یہی دیکھا کہ جو عالم بھی ان کی مجلس میں آیا وہ آخر کار ان (کی علمی عظمت) کے سامنے ضرور جھک گیا اور جو بھی ان سے کچھ پوچھنے آیا ان سے انسے اپنے سوال کا جواب ضرور ملا۔ (طبقات ابن سعد، ۴/۱۸۲)

دنیا نے مجھے کھو کے بہت ہاتھ ملے ہیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں حضور ﷺ کے مہاجر اور انصاری بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہر وقت رہا کرتا تھا اور میں ان سے حضور ﷺ کے غزوات کے بارے میں اور ان غزوات کے متعلق اترنے والے قرآن کے بارے میں خوب سوالات کرتا تھا اور میں ان میں سے جس کے پاس جاتا وہ میرے آنے سے بہت خوش ہوتا کیونکہ میں حضور ﷺ کا رشتہ دار (چچازاد بھائی) تھا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مضبوط اور پختہ علم والوں میں سے تھے۔ میں نے ان سے ایک دن مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا مدینہ میں ستائیس سورتیں نازل ہوئیں اور باقی ستاسی سورتوں کا نزول مکہ میں ہوا۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کو فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ گزرے ہوئے علوم اور واقعات کو ہم سب سے زیادہ جاننے والے ہیں اور جو نیا مسئلہ پیش آجائے اور اس کے بارے میں قرآن و حدیث میں کچھ نہ آیا ہو اس کے متعلق وہ سب سے زیادہ دینی سمجھ رکھنے والے ہیں۔ حضرت عکرمہ کہتے ہیں میں نے یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بتائی تو انہوں نے فرمایا حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما پوچھا کرتے تھے (یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ان کے فضائل کا اعتراف فرما رہے ہیں)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حج کی راتوں میں دیکھا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اردگرد بہت سے حلقے ہیں اور ان سے مناسک حج کے بارے میں لوگ

خوب پوچھ رہے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اب جتنے صحابہ باقی رہ گئے ہیں یہ ان میں سب سے زیادہ مناسک حج کو جاننے والے ہیں۔

حضرت یعقوب بن زید رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے انتقال کی خبر ملی تو انہوں نے ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا اور فرمایا لوگوں میں سب سے زیادہ علم والے اور سب سے زیادہ بردبار انسان کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے انتقال سے امت کا ایسا نقصان ہوا ہے جس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکے گی۔

حضرت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا انتقال ہوا تو حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے فرمایا آج اس شخصیت کا انتقال ہو گیا جس کے علم کے مشرق سے لے کر مغرب تک کے تمام لوگ محتاج تھے۔

حضرت ابوکلثوم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دفن ہو گئے تو حضرت ابن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آج اس امت کے عالم ربانی کا انتقال ہو گیا۔

(حیاۃ الصحابہ، ۳/۲۹۳)

ابن عباس رضی اللہ عنہما پر اکابر کا اعتماد

حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بلایا کرتے تھے اور بدر والوں کے ساتھ ان سے بھی مشورہ کیا کرتے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے سے آخر دم تک فتوی کا کام انجام دیتے رہے۔

حضرت یعقوب بن زید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب بھی کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مشورہ لیتے اور فرماتے اے غوطہ لگانے والے! (یعنی ہر معاملہ کی گہرائی تک پہنچنے والے) غوطہ لگاؤ (اور اس اہم مسئلہ میں اچھی طرح سوچ کر اپنی رائے پیش کرو)

حضرت سعد بن ابن وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا کوئی آدمی

نہیں دیکھا جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے زیادہ حاضر دماغ، زیادہ عقلمند، زیادہ علم والا اور زیادہ بردبار ہو۔ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے کہ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو پیچیدہ اور مشکل مسائل کے پیش آنے پر بلاتے اور فرماتے یہ ایک پیچیدہ مسئلہ تمہارے سامنے ہے۔ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مشورے پر عمل کرتے حالانکہ ان کے چاروں طرف بدری حضرات مہاجرین وانصار کا مجمع ہوتا۔

حضرت ابن شہاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی مسئلہ پیش آتا تو آپ نوجوانوں کو بلاتے اور ان کی عقل وسمجھ کی تیزی کو اختیار کرتے ہوئے ان سے مشورہ لیتے۔

امام بیہقی نے حضرت ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مزاج مشورہ کر کے چلنے کا تھا چنانچہ بعض دفعہ مستورات سے بھی مشورہ لے لیا کرتے اور ان مستورات کی رائے میں ان کو کوئی بات اچھی نظر آتی تو اس پر عمل کر لیتے۔ (کنز العمال، ۲/۱۶۳)

ٹھہرے گا کبھی دل کہ دھڑکتا ہی رہے گا

۶۸ھ میں پیمانہ حیات لبریز ہو گیا، ایک روز سخت بیمار ہوئے، بستر علالت کے اردگرد احباب ومستفیدین کا ہجوم تھا، آپ نے فرمایا:

''میں ایک ایسی جماعت میں دم توڑوں گا جو روئے زمین پر خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب، مشرف ومقرب ہے، اس لئے اگر میں تم لوگوں میں مروں تو یقیناً تم ہی وہ بہتر جماعت ہو۔''

غرض ہفت روزہ علالت کے بعد طائر روح نے قفس عنصری چھوڑا۔ محمد بن حنفیہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور سپرد خاک کر کے کہا:

''خدا کی قسم! آج دنیا سے حبر امت اٹھ گیا۔''

غیب سے ندا آئی......

یاایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة

''اے نفس مطمئنہ! اپنے خدا کی طرف خوشی خوشی لوٹ آ'' (الاصابہ، ۲/۹۴)

جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا انتقال ہو گیا تو ایک دن حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ رحمہم اللہ لوگوں سے مخاطب ہوئے اور ارشاد فرمایا:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی وفات سے لوگ بہت بڑے علمی سرمایہ سے محروم ہو گئے، ایسے علم سے دور ہو گئے جو ان سے پہلے کسی کو نہیں ملا...... ایسے فقیہ سے محروم ہو گئے کہ ان کی رائے کی طرف ہر ایک کی احتیاج تھی...... لوگ خوابوں کی تعبیر کے علم...... انساب کے علم...... اور تفسیر کے علم سے محروم ہو گئے، میں نے ان سے بڑا حدیث رسول ﷺ کو جاننے والا نہیں دیکھا...... میں نے ان سے بڑا قاضی اور فقیہ نہیں دیکھا...... میں نے ان سے بڑا عالم اشعار و عربیت نہیں دیکھا...... میں نے ان سے بڑا مفسر قرآن نہیں دیکھا...... میں نے علم حساب اور علم میراث میں ان سے بڑا عالم کسی کو نہ پایا...... ان سے زیادہ عمدہ اور مضبوط رائے میرے خیال میں کسی کی نہیں...... وہ ایک دن اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوتے اور صرف فقہ کے مسائل کو بیان فرماتے، ایک دن صرف تفسیر کے مسائل کو بیان فرماتے، ایک دن صرف مغازی کو بیان فرماتے ایک دن صرف اشعار کا تذکرہ کرتے، ایک دن کو عربوں کے حالات کے لئے خاص کرتے، ان کے شاگرد ان کے سامنے جس عاجزی سے بیٹھتے تھے اس کی مثال ملنا مشکل ہے، سوال کرنے والا آپ سے جس چیز کے بارے میں بھی سوال کرتا آپ کے پاس اس کا جواب موجود پاتا'' (اسد الغابہ، ۳/۱۹۳)

دیوانے گزر جائیں گے ہر منزل غم سے
حیرت سے زمانہ انہیں تکتا ہی رہے گا
آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا
کیا ختم نہ ہوگا کبھی ہنگامۂ ہستی؟
ٹھہرے گا کبھی دل کہ دھڑکتا ہی رہے گا

حضرت امام عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

آپ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کے سگے بھائی تھے اور اہل مدینہ کے بڑے مفتی حضور ﷺ کے بعد ساٹھ سال تک زندہ رہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں ان سے آپ ﷺ کی اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ تھی، حضرت سلیمان بن یسار کہتے ہیں میں نے تحصیل علم کے لیے اپنا وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ عباس رضی اللہ عنہما کے درمیان برابر تقسیم کر رکھا تھا۔ امام محمد باقر فرماتے ہیں میں نے صحابہ رضی اللہ عنہم میں حدیث روایت کرنے میں ان سے بڑھ کر کسی کو خدا سے ڈرنے والا نہیں پایا، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد حنفیہ انہیں مفکر اسلام کہتے تھے امام زہری کہتے ہیں میں کسی کی رائے کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے کے برابر نہیں سمجھتا اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں اہل الرائے قدر سے دیکھے جاتے تھے اور اہل الرائے ہونا کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ نیکی میں یہ عالم تھا کہ مشہور تابعی حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اگر کسی کے جنتی ہونے کی بشارت دے سکتا ہوں تو وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ (تذکرہ ج ا ص ۵۰)

> آپ قرآن، تفسیر حدیث، فقہ وغیرہ تمام مذہبی علوم کے بحرِ بے کراں
> تھے آپ کا شمار علمائے مدینہ کے اسی زمرے میں تھا جو علم وعمل کا
> مجمع البحرین سمجھے گئے تھے۔ (سیر الصحابہ ج ۳ ص ۵۰)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی علمی بصیرت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں اختلاف چلے اور کسی تیسرے فرد کو چننے کی تجویز سامنے آئی تو آپ (حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ) نے فرمایا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سوا کسی کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتا مگر آپ نے انکار فرمادیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے بجز عبداللہ ہم نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جسے دنیا نے اپنی طرف مائل کیا ہو، اور وہ اس کی طرف مائل نہ ہوا ہو۔ ایمانی

جرأت اس درجے کی تھی ظالم کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی تردید کر دیتے تھے اور اس کو سامنے دم مارنے کی جرأت نہ ہوتی تھی جنگ بدر اور احد میں آپ کو صغرسنی کی بناء پر جنگ میں شرکت کی اجازت نہ ملی پھر آپ نے جنگ خندق میں شرکت کی اور بیعت رضوان میں بھی حلف وفاداری اٹھایا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔

''بے شمار خوبیوں کے مالک تھے آنحضرت ﷺ نے ان کی تعریف کی ہے اور ان کی نیکوکاری اور صلاحیت کی شہادت دی ہے''۔ (تذکرہ ج ۱ص ۵۱)

جنگ خیبر غزوۂ حنین اور محاصرہ طائف میں بھی پیش پیش رہے، حجۃ الوداع میں بھی یہ آپ کے ساتھ تھے ۷۳ھ میں ۸۴ برس کی عمر میں وفات پائی۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے چند فقہی مسائل

آپ کے ہاں ماخذ شریعت یہ تھے:

اگر آپ کو کتاب وسنت میں کوئی مسئلہ نہ ملتا تو اجتہاد فرماتے لیکن بتا دیتے کہ یہ میری رائے ہے حافظ ابن قیم کہتے ہیں:

کبھی پوچھ بھی لیتے کہ اگر کہو تو قیاس سے بتلا دوں۔

(اعلام الموقعین ج ۱ص ۶۷)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قیاس اور اجتہاد کے قائل تھے اور قرآن وحدیث کے بعد فقہ کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

مشہور تابعی امام مجاہد (۱۰۰ھ) آپ کے شاگرد ہیں۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ آپ نماز میں رکوع کرتے رفع یدین نہ کرتے تھے:

عن مجاهد قال صليت خلف ابن عمر فلم يكن يرفع يديه الافى التكبيرة الاولىٰ من الصلوٰة (طحاوی شریف ج ۱ ص ۱۱۰، المصنف ج ۱ص ۲۱۴)

باوجود آنحضرت ﷺ سے رکوع کے وقت رفع یدین کرنے کی حدیث

نقل کرتے ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا مسلک یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے کوئی کام کسی دور میں بھی کیا ہو تو اسے آگے روایت کر دینا چاہیے۔سنت اس کے مطابق آ رہی ہو یا نہ، مسائل کی تاریخ اسی طرح مرتب ہوئی ہے بلکہ آپ خود بھی رکوع کے وقت کبھی رفع یدین کر لیتے تھے۔

نوٹ: آپ کی حضور ﷺ سے رکوع کے وقت رفع یدین کرنے کی روایت صحیح بخاری میں موجود ہے اس کے ایک راوی حضرت امام مالک ہیں آپ نے اپنے موطا میں اس حدیث کو لکھتے وقت رکوع کے وقت رفع یدین کرنا ذکر نہیں کیا۔اور خود آپ کا مسلک بھی رکوع کے وقت رفع یدین کرنے کا نہ تھا۔سو امام بخاری کی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت رفع الیدین عند الرکوع امت کے لیے دعوت عمل نہیں ہے کیونکہ اس کے کئی راویوں کا خود اس پر عمل نہیں رہا ہے یہ آپ کے عمل کی ایک تاریخ ہے جو آپ نے ذکر کر دی۔

۳۔فجر کی جماعت کھڑی ہو تو آپ اس وقت صبح کی سنتیں پڑھنا جائز سمجھتے تھے اور پھر جماعت میں شامل ہو جاتے اس طرح سنتیں پڑھنے کو آپ ناجائز نہ سمجھتے تھے۔ حضرت نافع کہتے ہیں۔

ایقظت ابن عمر لصلوٰة الفجر وقد اقیمت الصلوٰة فقام وصلی رکعتین:. (طحاوی ج ا)

میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو صبح کی نماز کے لیے جگایا اور جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور آپ اٹھے اور دو رکعت سنت پڑھیں۔

۴۔آپ قرأت خلف الامام نہ کرتے تھے آپ نے فرمایا:

من صلی وراء الامام کفاہ قراۃ الامام (سنن کبریٰ امام بیہقی ج ا)

جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی اسے امام کی قرأت کافی ہو جاتی ہے۔

آپ کے شاگرد امام نافع کہتے ہیں جب آپ سے پوچھا جاتا۔ **ھل یقرأ احد خلف الامام** (کیا کوئی امام کے پیچھے قرآن پڑھے کیا اس کی اجازت ہے) تو آپ

فرماتے:

اذاصلیٰ احد کم خلف الامام فحسبه قرأة الامام واذا صلی وحده فلیقرأ (موطاامام مالک ص ۳۱، موطاامام محمد ص ۹۵)

جب امام کے پیچھے پڑھو تو مقتدی کو امام کا پڑھنا کافی ہے اور جب کوئی اکیلے پڑھے تو خود قرأت کرے۔

حضرت نافع مزید کہتے ہیں آپ خود امام کے پیچھے قرآن (سورۃ فاتحہ اور سورت) نہ پڑھتے تھے آپ فرماتے تھے۔

اذا ادرکت الامام راکعافرکعت قبل ان یرفع فقد ادرکت (المصنف لعبدالرزاق ج۲ص ۲۷۹)

جب تم امام کو رکوع کی حالت میں پالو اور امام کے اُٹھنے سے پہلے رکوع کر چکے تو تم نے رکعت پالی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بحیثیت فقیہ

حدیث کے بعد فقہ کا درجہ ہے کہ اسی پر تشریع اسلامی کا دارومدار ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو تفقہ فی الدین میں درجہ کمال حاصل تھا، آپ کی ساری عمر علم وافتاء میں بسر ہوئی۔ مدینہ کے ان مشہور صاحب فتاویٰ صحابہ رضی اللہ عنہم میں جن کے فتاویٰ کے تعداد سب سے زیادہ ہے ایک ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے، فقہ مالکی جو ائمہ اربعہ میں سے ایک امام امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ ہے، اس کا تمام تر دارومدار حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ پر ہے اس بناپر امام مالک فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ائمہ دین میں تھے، ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ جمع کیے جائیں تو ضخیم جلد تیار ہوسکتی ہے، کبار کی رائے ہے کہ تنہا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اقوال، اسلامی مسائل کے حل کے لئے کافی ہیں۔

فتویٰ دینے میں احتیاط

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فتویٰ دینے میں بہت احتیاط برتتے تھے، ایک دن

کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم، جب وہ آدمی واپس جانے لگا تو کہنے لگا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کیا خوب آدمی ہیں کہ ان سے مسئلہ پوچھا گیا تو جواب میں انہوں نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔

اس طرح ایک آدمی آپ رضی اللہ عنہ سے فتویٰ لینے کے لیے آیا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے لاعلمی کا اظہار کیا پھر اہل مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا تم مجھے جہنم کا پل بنانا چاہتے ہو کہ تم یہ کہہ سکو کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایسا فتویٰ دیا تھا۔ (اصابہ ج۴ص ۱۰۹)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آثار رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں بہت حریص اور فتاویٰ کے سلسلہ میں انتہائی محتاط و متورع تھے۔ آپ کثرت سے حج و عمرہ کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ حج کے مواقع اور افعال خوب جانتے تھے۔

کسی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے آکر کہا کہ فلاں انصاری شخص فوت ہو گیا ہے آپ نے کہا رحمہ اللہ یعنی اللہ اس پر رحم فرمائے پھر کسی نے کہا کہ اس نے ایک لاکھ درہم ترکہ میں چھوڑے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ تو ان دراہم کو چھوڑ گیا لیکن ان دراہم نے ان کو نہیں چھوڑا۔

آپ فتاوی دینے میں بہت محتاط تھے جب تک کسی مسئلہ کے متعلق پورا یقین نہ ہوتا فتوی نہ دیتے، حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب میں لکھا ہے وہ اپنے فتاوی اور اعمال میں نہایت سخت محتاط تھے اور خوب سوچ سمجھ کر کہنے والے اور کرنے والے تھے۔

اگر کوئی مسئلہ علم میں نہ ہوتا تو نہایت صفائی کے ساتھ اپنی لاعلمی ظاہر کر دیتے۔ ایک مرتبہ کسی نے مسئلہ پوچھا آپ کو علم نہ تھا فرمایا ''مجھے نہیں معلوم'' اس کو ان کی صاف بیانی پر تعجب ہوا کہنے لگا ''ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی خوب آدمی ہیں جو چیز معلوم نہ تھی اس سے صاف لاعلمی ظاہر کر دی''۔

عقبہ بن مسلم کا بیان ہے کہ ایک شخص نے آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، فرمایا مجھ کو معلوم نہیں، تم میری پیٹھ کو جہنم کا پل بنانا چاہتے ہو کہ تم یہ کہہ سکو کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھ کو ایسا فتوی دیا تھا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کو آپ کا یہ طرز عمل تعجب انگیز معلوم ہوتا تھا فرمایا کرتے تھے کہ ''مجھ کو ابن عمر رضی اللہ عنہما پر تعجب آتا ہے کہ جس چیز میں ان کو ذرا بھی شک ہوتا ہے خاموش رہتے ہیں اور فتویٰ طلب کرنے والے کو لوٹا دیتے ہیں۔ اگر کبھی فتویٰ دینے کے بعد غلطی معلوم ہوتی تو بلا پس وپیش پہلے فتوی سے رجوع کر لیتے مستفتی کو صحیح فتوی سے آگاہ کر دیتے۔

ایک مرتبہ عبدالرحمٰن بن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آبی مردار کے متعلق استفتاء کیا کہ اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں آپ نے ناجائز بتایا بعد میں قرآن منگا کر دیکھا تو یہ حکم ملا، احل لکم صید البحر وطعامه، چنانچہ انہوں نے عبدالرحمٰن کے پاس کہلا بھیجا کہ ''اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں'' دوسرے عالم مفتیوں کو بھی اپنی رائے وقیاس سے فتوی دینے سے منع فرماتے تھے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ بصرہ کے مفتی تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما ان سے ملے تو پہلی ہدایت یہ فرمائی کہ ''تم بصرہ کے مفتی ہو، تم سے فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے بغیر فتوی نہ دیا کرو آپ کے نزدیک کتاب اللہ اور سنت اللہ کے علاوہ کوئی تیسری قسم تھی ہی نہیں۔ (اعلام الموقعین، ۶۷/۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی فراست وحاضر جوابی

ایک مرتبہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا:

''نماز میں مقیم کی نماز کا بھی ذکر ہے اور خوف کی نماز کا بھی لیکن کہیں بھی مسافر کی نماز کا ذکر نہیں ہے؟''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''برادر زادہ: اللہ جل شانہ نے حضور ﷺ کو نبی بنا کر بھیجا۔ ہم لوگ انجان تھے کچھ نہیں جانتے تھے، بس جو ہم نے ان کو کرتے دیکھا وہ کریں گے''۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس کلام کا منشا یہ تھا کہ ہر مسئلہ کا صراحۃً قرآن مجید میں ہونا ضروری نہیں۔ عمل کے لئے حضور اقدس ﷺ سے ثابت ہو جانا کافی ہے۔

(فضائل اعمال، ص ۱۲۱)

مجلس شوریٰ

جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اصرار کیا کہ آپ رضی اللہ عنہ خود ہی اپنا جانشین مقرر فرمادیں (اس پر) آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا میں ہر حالت میں تمہارا بوجھ اٹھاؤں، میں چاہتا ہوں کہ میرا حصہ برابر ہو۔ اگر میں جانشین بناؤں (تو یہ بھی درست ہے) کیونکہ جو مجھ سے افضل تھے یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انہوں نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور اگر میں ایسا نہ کروں (تو یہ بھی صحیح ہے) کیونکہ جو مجھ سے زیادہ افضل و برتر تھے یعنی رسول اللہ ﷺ انہوں نے اپنا جانشین مقرر نہیں کیا، اللہ ہی اپنے دین کا محافظ ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ وہ اپنے بعد خلافت کے معاملہ کو چھ افراد کے سپرد کردیں جن سے رسول اکرم ﷺ راضی اور خوش تھے، جو یہ ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب کو جمع کیا اور فرمایا: ''میں نے خوب غور کرنے کے بعد تم کو قائد پایا ہے۔ اب یہ امر خلافت تمہارے حوالہ ہو گا، رسول اللہ ﷺ آخر زندگی تک تم سب سے راضی رہے اور مجھے بھی تم پر کسی بات کا ڈر نہیں ہے جب تک تم استقامت دکھاؤ، لہٰذا میری وفات کے بعد تم تین دن تک مشاورت کرنا اور چوتھا دن تم پر نہ آئے مگر تم سے کوئی ایک امیر ضرور بن جائے، اور تمہارے ساتھ بطور مشیر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ہوں گے لیکن اس امر خلافت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے قبل خلافت کی یہ عظیم امانت چھ افراد کی مجلس شوریٰ کے سپرد کردی۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عہدہ قضاء کی پیش کش کو ٹھکرانا

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت عبداللہ بن عمر

رضی اللہ عنہما کا علمی مقام و رتبہ نمایاں ہوا، لوگ آپ رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرنے لگے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ابن عمر رضی اللہ عنہ جوان تھے لوگوں نے ان کی پیروی نہ کی اور جب بوڑھے ہوگئے تو ان کی اقتداء اور پیروی کرنے لگے۔

بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وفات کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا علمی مقام و مرتبہ لوگوں کے سامنے آنے لگا حتی کہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم اہل فتویٰ تھے جیسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ ان میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی شامل ہوگئے۔

خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر بڑا اعتماد تھا، ایک دن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے عہد قضاء کی پیش کش کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کیا کرو، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں دو آدمیوں کے درمیان بھی فیصلہ نہیں کروں گا اور نہ ہی دو آدمیوں کی امامت کروں گا، حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تم میری نافرمانی کررہے ہو؟ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نافرمانی نہیں کررہا ہوں بلکہ بات اصل یہ ہے کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ قاضی تین طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو جہالت سے فیصلہ کرے وہ دوزخی ہے، دوسرا وہ جو ڈرتا ہو اور خواہشات اس کو راغب کریں وہ بھی جہنمی ہے اور تیسرا وہ ہے جو اجتہاد کرتا ہے اور اس کا اجتہاد درست ثابت ہوتا ہے پس وہ برابر ہے کہ اس کے لیے نہ اجر ہے اور نہ گناہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے والد تو قاضی تھے فیصلے کیا کرتے تھے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یقیناً میرے والد فیصلے کرتے تھے لیکن جب کوئی مشکل آن پڑتی تو رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیتے تھے اور جب آنحضور ﷺ کو مشکل پیش آتی تو آپ ﷺ جبریل علیہ السلام سے پوچھ لیتے تھے میں ایسا کوئی آدمی نہیں پاتا کہ مشکل وقت میں اس سے پوچھ سکوں میں کس کو پوچھوں؟ خلیفہ ثالث نے فرمایا کہ ہاں بالکل ایسا ہی ہے،

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ”تو پھر میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ آپ مجھے عامل (گورنر) بنائیں۔ چنانچہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے ان کے عذر کو قبول کیا اور فرمایا کہ اس کی کسی کو خبر نہ دینا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ کسی کو اس کی خبر نہ دیں گے۔

غور کیجئے! قضاء کا منصب ایک اعلیٰ حکومتی عہدہ ہوتا ہے اس کا معاشرہ میں بھی بڑا مقام اور اثر و رسوخ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس منصب کو ٹھکرا دیا، امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس بات کو جانتے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی علمی شان و عظمت موجود ہے مگر ملکی انتظام سے اس کنارہ کشی کے باوجود جہاد فی سبیل اللہ میں برابر شریک ہوتے رہے، چنانچہ ۲۷ھ میں افریقیہ (تیونس، الجزائر، مراکش) کی مہم میں شریک تھے۔ (فتوح البلدان ص ۲۳۴)

پھر ۳۰ھ میں خراسان اور طبرستان کے معرکوں میں حضرت سعید بن العاص کے ہمرکاب رہے۔ (تاریخ ابن اثیر ج ۳ ص ۸۴)

جب فتنہ و فساد کا آغاز ہوا تو بالکل کنارہ کش ہو گئے، اس احتیاط کی بناء پر خلافت جیسے اعزاز سے بھی انکار کر دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگوں نے آپ رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ آپ رضی اللہ عنہ امیر ابن امیر ہیں ہم سب آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو آمادہ ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جہاں تک میرے امکان میں ہے میں اپنے لیے ایک پچھنے کے برابر بھی خون نہ بہنے دوں گا، لوگوں نے دھمکی دی کہ اگر آپ اس بارگراں کو نہیں سنبھالیں گے تو ہم آپ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیں گے لیکن انہوں نے اس دھمکی کی مطلق پرواہ نہ کی اور خلافت جیسے بلند اعزاز سے خود کو بچائے رکھا۔ (طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۱۱۱)

ازواج و اولاد

آپ رضی اللہ عنہ کی متعدد بیویاں تھیں جن سے بارہ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں، ابوبکر، ابوعبیدہ، واقد، عبداللہ، عمر، حفصہ اور سودہ صفیہ بنت ابی عبیدہ کے بطن سے تھے،

عبدالرحمٰن، ام علقمہ بنت علقمہ کے بطن سے تھے۔

سفرِ آخرت

۷۴ھ میں جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حج کے لئے تشریف لے گئے تو ایک شخص کے نیزہ کی نوک جو زہر میں بجھی ہوئی تھی ان کے پاؤں میں چبھ گئی۔ یہ زہر ان کے جسم میں سرایت کر گیا اور یہی زخم ان کی وفات کا باعث ہوا۔

عام مورخین کا خیال ہے کہ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا بلکہ حجاج کے اشارہ سے آپ کو زخمی کیا گیا تھا۔ البتہ اس کی تفصیل میں اختلاف ہے۔

مستدرک الحاکم کی یہ روایت ہے کہ حجاج نے جب خانہ کعبہ میں منجنیق نصب کروائی اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو شہید کرایا تو اس کا یہ فعل شنیع ابن عمر رضی اللہ عنہما کو سخت ناپسند ہوا۔

آپ نے اس کو بہت بُرا بھلا کہا، حجاج غضبناک ہو گیا اور اس کے اشارے سے شامیوں نے زخمی کر دیا۔ (مستدرک حاکم ۳/۵۵۷)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہی کہ عبدالملک نے حجاج کو ہدایت کی تھی کہ وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مخالفت نہ کرے یہ حکم اس پر بہت شاق گذرا، لیکن حکم عدولی بھی نہیں کر سکتا تھا، اس لئے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور آپ کو زخمی کرا دیا۔ (تہذیب التہذیب، ۵/۳۳۰)

طبقات ابن سعد کی روایت کچھ اس طرح ہے:

> ”اس مرتبہ حجاج خطبہ دے رہا تھا، اس میں اس نے ابن زبیر رضی اللہ عنہما پر اتہام لگایا کہ انہوں نے نعوذ باللہ کلام اللہ میں تحریف کی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کی تردید کی اور فرمایا تو جھوٹ بولتا ہے نہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما میں اتنی طاقت ہے نہ تجھ میں یہ مجال ہے مجمع عام کے سامنے ان کی یہ ڈانٹ اس کو بہت ناگوار ہوئی، لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ علانیہ کوئی بُرا برتاؤ نہیں کر سکتا تھا اس لیے خفیہ انتقام لیا“۔ (طبقات ابن سعد، تذکرہ ابن عمر)

ابن خلکان اور اسد الغابۃ میں اس کے علاوہ اور روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ایک یہ کہ ایک دن حجاج خطبہ دے رہا تھا، اس کو اس قدر طول دیا کہ عصر کا وقت ہوگیا، آپ نے فرمایا کہ آفتاب تیرا انتظار نہیں کرسکتا۔حجاج نے کہا ''جی میں آتا ہے کہ تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں'' فرمایا ''تجھ کو تاہ بین سے کچھ بعید نہیں''۔

دوسری روایت میں ہے کہ عبدالملک نے فرمان جاری کیا کہ تمام حجاج مناسک حج میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کریں۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ عرفات اور دوسرے مواقف سے حجاج بن یوسف کا انتظار کیئے بغیر بڑھ جاتے تھے۔حجاج کی فرعونیت کیا اس کو گوارہ کرتی مگر عبدالملک کے حکم سے مجبور تھا۔اس لئے آپ کی جان کا خواہاں ہوگیا۔ (ابن خلکان،۱/۲۴۲واسد الغابۃ،۳/۲۳۰)

اگرچہ ان روایتوں کی صورت واقعہ میں اختلاف ہے مگر تضاد نہیں، اس لئے ان میں سے کسی کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔ہوسکتا ہے کہ یہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے پیش آتے رہے مگر حجاج ضبط کرتا رہا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے اس کی نہیں چلتی اور وہ اس کو مطلق دھیان میں نہیں لاتے تو اخیر میں آپ کا قصہ ختم کردینے کا فیصلہ کرلیا، لیکن علی الاعلان وہ آپ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔اس لئے یہ صورت نکالی کہ اپنے آدمیوں میں سے کسی کو حکم دیا کہ وہ حج کے موقع پر جب لوگوں کا ازدحام ہوتا ہے زہر آلود نیزہ سے آپ کے پاؤں میں خراش دے دیں اس ازدحام میں زخمی کرنے والا گرفتار بھی نہ ہوسکے گا اور زہر کے اثر سے آپ کی موت بھی واقع ہوجائے گی، چنانچہ تقدیر الٰہی میں یہی لکھا تھا۔

جب آپ بیمار ہوئے تو حجاج عیادت کے لئے آیا اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ کاش مجھے ملزم کا پتہ چل جاتا تو میں اس کی گردن اڑا دیتا۔آپ نے فرمایا ''تم ہی نے یہ سب کیا اور پھر کہتے ہو کہ میں مجرم کو قتل کردیتا۔نہ تم حرم میں اسلحہ باندھنے کی اجازت دیتے نہ واقعہ پیش آتا۔یہ سن کر وہ خاموش ہوگیا۔

ہر لب پہ یہ سوال ہیں ان کا جواب دو

غارت گرانِ خون شہیداں جواب دو

(مستدرک حاکم، ۳/۵۵)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو مدینہ منورہ میں وفات پانے کی بہت تمنا تھی، چنانچہ جب آپ کی حالت نازک ہوئی تو دعا کرتے تھے کہ خدایا! مجھ کو مکہ میں موت نہ دے۔ آپ نے اپنے صاحبزادے سالم کو وصیت کی کہ اگر میں مکہ ہی میں مرجاؤں تو حدودِ حرم کے باہر دفن کرنا کیونکہ جس زمین سے ہجرت کی ہے اسی کی پیوند خاک ہوتے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ وصیت کے چند دنوں بعد سفرِ آخرت کیا اور علم وعمل اور اتباعِ سنت کا یہ آفتابِ تاباں ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگیا۔

ایک طوفان طلب روح میں پیدا کرکے
چھپ گئے آپ کہاں؟ حشر یہ برپا کرکے
اجنبی میں ہوں زمانے سے زمانہ مجھ سے
عشق نے چھوڑ دیا ہے مجھے تنہا کرکے

وفات کے بعد وصیت کے مطابق لوگوں نے حرم کے باہر دفن کرنا چاہا مگر حجاج نے مداخلت کرکے خود ہی نماز جنازہ پڑھائی اور مجبوراً مہاجرین کے ''فخ'' نامی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ (ملخص از سیر الصحابہ، ۲/۱۸۱۶)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

نام ونسب

زید بن ثابت کنیت، ابوسعید، ابوخارجہ، ابوعبدالرحمٰن لقب، مقری، فرضی، کاتب الوحی، حبر الامت، قبیلہ خزرج میں سے خاندان نجار سے تعلق ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ زید بن ثابت بن ضحاک بن زید بن لوذان بن عمرو بن عبد بن عوف بن غنم بن مالک بن نجار

والدہ کا تعارف اور بچپن

والدہ کا نام نوار بنت مالک بن معاویہ بن عدی تھا جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ حضرت زید نے بچپن اپنی والدہ کی زیر تربیت گزارا اور پروان چڑھے اور نبی اکرم ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے قبل سترہ (۱۷) سورتیں حفظ کر لی تھیں۔

والد کا انتقال

انصار میں اسلام سے پہلے جو لڑائیاں ہوئی تھیں ان میں یوم بعاث سب سے زیادہ مشہور ہے آپ کے والد ثابت اسی لڑائی میں قتل ہوئے، یہ واقعہ ہجرت سے ۵ سال قبل کا ہے اس وقت آپ کی عمر چھ سال تھی۔

قبول اسلام

جب آپ گیارہ برس کے ہوئے تو اسلام کی آواز کان میں پڑی اس زمانے میں اسلام مدینے میں مسافر کی حیثیت سے تھا، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ داعی اسلام، توحید و رسالت کا وعظ کہہ رہے تھے۔ حضرت زید نے اس کم عمری میں اسلام قبول کیا۔ آپ ابتدا ہی شرک کے داغ سے پاک رہے۔

غزوات میں شرکت

ابھی حضرت زید کی عمر ۱۳ برس تھی کہ غزوہ بدر پیش آیا۔ انصار و مہاجرین کا دستہ جب میدان کارزار کو روانہ ہوا تو اس کم عمر نے بھی جانے کا پختہ عزم کرلیا اور آپ ﷺ کے سامنے بچوں کی جماعت کے ساتھ حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے کم عمری کے باعث واپس فرمادیا۔ غزوہ احد کے متعلق بھی اختلاف ہے بعض حضرات کا خیال ہے کہ غزوہ خندق جو ۵ھ میں ہوا آپ کا پہلا غزوہ تھا۔ اس وقت عمر جہاد میں شرکت کے قابل ہو چکی تھی۔ (یعنی سولہ سال) غزوہ خندق میں آپ ﷺ کے ہمراہ میدان کارزار میں موجود تھے اور خندق سے مٹی باہر لانے کی خدمت پر معمور تھے۔ آپ علیہ السلام کی نظر مبارک پڑی تو فرمایا کیسا اچھا لڑکا ہے اس غزوے میں حضرت زید کو اتفاق سے نیند آ گئی، عمارہ بن حزم نے دیکھا تو مذاقاً ان کے ہتھیار اتار لیے زید کو خبر تک نہ ہوئی آپ ﷺ پاس تھے مذاقاً فرمایا ابارقا: او نیند کے باپ اٹھ۔ اور لوگوں کو اس طرح کے مذاق سے منع بھی فرمایا۔ غزوہ تبوک میں قبیلہ نجار کا جھنڈا عمارہ بن حزم کے پاس تھا بعد میں حضور ﷺ نے عمارہ سے لے کر زید کو عنایت کیا عمارہ کے استفسار پر آپ ﷺ نے فرمایا تجھ سے زیادہ قرآن جانتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں جنگ یمامہ ہوئی جس میں آپ کو ایک تیر بھی لگا لیکن کوئی اور نقصان نہیں ہوا

عہدہ قضاء

حکومت اسلامیہ کا ایک عظیم منصب ہے۔ جو دور فاروقی رضی اللہ عنہ میں قائم ہوا (بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ایجاد ہے لیکن یہ درست نہیں۔ حضرت عمر نے اپنی خلافت کے دوران محکمہ قضاء کو وجود دے دیا تھا چنانچہ یزید بن رخت النمر کو محکمہ قضاء کے چھوٹے چھوٹے کام سپرد کیے تھے۔ (کنز العمال بحوالہ طبقات ابن سعد جلد ۳)

اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی قضاء کا کام سونپا گیا تھا۔

(کنز بحوالہ جامع عبدالرزاق ج ۳ ص ۱۷۵)

آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں اس کا مستقل وجود نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی بنیاد قائم کی اور حضرت زید کو مدینہ کا قاضی مقرر کیا ابن سعد اور اخبار القضاۃ میں درج ہے۔ ''ان عمر استعمل زید اعلیٰ القضاء و فرض لہ رزقا''یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زید کو قاضی مقرر کیا ہے اور تنخواہ بھی مقرر کی ہے۔ اس وقت تک قاضی کے لئے عدالت کی عمارت قائم نہ تھی اس لئے زید کا گھر ''دارالقضاۃ'' کا کام دیتا۔ مکان میں فرش مضبوط تھا۔ زید رضی اللہ عنہ اس کے درمیان میں فیصلہ کے لئے وقت دیتے دارالخلافت اور تمام قرب و جوار کے مقدمات آپ رضی اللہ عنہ کے پاس آتے یہاں تک کہ خود خلیفہ وقت پر بھی یہاں دعویٰ داخل کئے جاتے اور فیصلہ صادر ہوتا ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب میں کوئی بات بڑھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کی عدالت میں مقدمہ دائر ہوا۔ حضرت عمر مدعا علیہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے حضرت زید نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے اپنی جگہ خالی کردی لیکن مساوات کا جو اصول اسلام نے قائم کیا تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر نہایت شدت سے کاربند تھے۔ خاص کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اس کو بہت عام کیا اس بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید سے فرمایا یہ آپ کی پہلی ناانصافی ہے مجھ کو اپنے فریق کے سامنے بیٹھنا ہے۔ چنانچہ دونوں بزرگ عدالت کے سامنے بیٹھے۔ مقدمہ میں حضرت ابی بن کعب مدعی تھے اور عمر منکر دعویٰ تھے۔ تو زید نے ابی بن کعب سے کہا اگرچہ قاعدہ تو مدعا علیہ سے قسم لینا ہے لیکن آپ امیر المومنین کو معاف کردیں۔ تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اس رعایت کی ضرورت نہیں۔ فیصلہ میں عمر اور ایک عام مسلمان آپ کے نزدیک برابر ہونے چاہئیں۔ (کنز العمال ج ۳ ص ۱۷۴ بحوالہ بخاری و مسلم)

بیت المال کی ذمہ داری

اسلامی ممالک میں اگرچہ بہت سے بیت المال قائم تھے لیکن سب سے بڑا بیت المال دارالخلافہ میں قائم تھا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ اس کے افسر تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ۳۱ھ کو یہ عہدہ آپ کے سپرد کیا بیت المال کے عملے میں آپ کے ایک

غلام وہیب بھی تھا۔ وہ نہایت ہوشیار تھا۔ بیت المال کے کاموں میں مدد دیتا۔ ایک دن وہ بیت المال میں گنگنا رہا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آ گئے۔ پوچھا یہ کون تھا؟ زید نے کہا میرا مملوک ہے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا اس کا ہم پر حق ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کی مدد کرتا ہے ان کی خدمات کے اعتراف میں اس کی دو (۲) ہزار وظیفہ مقرر کرنے کا ارادہ کیا لیکن زید کچھ مزاج کے گرم تھے۔ آزاد و غلام کو ایک نگاہ سے نہ دیکھتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا دو نہیں بلکہ ایک ہزار مقرر کیجئے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار وظیفہ مقرر کر دیا۔

مجلس شوریٰ کی رکنیت

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں انصار و مہاجرین کے ممتاز اصحاب کی جو مجلس شوریٰ تھی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی اس کے رکن تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی جماعت کو برقرار رکھا اور حضرت زید عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی رکن شوریٰ رہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے کارنامے

حضرت زید رضی اللہ عنہ کی زندگی ایک مثالی زندگی کا مجموعہ ہے۔

قرآن مجید اسلام کا اصل الاصول ہے۔ اس کے جمع کرنے کا فخر جس عظیم انسان کے حصے میں آیا وہ حضرت زید بن ثابت انصاری کاتب الوحی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے تک قرآن مجید ہڈی، کھال، کھجور کی شاخ اور مسلمانوں کے دلوں میں محفوظ تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم میں بہت سے بزرگ تھے جن کو قرآن کے حفظ کا شوق پیدا ہوا۔ وہ قرآن کے حافظ ہو چکے۔ ان حفاظ کرام میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آنحضرت ﷺ کے بعد عرب کا ایک گروہ مرتد ہو کر مسلیمہ کذاب سے مل گیا جس نے یمامہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس پر فوج کشی کی اور مسلیمہ شکست کھا کر مارا گیا لیکن اس غزوہ میں ستر (۷۰) حفاظ کرام نے جام شہادت نوش

فرمایا۔ اس بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قرآن کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر حفاظ کی شہادت کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو قرآن کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ لہٰذا قرآن کو جمع کیا جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کو منظور کر لیا اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا کہ تم عقلمند اور جوان آدمی ہو۔ تمہاری طرف سے سب کو اطمینان ہے تم نے رسول اکرم ﷺ کے دور میں وحی لکھی اس لئے تم ہی اس کام کو انجام دو۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ کام مجھ پر ایک پہاڑ سے زیادہ گراں تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ آپ وہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ جس کو رسول اکرم ﷺ نے نہیں کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا یہ سچ ہے۔ لیکن کارِ خیر میں کیا مضائقہ ہے؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو پھر بھی اس کام کے انجام دینے میں تامل ہوا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مختلف پہلوؤں سے سمجھایا تو وہ آمادہ ہو گئے۔ (مسند ج ۵ ص ۱۸۸ بخاری ج ۲ ص ۴۵)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کام کے لئے ان کے ساتھ ایک جماعت مامور کی جن کی تعداد ۷۵ تک بیان کی جاتی ہے۔ ان میں حضرت ابی بن کعب اور سعید بن وقاص بھی تھے۔ حضرت زید نے قرآن مجید کو جو کھجور کی شاخوں اور پتلے پتلے پتھروں پر لکھا ہوا تھا جمع کیا حفاظ سے قرآن سنا۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی قرآن کے حافظ تھے۔ اور عہد رسول ﷺ میں قرآن جمع کر چکے تھے۔ (بخاری ج ۲ ص ۴۸ باب القراء و مسند ج ۵ ص ۱۸۵)

غرض کد و کاوش کے بعد حضرت زید نے یہ اہم کام انجام دیا۔ اور پورا قرآن لکھ لیا گیا۔ مگر ایک آیت کے متعلق ثبوت نہ ملا (ثبوت کا طریقہ کار یہ تھا کہ اس پر دو آدمی گواہ ہوں)۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۱۲)

وہ آیت ابوخزیمہ انصاری کے پاس تھی۔ حضرت رسول اللہ ﷺ نے ان کی گواہی کو دو آدمیوں کے برابر قرار دیا تھا۔ (بخاری ص ۷۴۶ باب جمع القرآن)

اس لئے زید نے گواہی کی ضرورت نہ سمجھی اس کے علاوہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اس آیت کو جانتے تھے۔ قرآن مجید کا یہ نسخہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس

رکھا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس محفوظ کیا اور اس کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس وہ نسخہ موجود رہا، عہد عثمانی میں جب اختلاف قراءت رونما ہوا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا اس سے پہلے کہ یہود و نصاریٰ جیسا اختلاف پیدا ہو۔ آپ اس کا جلد تدارک کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی ضرورت محسوس کی اور حضرت زید کا لکھا ہوا مصحف حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے منگوایا اور چار بزرگوں کو جن میں ایک زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ کتابت قرآن پر مامور کیا ان بزرگوں نے مصحف صدیقی کی پانچ نقلیں لیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو ممالک اسلامیہ میں بھجوادیا اور اس نسخے کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس باحتیاط واپس کیا۔ (بخاری باب جمع القرآن ص ۷۴۶)

آنحضرت ﷺ نے کتابت وحی کا کام مختلف اشخاص کے سپرد کیا تھا۔ مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس خدمت باسعادت کو حاصل کیا۔ ان حضرات میں حضرت زید بن ثابت کا نام نامی بھی تھا۔ حضرت زید، قلم، دوات، کاغذ، چوڑی ہڈی یا باریک پتھر لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھ جاتے۔ جب وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ کے املا کروانے پر لکھ لیتے۔ جہاں کہیں وحی کے متعلق کوئی خاص ہدایت دینا ہوتی تو آپ ﷺ فرمادیتے اور زید اس کی تعمیل کرتے۔ چنانچہ جب ایک آیت 'غیر اولی الضرر' کے بڑھانے کی ضرورت ہوئی تو اس کو ہڈی کے شگاف کے پاس لکھا۔ (مسند ج ۵ ص ۱۹۱)

امارت مدینہ منورہ

حضرت زید میں علمی و دینی کمالات کے ساتھ انتظامی قابلیت بھی تھی اور بااعتماد تھے۔ اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کبھی مدینہ سے باہر کا قصد کرتے تو زید رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا امیر مقرر کرتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ کہ جب مکہ معظمہ حج کو جاتے حضرت زید کو خلافت کا منصب عنایت فرماتے دور فاروقی میں یہ سعادت تین بار زید رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئی۔ دو مرتبہ ۱۶ھ میں حج کے موقع پر اور تیسری مرتبہ حضرت عمر کے شام تشریف لے جانے پر۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے شام پہنچ کر زید کے نام خط لکھا اور اپنے نام سے زید کے نام کو مقدم کیا۔ یعنی "الی زید بن ثابت من عمر بن الخطاب" حضرت زید نے ہر مرتبہ خلافت کے کام کو نہایت مستعدی اور شرافت سے انجام دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے انتظام سے بہت خوش ہوتے اور واپس آ کر کچھ جاگیر وغیرہ عنایت فرماتے۔

مال غنیمت کی تقسیم اور آپ کی ذمہ داری

ایمان کی ستر (۷۰) سے کچھ زائد شاخیں ہیں۔ امانت ایمان کا ایک جزو لازم ہے یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "لا ایمان لمن لا امانة له" یعنی جس میں امانت نہیں اس میں ایمان بھی نہیں۔ دور نبوی ﷺ میں جو مال آتا وہ آپ علیہ السلام خود تقسیم فرماتے۔ اس طرز عمل سے اس کام کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ دور فاروقی رضی اللہ عنہ میں جنگ یرموک نہایت اہم اور مشہور ہے اس میں مال غنیمت کی تقسیم حضرت زید رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی۔ اس کے علاوہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے وظائف مقرر کئے تو انصار کے وظائف کی تقسیم زید کے سپرد کی۔ انہوں نے قبیلہ عوالی سے تقسیم شروع کی۔ پھر عبد الاشہل اور اس کے بعد اوس کو رکھا۔ پھر قبیلہ خزرج کا اور سب سے آخر میں اپنا حصہ رکھا

اہل وعیال

حضرت زید کی گھریلو زندگی نہایت پر لطف تھی۔ آپ کی اہلیہ کا نام جمیلہ اور کنیت ام سعد اور ام العلا تھی۔ جو سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ انصاری مشہور صحابی رسول ﷺ کی بیٹی تھیں۔ اور خود بھی صحابیہ تھی۔ حضرت زید کی اولاد میں خارجہ جو سب سے زیادہ مشہور اور فقہائے سبعہ میں تھے آپ کی بیوی جمیلہ کے بطن سے تھے۔ حضرت زید کے باقی بیٹے اور پوتے بھی اپنے زمانے میں مشہور اور علم حدیث میں مرجع انعام رہے ہیں۔ زید بن ثابت کے بیٹے خارجہ، یحیٰ، سلیمان، عمارہ سعد، اسماعیل، سلیط، عبد الرحمٰن، عبد اللہ پھر خارجہ کے بیٹے سلیمان، پھر سلیمان کے بیٹے سعید، سعد کے بیٹے قیس اسمٰعیل کے بیٹے یعقوب کے

بیٹے اسمٰعیل اور ان کے بیٹے زکریا ہیں، حضرت زید کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد کافی تھی لیکن دو مشہور تھے جن کے نام یہ ہیں۔ ثابت بن عبید، وہیب۔

وفات

عمر مبارک ابھی پچپن یا چھپن سال تھی کہ پیام اجل آگیا اور ۴۵ھ میں وفات پائی۔ اس وقت حکومت امیر معاویہ کی تھی اور مروان بن حکم مدینہ منورہ کا حاکم تھا اور زید سے دوستانہ تعلق رکھتے تھے، اسی لیے نماز جنازہ انہوں نے پڑھائی۔ تمام لوگ انتہائی غمگین تھے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے موت کی خبر سن کر کہا کہ آج حبر الامۃ اٹھ گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن میتب رضی اللہ عنہ بھی جنازے میں شریک تھے۔ جب قبر میں لاش اتاری گئی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نہایت حسرت سے کہا دیکھو علم اس طرح جاتا ہے آج علم کا بڑا حصہ دفن ہو گیا، حضرت حسان بن ثابت نے مرثیہ میں یہ شعر کہا۔

فمن للقوافی بعد حسان وابنه ومن للمعانی بعد زید بن ثابت

حسان اور اس کے بیٹے کے بعد اور زید بن ثابت کے بعد معنی فہمی کا خاتمہ ہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بحیثیت فقیہہ

حضرت خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ رضی اللہ عنہم میں فرائض کا سب سے بڑا عالم زید (رضی اللہ عنہ) ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اعلمہم بالحلال والحرام معاذ بن جبل رضی الله عنه وافرضهم زیدبن ثابت رضی الله عنه و اقرأهم ابی بن کعب رضی الله عنه. (جامع ترمذی ج۲ ص۲۲۰)

حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم معاذ رضی اللہ عنہ ہیں اور

فرائض میں سب سے آگے زید رضی اللہ عنہ ہیں اور قرآن پڑھنے میں سب سے فائق ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

لقد علم المحفظون من اصحاب محمد ﷺ ان زیدبن ثابت کان من الراسخین فی العلم. (ورواہ احمد)

آنحضرت ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں علم کے جو بڑے بڑے حافظ ہوئے وہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بارے میں جانتے تھے کہ آپ راسخین فی العلم کے اونچے درجے کے فرد ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فتویٰ اور فرائض و قرات میں حضرت زید رضی اللہ عنہ پر کسی کو مقدم نہ کرتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

ماکان عمرو عثمان یقدمان علی زید احدًا فی الفتوی والفرائض والقراۃ. (تذکرہ ج۱ص۳۰)

حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما فقہ وراثت اور قرآن میں کسی دوسرے بزرگ کو حضرت زید رضی اللہ عنہ سے بڑا نہ جانتے تھے۔

جب آپ فوت ہوئے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

الیوم مات حبر ھذہ الامۃ وعسی اللہ ان یجعل فی ابن عباس منہ خلفا. (الاصابہ ج۱ص۵۶۲)

آج امت کا سب سے بڑا عالم چل بسا، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اس کا جانشین بنادے۔

فقہ میں آپ کی شہرت بہت اونچی تھی، آپ کے بیٹے خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ کے بارے میں حافظ ذہبی تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ آپ مدینہ منورہ کے مشہور فقیہ ہیں۔ کبار علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مگر آپ قلیل الحدیث تھے، ذہبیؒ نے آپ کو حفاظ حدیث میں ذکر نہیں کیا ہے۔ قلیل الحدیث کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو حدیثیں کم پہنچیں یا یہ

کہ آپ علم حدیث میں کمزور تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حدیث روایت کم کرتے تھے، کثرت بیان آپ کا ذوق نہیں تھا اور یہ صرف آپ کی ہی بات نہیں اور بھی کئی محدثین ہوئے جو کم روایت کرنے والے تھے، خود علامہ شعبی کی رائے بھی یہی ہے آپ فرماتے ہیں۔

صلحائے امت زیادہ حدیث بیان کرنے کو پسند نہ کرتے تھے خود اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

نیز جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی پہلے معلوم ہو جاتی تو میں صرف وہی احادیث بیان کرتا جن کی صحت پر اصحاب حدیث کا اتفاق ہوتا۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۸۴)

خود حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

اگر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسی طرح روایات بیان کرتا جس طرح اب کرتا ہوں تو وہ اپنی چھڑی سے میری خبر لیتے۔ (ایضاً ج ۱ ص ۳۱)

اس سیاق میں قلیل الحدیث کے معنی یہ نہیں کیے جا سکتے کہ حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ کی نظر حدیث پر کم تھی۔

بات اصل یہ ہے کہ ان کا ذوق اصحاب حدیث کا نہیں تھا فقہاء کا تھا اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ ان کے والد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی شہرت بھی زیادہ فقہ میں ہی ہے۔ خطیب تبریزی (۷۴۳ھ) لکھتے ہیں۔

كان احد فقهاء الصحابة. (الاکمال ص ۵۹۹)

آپ فقہاء صحابہ میں سے ایک تھے۔

اس صورتحال سے پتہ چلتا ہے کہ فقہ اس دور میں کس عظمت اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی اور فقہاء صحابہ عام صحابہ میں کس رفعت اور عظمت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ رواۃ حدیث تو سب حضرات تھے لیکن فقہاء حدیث کوئی کوئی تھا اور حضور ﷺ خود فرما چکے کہ حامل فقہ تو کئی ہوتے ہیں لیکن فقیہ ان میں سے کوئی کوئی تھا۔ جو صحابہ رضی اللہ

عنہم اس درجے کے فقیہ نہ ہوئے وہ ان فقہاء کی پیروی میں چلتے تھے ہر مسئلے میں دلیل معلوم کرنے کا ان کے ہاں رواج نہ تھا۔ فقہائے صحابہ مسائل بتاتے تو دوسرے صحابہ ان سے ہر مسئلے پر دلیل کا مطالبہ نہ کرتے تھے اور ان دنوں فقہاء کی بات بلا مطالبہ دلیل اعتماداً تسلیم کر لی جاتی تھی اسے کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔

صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے دور میں مدار شہرت و فضل علم فقہ تھا۔ رواتِ حدیث فقہاء کے بعد دوسرے درجے میں آتے تھے۔

قرأت خلف الامام جیسے معرکۃ الآراء مسئلے میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے آپ رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے۔

عن عطاء بن یسار انه اخبره انه سال زید بن ثابت عن القرأة مع الامام فقال لاقرأة مع الامام فی شی.

(صحیح مسلم ج۱ ص۲۱۵)

عطاء بن یسار نے حضرت زید بن ثابت سے پوچھا کہ امام کے پیچھے قرآن پڑھا جاسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا امام کے ساتھ کسی حصے میں قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں۔

فرائض

اگرچہ فقہ میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اور دور نبوی ﷺ میں افتاء کے منصب پر سرفراز رہے، دور صدیقی رضی اللہ عنہ اور دور فاروقی رضی اللہ عنہ میں بھی دار الخلافت کے مفتی رہے لیکن ابواب فقہ میں فرائض سے آپ کو خاصہ لگاؤ تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے "افرض امتی زید بن ثابت" یعنی میری امت میں سب سے بڑے فرائض دان زید بن ثابت ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک کا یہ جملہ حضرت زید کے فرائض دانی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

حضرت زید کے فرائض کے عالم ہونے کا تمام صحابہ کو اعتراف تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ جابیہ میں ہزاروں لوگوں کے سامنے حضرت زید کا نام اس حیثیت

سے پیش کیا تھا:

من كان يريد ان يسائل من الفرائض فليات زيد بن ثابت

مطلب یہ ہے کہ جس نے فرائض کے متعلق سوال کرنے ہوں وہ زید کے پاس جائے۔ ان کے کمالات کا اعتراف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علمی قابلیت کی بنا پر تھا۔ اس وجہ سے آپ کو مدینہ سے باہر نہ جانے دیتے۔ مختلف مقاموں میں بڑے بڑے عہدے خالی ہوتے اور امور کو انجام دینے کی ضرورت ہوتی۔ اور لوگوں کے نام پیش کئے جاتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتخاب فرماتے لیکن جب زید رضی اللہ عنہ کا نام پیش ہوتا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے کہ زید میری نظروں سے گرا نہیں۔ لیکن کیا کروں؟ شہر والے ان کے محتاج ہیں۔ کیونکہ جو چیز ان کے پاس ہے کسی کے پاس نہیں۔ (طبقات ص ۱۱۶)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ زید دور فاروقی کے عالم تھے اور تمام لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھیلا دیا تھا اور فتوی ورائے سے منع کیا تھا لیکن زید مدینہ میں بیٹھ کر آنے جانے والوں کو اور اہل مدینہ کو فتوی دیا کرتے تھے۔ (طبقات ص ۱۱۷ ج ۲)

سعید بن مسیب مجتہد ہونے کے باوجود فتوئی اور فیصلوں میں حضرت زید کی اتباع کرتے جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آجاتا اور لوگ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہاد بیان کرتے تو حضرت سعید ان سے پوچھتے کہ زید رضی اللہ عنہ نے کیا کہا ہے۔ زید بن ثابت فیصلوں کے زیادہ جاننے والے تھے۔ اور جن مسئلوں کے متعلق حدیث وارد نہیں ہے ان کے بتانے میں سب سے زیادہ بصیرت رکھتے تھے۔ سعید کہتے کہ ان کا کوئی قول ہو تو پیش کرو۔ (طبقات ج ۲ ص ۱۱۶)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے زمانے میں مدینہ کے امام تھے۔ آج عرصہ دراز بعد بھی فقہ و حدیث میں لاکھوں لوگوں کے امام ہیں۔ فرمایا کرتے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ کے امام تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرائض کے تمام مسائل میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی تقلید کی ہے۔

تدوین علم فرائض

علم فرائض بلاشبہ نہایت مشکل فن ہے۔ قرآن مجید میں اگرچہ مجمل طور پر فرائض کے تمام مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں لیکن ان کی تفصیل رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے قضا اور فتویٰ سے ہوتی ہے قرآن مجید میں علم میراث اور وصیت کو مختصراً بیان کیا ہے۔ شوہر کی میراث، بیوی کی میراث، لڑکوں کی میراث، لڑکیوں کی میراث، ماں، باپ، بہن، اور دیگر ورثاء کا تذکرہ موجود ہے اور ان کی میراث کی مقدار متعین کر کے کہہ دیا گیا کہ جو شخص خدا کی ان حدود سے تجاوز کرے گا وہ اپنے نفس پر ظلم کرے گا۔ آپ ﷺ نے اپنے افعال واقوال سے اس اجمال کی تفصیل بیان کی۔ آپ ﷺ کے بعد زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس فن کو اتنا رواج دیا کہ بعد میں اس پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ اور باب الفرائض ایک مستقل فن بن گیا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ سے علم الفرائض کے متعلق اکابر صحابہ فتویٰ لیا کرتے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جن کا فضل وکمال تمام صحابہ کو تسلیم تھا۔ وہ بھی حضرت زید سے استفادہ کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک غلام کا انتقال ہوا تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے پوچھا کہ ترکہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی لڑکیاں بھی حصہ لیں گی؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا میرے نزدیک تو نہ دینا چاہیے لیکن تم چاہو تو دے سکتے ہو۔ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس پر یہاں تک عمل کیا کہ جو غلام مرا اس کا مال لڑکیوں کو نہ دیا۔ (یعنی میراث میں شمار نہیں کیا)۔ (المدونۃ الکبریٰ امام مالک ج ۳)

اہل یمامہ کے قتل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زید رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کے متعلق فیصلہ صادر کیا تھا۔ یعنی جو لوگ زندہ بچ گئے ہیں ان کو مردوں کا وارث بنایا جائے۔ یہ نہیں کیا کہ مردوں کو باہم وارث بنا دیتے۔ (کنز العمال ج ۶ ص ۶)

طاعون کی وجہ سے جب خاندان کے خاندان ختم ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کے اسی فیصلہ پر عمل کیا تھا۔ (کنز العمال ج ۶ ص ۷)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جو کہ لوگوں میں بحر علم کہلاتے۔ وہ بھی حضرت

زید رضی اللہ عنہ کے جوابات سے تسکین پاتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے ایک شاگرد کو حضرت زید رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ ایک شخص مر گیا اور لواحقین میں بیوی اور والدین چھوڑے ہیں تو ان میں ورثہ کیسے تقسیم ہوگا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بیوی کو نصف اور باقی نصف میں ماں کو ثلث اور بقیہ باپ کو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مال کے کل میں سے ماں کو ثلث کا حق دار ٹھہراتے تھے۔ تو کہلوا بھیجا کہ یہ بات قرآن میں موجود ہے یا آپ کی رائے ہے، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا یہ میری ذاتی رائے ہے میں ماں کو باپ پر فضیلت نہیں دے سکتا۔ (کنز العمال ج ۲ ص ۱۱۱)

دور دراز کے ممالک کے فتویٰ بھی لکھ دیا کرتے چنانچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک خط کے ذریعے دادا کے متعلق پوچھا۔ حضرت زید نے اس کے جواب میں تحریر کیا تھا:

" بسم الله الرحمن الرحيم لعبد الله معاويه امير المومنين من زيدبن ثابت انى رايت من نحو قصد امير المومنين عمر بين الجد والا خوة واحدة قسم لها الثلث فان كانتا اختين مع الجد قسم لها الشطر و للجد الشطر فان كان للجد اخوات فانه يقسم للجد الثلث ، فان كانوا اكثر ذلك فانى لم اره حسبت ينقص الجد من الثلث شيأ ثم ماخلص للا خوة من ميراث اخيهم بعد الجد فان بنى الاب والام هم اولى بعضهم من بعض بمافرض الله لهم دون بنى العلة فلذلك حسبت نحوامن الذى كان امير المومنين عمر يقسم بين الجد والا خوة من الاب ولم يكن يورث الا خوة من الام الذى ليس من الاب مع

الجدشیأ ثم حسبت امیرالمومنین عثمان بن عفان کان یقسم بین الجدو الا خوة نحو الذی کتبت به الیک فی هذه الصحیفة" (کنز العمال، ج۶ص۱۵)

حضرت زید نے علم فرائض کے مسائل دور فاروقی رضی اللہ عنہ میں ترتیب دیئے۔ (کنز العمال ج۶ص۱۵)

اور بہت سے مسائل کا استنباط کیا۔ حضرت زید کے عقل وفہم نے نئے نئے خیالات پیدا کئے جو علم فرائض کا جزو بن گئے۔ میراث موالی، میراث و لدالابن، میراث ولد ملاعنه، میراث الولدمن ابیه وامه، میراث والجدمن المیراث لـه مانعین وراثت کہ اس قبیل کے دیگر مسائل حضرت زید کی فکر کامل اور دماغ نکتہ سنج کی پیدا کردہ ہیں۔ حضرت زید نے دادا کی میراث کی نسبت جو فیصلہ کیا تھا صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس کے خلاف بھی موجود تھے۔ لیکن صحت اور اتفاق عام کا دامن حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ دادا کی میراث علم الفرائض میں نہایت معرکتہ الآ راء مسئلہ ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن جس رائے پر وہ اخیر وقت تک قائم رہے حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے بھی اسی کو قابل عمل تصور کیا۔

اسلام میں سب سے پہلے دادا کا حصہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لیا۔ ان کا ایک پوتا فوت ہو گیا تو وہ مکمل جائداد کے اپنے آپ کو مستحق سمجھتے تھے۔ لوگوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے اس وقت وہ کنگھی کر رہے تھے۔ اور کنیز بال درست کر رہی تھی پوچھا آپ نے بلاوجہ تکلیف کی مجھے بلالیا ہوتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ وحی نہ تھی جس میں بڑھنے گھٹنے کا احتمال ہوتا۔ ایک مسئلہ کے متعلق مشورہ کرنے آیا ہوں۔ اگر تمہاری رائے میرے رائے کے موافق ہوگی تو عمل کروں گا ورنہ آپ پر کوئی الزام نہیں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس صورت حال کو دیکھ کر رائے دینے سے انکار کر دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ افسردہ

ہو کر چلے آئے۔ایک روز دوبارہ گئے تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اس کو نافذ عمل کرتا ہوں۔ (کنز العمال ج ٦ ص ١٦)

اگر چہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے علم فرائض مدون کیا اس کی مختلف جزئیات کا استخراج کیا بہت سے نئے مسائل کو ایجاد کیا لیکن ان سب میں اہم اور عظیم مسئلہ عول ہے۔بعض حضرات کا خیال ہے کہ مسئلہ عول حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ایجاد ہے جو کہ روایت اور درایت دونوں کے خلاف ہے۔اول تو اس واقعہ کی کوئی سند نہیں۔اور ہم نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ سند صحیح سے مروی ہے یعنی عبدالرحمٰن بن ابی زناد نے خارجہ سے روایت کیا جنہوں نے خود حضرت زید رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو علم فرائض وحساب میں دخل نہ تھا۔اس لئے اس قسم کی ایجاد ان کی طرف منسوب کرنا عقل کے خلاف ہے۔

حضرت زید کی علم الفرائض میں خدمت واضح ہو چکی گذشتہ واقعہ سے اور آپ علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے ''کہ میری امت کے سب سے بڑے فرائض دان زید ہیں'' حرف بحرف پورا ہوا۔حضرت زید کی اس غیر معمولی ذہانت وذکاوت، جودت فکر۔اور دل ودماغ پر اس دور کے علماء کو تعجب تھا۔

علم فقہ

فن فرائض کی طرح وہ فقہ میں بھی مجتہدین صحابہ میں سے تھے۔اور دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں فتویٰ دیا کرتے تھے (طبقات ابن سعد ص ١١٠)

خلفائے راشدین اور خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ میں بھی وہ مدینہ منورہ کے مفتی اعظم رہے،فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم کے تین طبقے ہیں۔آپ کا شمار طبقہ اولی میں ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں جس قدر فتویٰ دیئے ان کی تعداد کثیر ہے۔ (اعلام الموقعین ج ٢)

حضرت زید کی فقہ ان کی حیات ہی میں سند عام کی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے کہ حضرت زید کا کوئی قول ایسا نہیں جس پر لوگوں نے بالا جماع عمل نہ کیا ہو، حضرت زید کے فتووں پر ان کی حیات ہی میں

اطراف عالم میں عمل شروع ہوگیا۔ (ابن قیم جوزی ص۴)

لوگوں کا خیال ہے کہ فقہ کو وسعت اور شہرت چار بزرگوں کی وجہ سے ملی ہے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، چنانچہ ان ہی کے تلامذہ سے چار دانگ عالم میں علم دین کی اشاعت ہوئی۔

مدینہ منورہ جو اسلام کا مرکز اور نبوت کا دار القرار تھا حضرت زید کی وجہ سے علم وفنون کا سرچشمہ رہا۔ فقہاء صحابہ کی دو مجلسیں تھیں۔ ایک کے رئیس حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے کے حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس کے ساتھی تھے۔ یہاں مسائل علمیہ پر بحث ہوتی اور مشکل اور پیچیدہ مسائل کا حل نکلتا۔ (طبقات ابن سعد)

ویسے تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کا فیض عام طور پر جاری تھا لیکن اس کے لئے ایک وقت بھی مخصوص تھا۔ اور مسجد نبوی میں جو زیارت گاہ عام تھی۔ آپ کے مکان سے متصل تھی آپ یہاں فتویٰ دینے کے لئے تشریف رکھتے۔ (مسند ج۵)

حضرت زید رضی اللہ عنہ کے مسائل فقہ کے اکثر ابواب پر حاوی تھے۔ مثال کے طور پر چند نمونے درج ذیل ہیں۔

باب الصلوٰۃ

فرض نماز کے علاوہ بقیہ نمازیں گھر میں پڑھنا افضل ہے۔ (مسند ۵ ص ۸۶)

ایک شخص نے سوال کیا کہ نبی ﷺ نے ظہر اور عصر میں قرأت فرمایا؟ ہاں حضور ﷺ دیر تک قیام فرماتے اور آپ ﷺ کے لب ہلتے۔ (مسند ج ۵ ص ۱۸۴)

اس کا مطلب قرأت خلف الامام نہیں بلکہ خود امام مراد ہیں۔ سائل کا منشا یہ تھا کہ ظہر اور عصر میں کچھ پڑھا جاتا ہے؟ حضرت زید نے اس کا جواب دیا ہے ورنہ امام کی قرأت سب مقتدیوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ باقی صحیح بخاری میں خباب بن ارت رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، ابوقتادہ رضی اللہ عنہ، سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے

جو روایت مذکور ہے کسی ایک سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے۔

باب الذبائح

ایک بھیڑیے نے بکری پہ دانت گاڑا۔ تو لوگوں نے اس کو فوراً ذبح کر دیا۔ آپ ﷺ نے اس کے کھانے کی اجازت دی ہے۔ (مسند ۵ ص ۱۸۴)

ذبیحہ کے لئے شرط یہ ہے کہ اس کا گلہ کاٹا جائے۔ قرآن شریف میں ہے **الا ما ذکیتم** جب یہ شرط پائی گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کھانا حلال قرار دیا۔

باب الهبه

ایک شخص نے اپنا مکان اپنی زندگی میں کسی کو رہنے کے لئے دیا۔ تو اس کی وفات پر اس کی اولاد مالک سمجھی جائے گی۔ حضرت زید کی روایت میں اسی کا بیان ہے **العمری للوارث**۔ (مسند ۵ ص ۱۸۶)

عمریٰ کی قید کے ساتھ رقبی کی ممانعت وارد ہوئی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو چیز اس شرط پر دے کہ اگر میں فوت ہو جاؤں تیری زندگی میں تو تم مالک ہو۔ اگر تیرا انتقال پہلے ہو گیا تو ملکیت واپس آ جائے گی۔ کیونکہ ہبہ کے لئے تملیک ضروری ہے۔ اس جگہ وہ شرط فاسدہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی وجہ سے یہ ہبہ ناجائز قرار دیا گیا۔

باب المزارعة

نصف، ثلث، اور ربع منافع پر کسی سے زراعت کرانا منع ہے۔ (مسند ج ۵ ص ۱۸۷)

جب تک باغ میں پھل اچھی طرح نہ آ جائیں یا درخت پر رطب چھوہارے ہوں تو ان کو اندازے سے بیچنا اس کی ممانعت ہے۔ (مسند ج ۵ ص ۱۹۶)

مدینہ میں قبل از سلام پھل کو پکنے سے پہلے فروخت کر دیا جاتا۔ اور نقصان کی

صورت میں فریقین میں جھگڑا ہو جاتا جب آپ ﷺ تشریف لائے اور اس صورت حال سے آگاہ ہوئے تو اس کو منع فرما دیا۔ البتہ عربوں میں جو مسکین تھے اور صرف صدقات کے چھوہاروں پر گزر اوقات تھی ان کو ناپ کر فروخت کرنے کی اجازت دے دی۔

مختلف زبانوں پر مہارت

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھیں۔ ذہانت کا یہ حال تھا کہ صرف پندرہ روز کی محنت سے بلا تکلف خط لکھنا شروع کر دیا۔ بعد میں اور بھی ترقی ہوئی۔ مسعودی لکھتے ہیں کہ ان کو فارسی، رومی قبطی، اور حبشی زبانیں آتی تھیں۔ جن کو انہوں نے وہاں کے رہنے والوں سے سیکھا تھا۔

(کتاب التنبیہ والاشراف ص ۲۸۲)

ریاضی/حساب

عرب میں حساب کا مطلق رواج نہ تھا۔ اس لئے ابتدائے اسلام میں خراج کا حساب رومی یا ایرانی کرتے، عربوں کو ہزار سے اوپر گنتی معلوم نہ تھی۔ عربی میں ہزار سے اوپر کے عدد کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ لیکن حضرت زید رضی اللہ عنہ کو حساب میں اس قدر دخل تھا کہ آپ فرائض کا مشکل سے مشکل مسئلہ بھی باآسانی حل کر لیتے اس کے ساتھ مال کی تقسیم بھی کر دیتے، چنانچہ غزوہ حنین جو ۸ھ میں ہوا اور بارہ ہزار افراد شریک تھے آپ ہی کے لگائے ہوئے حصے کے بقدر آپ ﷺ نے مال تقسیم فرمایا۔ انہوں نے پہلے لوگوں کی تعداد معلوم کی۔ پھر مال غنیمت کو اس پر تقسیم کیا چند سرداروں کو نکال کر جن کو بڑی رقمیں دی گئی تھیں۔ فی کس ۴ اونٹ اور چالیس بکریاں حصہ میں آئیں۔ سواروں کو ان سے دوگنا زیادہ یعنی ۱۲ اونٹ ۱۲۰ بکریاں دیں۔ (طبقات ابن سعد ص ۱۱۰)

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ

اسم گرامی عبداللہ بن قیس اور رکنیت ابوموسیٰ تھی۔ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو قاضی بنا کر یمن بھیجا تو حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی یمن کے کسی دوسرے علاقے میں گورنر نامزد فرمایا تھا، اس سے ان کی علمی اور انتظامی باوقار شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی آپ کوفہ اور بصرہ کے گورنر رہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی آپ بعض صوبوں کے گورنر رہے، معرکہ صفین کے اختتام پر آپ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حکم مقرر کیے گئے۔ آپ کا اس تسلسل سے حکومت میں شریک رہنا اور سیاسی معرکوں میں حصہ لینا پتہ دیتا ہے کہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما میں ہرگز کوئی سیاسی کھچاؤ نہ تھا۔

جنگ یرموک کا مال غنیمت بھی جب مدینہ آیا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ہی تقسیم کیا۔

خوش الحانی سے قرآن کی تلاوت کرنے میں آپ بے مثال تھے، خود آنحضرت ﷺ نے آپ سے کہا:

یا ابا موسیٰ لقد اعطیت مزماراً من مزامیر ال داؤد.

(جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۲۶، ہذا حدیث غریب حسن صحیح)

اے ابوموسیٰ! تم آل داؤد کے مزامیر میں سے ایک مزمار عطا کیے گئے ہو۔

قرآن کریم سے یہ شغف و محبت جو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو نصیب ہوا تھا اس کا اثر پورے اشعریوں میں پایا گیا ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

انی لاعرف اصوات رفقة الاشعریین بالقران حین

یدخلون. للیل اعرف منازلهم من اصواتهم بالقران وان
کنت لم ارمنازلهم حین نزلوا بالنهار. (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۰۲)

اشعری لوگ جب شام کو گھر آتے ہیں تو میں ان کے قرآن پڑھنے
سے ان کی آوازیں پہچانتا ہوں ان کے گھروں کو ان کی قرآن
پڑھنے کی آوازوں سے پہچانتا ہوں اگرچہ میں نے ان کے گھر
جب وہ دن میں وہاں ہوتے ہیں دیکھے نہیں ہوتے۔

آنحضرت ﷺ اشعریوں کو اپنے اتنا قریب سمجھتے تھے جتنا اہل بیت کرام کو آپ نے جس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

الحسین منی وانا من الحسین.

اشعریوں کے بارے میں بھی فرمایا:

فهم منی وانا منهم (ایضاً)

اور یہ قرآن پاک کے اسلوب کے عین مطابق ہے۔

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں میں ایک دفعہ حضور ﷺ کے ساتھ بہ مقام جعرانہ پر ٹھہرا ہوا تھا (یہ جگہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے) حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی وہیں تھے کہ آپ نے پانی منگایا۔ اس میں اپنے دونوں ہاتھ دھوئے۔ رخ انور بھی دھویا اور اس میں اپنا لعاب دہن بھی ڈالا اور ہم دونوں کو کہا کہ پی جاؤ۔ اپنے چہروں پر بھی بہاؤ اور سینوں پر بھی چھڑکو۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پردے کے پیچھے سے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے وہیں سے آواز دی اپنی ماں کے لیے بھی کچھ رکھ لینا۔ ہم نے آپ کے لیے بھی اس سے کچھ رکھ لیا:

ثم دعا رسول الله بقدح فیه ماء فغسل یدیه ووجهه فیه
ومج فیه ثم قال اشربامنه وافرغا علی وجوهکما ونحور
کما وابشر افاخذا القدح ففعلاما امرهمابه رسول الله

فنادتهما ام سلمة من وراء الستر افضلا لامكما من مافى اناء كما فافضلا لها منه. (صحیح مسلم ج۲ص۳۰۲)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے دل و دماغ میں فیض نبوت کا یہ چشمہ ہمیشہ اچھلتا رہا۔ ابوالبختری کہتے ہیں ہم نے ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

جس طرح کپڑے کو رنگ میں ڈال کر نکالا جاتا ہے انہیں علم میں ڈبو کر نکالا گیا ہے۔ (تذکرہ ج۱ص۴۲)

حضرت عیاض اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جب یہ آیت اتری:

يا ايها الذين امنوا من يرتد منكم عن دينه فسوف ياتى الله بقوم يحبهم ويحبونه. (پ۶ المائدہ ۵۴)

اے ایمان والو! تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے (تو اللہ تعالیٰ ان کے مقابلہ میں ایک ایسی قوم کو کھڑا کر دیں گے جو اللہ کی محبوب ہوگی اللہ ان کا محبوب ہوگا۔

تو آپ ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اے ابا موسیٰ: اس میں تیری قوم کا ذکر ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اشعری کس طرح ہر دور میں اہل باطل کے خلاف اٹھے اور اسلام کی عزت کا سبب بنے۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں: صحیحین میں ہے آنحضرت ﷺ نے ابوموسیٰ کے حق میں دعا فرمائی:

اللهم اغفر لعبدالله بن قيس ذنبه وادخله يوم القيامة مدخلاً كريما. (تذکرہ ج۱ص۴۲)

الٰہی عبداللہ بن قیس کے گناہ معاف کر دے اور اس کو قیامت کے دن عزت والے مقام میں داخل فرما۔

علمی دنیا میں آپ کا تعارف عراق کے بڑے فقیہ کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں مسلمانوں میں فقہ کو بہت اونچا مقام حاصل تھا۔ ہر شخص فقیہ کہلانے کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ رفعت وعظمت کسی کسی کے نصیب میں تھی۔

حطان بن عبداللہ الرقاشیؒ کہتے ہیں میں نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی۔ آپ نے بعد نماز ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور بیان کیا کہ مقتدیوں کو نماز کس طرح پڑھنی چاہیے، آپ نے اس کے آداب آنحضرت ﷺ کی حدیث کے حوالے سے بیان فرمائے آپ نے کہا حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

اذا کبر الامام فکبروا واذاقال غیر المغضوب علیهم فقولوا امین. (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۴)

جب امام تکبیر (تحریمہ) کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ غیر المغضوب علیهم کہے تو تم آمین کہو۔

یہ حدیث خاص مقتدیوں کو آداب نماز بتلانے کے بارے میں ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام کے تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد غیر المغضوب علیهم ولا الضالین کو پہنچنے تک مقتدیوں کے ذمہ کوئی ضروری عمل نہیں ہے۔ جب امام وَلَا الضالین تک پہنچے تو مقتدی آمین کہیں اگر مقتدیوں کے ذمہ سورہ فاتحہ پڑھنی ضروری ہوتی تو حضور ﷺ اس طرح فرماتے۔

اذا کبر الامام فکبروا واذا قرأ فاقرؤا واذاقال غیر المغضوب علیهم ولا الضالین فقولوا امین.

یہ درمیانی جملہ آپ کو حدیث کے اسفار میں کہیں نہ ملے گا نہ کسی سند صحیح سے نہ کسی سند ضعیف سے حالانکہ یہ مقتدیوں کو نماز کی تعلیم دی جا رہی تھی اور یہ مقام بیان ہے۔ مقام بیان میں عدم بیان، بیان عدم کا درجہ رکھتا ہے کہ مقتدی کا وظیفہ تکبیر تحریمہ اور آمین کے مابین خاموش رہنا سورہ فاتحہ پڑھنا مقتدیوں کے ذمہ نہیں۔ اور حضور ﷺ نے جو فرمایا تھا۔ لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بام القراٰن تو اس وقت مقتدیوں کی نماز پر بحث نہ

تھی۔ اکابر محدثین نے اس ارشاد نبوت کو اکیلے پڑھنے والے پر محمول کیا ہے۔

(جامع ترمذی ج ۱ ص ۴۲ سنن ابی داؤد ج)

امام مسلم نے اسحاق بن ابراہیم سے، اس نے جریر سے، اس نے سلیمان تیمی سے، انہوں نے قتادہ سے، انہوں نے یونس بن جبیر سے، انہوں نے حطان بن عبداللہ الرقاشی سے، انہوں نے حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

اذا کبر الامام فکبروا واذا قرء فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیھم ولاالضالین فقولوا امین

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۴)

جب امام اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ پڑھنا شروع کرے تو چپ رہو اور جب وہ غیر المغضوب علیھم کہے تو تم آمین کہو۔

دیکھئے جریر عن سلیمان عن قتادہ کی روایت میں حضور ﷺ کی وہ حدیث اور کھل کر سامنے آ گئی کہ امام جب پڑھنا شروع کرے تو تم اس کے پیچھے چپ رہا کرو۔ مقتدی سورۂ فاتحہ نہ پڑھیں، امام کے آمین کہنے پر آمین کہیں اور سورۃ فاتحہ پڑھنے والے کی سورۂ فاتحہ بذریعہ آمین اپنی نماز میں جذب کرلیں۔ قتادہ کے شاگرد سلیمان نے حدیث کا یہ حصہ ساتھ روایت کیا ہے۔ امام مسلم سے حدیث کے اس جملہ (واذا قرء فانصتوا) کے بارے میں سوال کیا گیا تو امام صاحب نے فرمایا:

اترید احفظ من سلیمان

کیا تو سلیمان تیمی سے بھی زیادہ یاد رکھنے والے کی تلاش میں ہے؟

یہ حدیث ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ دو صحابیوں سے مروی ہے۔ امام مسلم نے متن میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی نہیں۔ مگر جب امام مسلم سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

کی اس روایت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اس کی تصدیق کی اور فرمایا:

فحدیث ابی هریرة قال هو صحیح یعنی و اذا قرا فانصتوا. (صحیح مسلم ج اص ۱۷۴)

اس سے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کی اس روایت کی اور توثیق ہو جاتی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے مقتدیوں کو ان کی نماز کا طریقہ بتلایا اور سمجھایا کہ ان کے ذمہ امام کی تکبیر تحریمہ کے بعد و لا الضالین تک کچھ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔

اہل علم سے اکثر ان کی علمی مجلسیں اور فقہی بحثیں رہتی تھیں جس نے ان کے علم کو اور بھی چمکا دیا تھا یوں تو ان کے علمی احباب کا حلقہ تو بہت وسیع تھا مگر ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے خاص طور سے علمی بحثیں کرتے تھے اور بسا اوقات ایسی بحثیں خلوص و نیک نیتی کے ساتھ مناظرہ کی حد تک پہنچ جاتیں اور تاوقتیکہ مسئلہ کی پوری تنقیح نہ ہو جاتی بحث برابر جاری رہتی۔

ایک مجلس میں تیمم کا مسئلہ زیر بحث آیا حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر کسی کو غسل کی حاجت پیش آ جائے اور اس کو ایک ماہ تک پانی نہ ملے تو کیا وہ تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں خواہ ایک ماہ تک اسے پانی نہ ملے، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر تمہارا کیا خیال ہے سورہ مائدہ کی اس آیت کے بارے میں ''فلم تجدو اماء فتیمموا صعیدًا طیبًا''۔ ''یعنی پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر لوگوں کو تیمم کی اجازت دے دی جائے تو سردیوں کے موسم میں جب پانی ٹھنڈا ہوتا ہے تو لوگ تیمم پر ہی اکتفاء کریں گے اس بات پر (راوی) شقیق نے کہا کہ کیا صرف اس خدشہ کے پیش نظر آپ تیمم کو اچھا نہیں سمجھتے؟ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ

عنہ نے کہا کہ کیا تم نے حضرت عمار کا وہ واقعہ جس کو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے نہیں سنا کہ ان کو نبی کریم ﷺ نے کسی کام کے لیے بھیجا تھا اچانک ان کو راستہ میں غسل کی حاجت پیش آگئی اور پانی نہ ملا تو انہوں نے جانوروں کی طرح زمین پر لوٹ لوٹ ہو کر تیمم لیا اور پھر واپس آکر جب آنحضرت ﷺ سے سارا واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے ان کو تیمم کا طریقہ بتایا اور پھر فرمایا کہ تمہارے لیے اتنا ہی کافی تھا اس بات پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ شاید آپ کو یہ نہیں معلوم کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کو کافی نہیں سمجھا تھا''۔

(بخاری۔ کتاب التیمم۔ باب التیمم ضربۃ)

ایک مرتبہ دونوں بزرگوں میں حدیث مبارک کا مذاکرہ ہو رہا تھا کہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے قریب علم اٹھ جائے گا جہالت کا دور دورہ ہوگا اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوگا۔

(مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۹۲)

علم کی نشر و اشاعت

حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ علم کی نشر و اشاعت اور اس سے عامۃ المسلمین کو فائدہ پہنچانے کی بھرپور کوشش کیا کرتے تھے آپ رضی اللہ عنہ کا یہ اصول تھا کہ جو کچھ بھی کسی کو معلوم ہو اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا اس کا فریضہ ہے۔ ایک مرتبہ ایک خطاب میں لوگوں سے کہا کہ ''جس شخص کو اللہ تعالیٰ علم سے نوازے اس کو چاہیے کہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی اس کی تعلیم دے اور جو بات اس کو معلوم نہ ہو اس کے متعلق ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہ نکالے'' (طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۱۸)

ان کی تعلیم کے طریقے مختلف تھے، عام طور پر مستقل حلقہ درس لگاتے تھے مگر کبھی کبھار لوگوں کو جمع کر کے ان سے خطاب فرماتے چنانچہ ایک مرتبہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''لوگو! شرک سے بچنے کی کوشش کرو، اس لیے کہ یہ چیونٹی کی چال سے زیادہ غیر محسوس چیز ہے''۔ (مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۴۰۳)

جہاں کہیں دیکھا کہ لوگ جمع ہیں تو ان تک کوئی نہ کوئی حدیث ضرور پہنچا دیتے چنانچہ ایک مرتبہ بنوثعلبہ کے چند آدمی کہیں جا رہے تھے ان کو راستہ ہی میں ایک حدیث سنا دی۔ (مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۱۴۸)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے درس کا طریقہ نہایت نرم تھا، چنانچہ اگر کوئی شخص نادانی سے بھی کوئی اعتراض کرتا تو ناراض نہ ہوتے تھے بلکہ اسے نہایت نرمی سے سمجھا دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ الرقاشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''میں ایک بار حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ نماز پڑھ رہا تھا کہ آپ حالت قعدہ میں تھے کسی نے زور سے ایک ایسا جملہ کہا جو مسنون دعاؤں میں سے نہ تھا جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا کس نے کہا تھا؟ لوگ خاموش رہے پھر پوچھا کہ فلاں فقرہ کس نے کہا تھا؟ لوگ پھر خاموش رہے تو فرمایا کہ حطان! شاید تم نے کہا تھا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے نہیں کہا تھا مجھے پہلے ہی خطرہ تھا کہ آپ مجھے ہی ڈانٹیں گے اتنے میں ایک شخص نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میں نے کہا تھا اور اس سے میری کوئی بری نیت نہ تھی بلکہ بھلائی تھی حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اسے مسنون نماز کا پورا طریقہ بتایا اور کسی قسم کی ترش روئی سے کام نہیں لیا۔ (صحیح مسلم، باب التشہد فی الصلوٰۃ)

حلیہ و اولاد

آپ رضی اللہ عنہ پست قد اور لاغر اندام تھے، وفات کے وقت بہت سی اولاد چھوڑی، جن کے نام یہ ہیں: ابراہیم، ابوبکر، ابوبردہ، موسیٰ۔ (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۶۲)

وفات

آپ رضی اللہ عنہ کی وفات کے سن اور مقام میں روایات مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کا مقام وفات مکہ معظمہ ہے اور بعض کے نزدیک کوفہ ہے، لیکن راجح مکہ کی روایت ہے۔ بہرحال باختلاف روایت ۴۲ھ یا ۴۴ھ یا ۵۲ھ کو بیمار ہوئے اور صحیح

روایت کے مطابق ذی الحجہ ۴۴ھ میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۱۲)

آخر دم تک احکام نبوی ﷺ کا پاس ولحاظ رہا جب حالت زیادہ خراب ہوئی اور غشی طاری ہوگئی تو گھر کی جس عورت کی گود میں سر رکھا ہوا تھا اس نے رونا دھونا شروع کر دیا ہوش آیا تو فرمایا کہ جس چیز سے رسول اللہ ﷺ نے برأت ظاہر کی ہے میں بھی اس سے برأت ظاہر کرتا ہوں، آپ ﷺ نے گریبان چاک کرنے والی، نوحہ کرنے والی اور کپڑے پھاڑنے والی عورتوں سے برأت ظاہر کی ہے۔ (صحیح مسلم، باب تحریم ضرب الخدود)

اس کے بعد کفن ودفن کے متعلق ضروری وصیتیں فرمائیں کہ جنازہ جلدی جلدی لے جانا، جنازہ کے ساتھ انگیٹھی نہ لے چلنا، لحد اور میری میت کے درمیان کوئی مٹی روکنے والی چیز نہ رکھنا، قبر پر کوئی عمارت نہ بنانا، اور میں نوحہ وبین کرنے والی اور گریبان چاک کرنے والی اور سر کے بال نوچنے والی عورتوں سے بری ہوں"۔

اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کی روح نفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

وفات کے وقت عمر مبارک ۶۱ سال کی تھی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

نام ونسب

آپ رضی اللہ عنہ کا نام عمیر اور کنیت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے عمیر بن عامر بن عبد ذی الشریٰ بن طریف بن غیاث بن لہنیہ بن سعد بن ثعلبہ بن فہم بن غنم بن دوس۔ (طبقات ابن سعد ۴۔۵۲)

بعض کہتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ کا نام عبدالرحمٰن بن صخر تھا، اور یہ مشہور بھی ہے، اسلام سے قبل خاندانی نام عبد شمس تھا اسلام کے بعد نبی کریم ﷺ نے عبدالرحمٰن یا عمیر رکھا۔

حلیہ مبارک

آپ رضی اللہ عنہ کا رنگ گندمی، شانے کشادہ اور دانت آب دار تھے اور سامنے کے دو دانتوں کے درمیان فاصلہ تھا، زلفیں رکھتے تھے اور بالوں میں زرد رنگ کا خضاب استعمال کرتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول پاک ﷺ کے وہ جلیل القدر صحابی ہیں جنہیں سفر و حضر میں آنحضور ﷺ کی صحبت بابرکات سے فیض یاب ہونے کا سب سے زیادہ موقع ملا، آپ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ کو خوب محفوظ اور یاد بھی رکھا اور آگے دوسرے تک نقل بھی کیا، چنانچہ محقق علماء نے آپ رضی اللہ عنہ کو مکثرین روایت میں سے شمار کیا ہے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ روایت کرنے والے آپ رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کی احادیث کی تعداد پانچ ہزار تین سو چونسٹھ (۵۳۶۴) ہے اور آٹھ سو سے زیادہ صحابہ و تابعین آپ رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کرتے ہیں، بعضوں کے نام یہ ہیں: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

اسلام اور ہجرت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ایک ہم قبیلہ تھے طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ جو قبول اسلام کے بعد تبلیغ اسلام کے غرض سے یمن واپس آئے، ان کی محنت وکوشش سے قبیلہ دوس میں اسلام پھیلا اور غزوہ خیبر کے زمانہ میں یہ یمن کے اس خانوادوں کو لے کر آنحضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خیبر میں تشریف رکھتے تھے اس لیے یہ لوگ مدینہ سے خیبر پہنچے اس قبیلہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے خیبر پہنچ کر آنحضور ﷺ کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ایک غلام راستہ میں کہیں گم ہوگیا تھا، اتفاق سے وہ دکھائی دیا، آنحضور ﷺ نے فرمایا ''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تمہارا غلام آگیا'' عرض کیا کہ وہ خدا کی راہ میں آزاد ہے، بیعت اسلام کے بعد تادم حیات دامن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ رہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ جب میں خیبر آیا تو اس وقت میری عمر تیس سال سے زائد تھی اور میرا نام عبدالرحمٰن اور کنیت ابویرہ رضی اللہ عنہ تھی اس لیے کہ مجھے ایک ہرہ (بلی) مل گئی تھی جسے میں اپنی آستین میں اٹھائے پھرتا تھا بس لوگ مجھے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے صفہ (چبوترہ) کو اپنا مسکن بنالیا تھا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان زمین پر پڑا رہتا تھا، لوگ کہتے کہ یہ دیوانہ ہے حالانکہ مجھے دیوانگی لاحق نہیں ہوتی تھی بلکہ بھوک کے مارے ایسا ہوتا تھا۔

اصحاب صفہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے چار سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

صحبت بابرکات سے فیض حاصل کیا آپ رضی اللہ عنہ اہل صفہ میں سے تھے، اہل صفہ مسلمان مہاجرین کے وہ جماعت تھی جنہوں نے دنیا کے اسباب سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی، مسجد میں ہی سوتے تھے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مال دار انصار و مہاجرین جو کھانا وغیرہ ان کو دیتے تھے وہ ان کو کھا لیتے تھے، اس زمانہ میں اکثر مسلمان تنگی میں مبتلا تھے، جس میں مال دار اور نادار برابر ہوتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ شکم سیری کے لیے دامن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ رہتے، ان کے پاس کھانے کو روٹی اور پہننے کو عمدہ پوشاک نہ ہوتی اور خدمت کے لیے کوئی غلامی وغیرہ نہ تھا۔ اصحاب صفہ جن کے تعداد ستر کے قریب تھی، کسی کے پاس بھی پورا لباس نہ ہوتا، بس ایک چادر ہوتی جس کو وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے، ایک دن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے مسجد کی طرف نکلے بھوک نے بے تاب کر رکھا تھا مسجد میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بھوک کی وجہ سے باہر نکل آیا ہوں، لوگوں نے کہا کہ خدا گواہ ہے کہ ہمیں بھی بھوک نے ہی ستایا ہے جس کی وجہ سے گھر سے باہر نکل آئے ہیں۔ پھر وہ سب لوگ اٹھے اور سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں پہنچے۔ آنحضور ﷺ نے پوچھا تم لوگ اس وقت کیوں آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہم بھوک سے دوچار ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے کھجوروں کا ایک طبق منگوایا اور ہر آدمی کو دو دو کھجوریں عنایت فرمائیں پھر فرمایا ''ان کھجوروں کو کھا کر اس پر پانی پی لو، یہ ایک دن کے لئے کافی ہو جائیں گی'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک کھجور کھائی اور دوسری اپنی گود میں ڈال لی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! تم نے یہ کھجور کیوں رکھ لی؟ عبدالرحمٰن بن صخر الدوسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ میں نے اپنی والدہ کے لئے رکھ لی ہے، حضور نبی الرحمت ﷺ نے فرمایا کہ اس کو تم کھا لو میں تمہیں والدہ کے لئے دو اور کھجوریں دے دیتا ہوں'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے وہ کھجور بھی کھا لی اور آنحضور ﷺ نے ان کی والدہ کے لیے دو اور کھجوریں عنایت فرما دیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دینا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ امیمہ بنت صبیح کو اسلام کی دعوت دی جس پر والدہ نے حضور اقدس ﷺ کی شان اقدس میں گستاخانہ کلمات کہے جس سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی دل شکنی ہوئی اور ناگواری ہوئی آپ رضی اللہ عنہ روتے ہوئے بارگاہ نبوی ﷺ میں پہنچے اور عرض کیا میں نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے آپ ﷺ کی شان اقدس میں ایسی بے ادبی کی کہ مجھے بہت ناگوار گزرا۔ بس آپ ﷺ سے دعا فرمادیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کو ہدایت عطا ہو۔ رحمت للعالمین ﷺ نے دست مبارک اٹھائے اور دعا فرمائی: "اللھم اھدام ابی ھریرہ" یعنی اے اللہ! ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کو ہدایت عطا فرما۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا اسلام قبول کرنا

جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ گھر واپس آئے اور دروازے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے امیمہ بنت صبیح نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے قدموں کی آواز سنی تو فرمایا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ! رک جاؤ! ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے پانی کے گرنے کی آواز سنی، امیمہ بنت صبیح رضی اللہ عنہ نے غسل کیا، جلدی سے کپڑے پہنے اور چادر اوڑھی اور دروازہ کھولا اور کہا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ! **اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدان محمد رسول اللہ**۔ قریب تھا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ شدت فرحت سے رو پڑتے کہ آپ رضی اللہ عنہ فوراً بارگاہ رسالت میں واپس پہنچے اور شدت فرحت سے روتے ہوئے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! خوشخبری ہو! اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا کو قبول فرمالیا ہے۔ امیمہ بنت صبیح (ابوہریرہ کی ماں) مسلمان ہوگئی، حضور نبی رحمت ﷺ نے رب العزت کی حمد وثناء بیان کی اور فرمایا کہ بہت اچھا، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ سے دعا کردیں کہ اللہ تعالیٰ میری اور میری والدہ کی محبت اپنے مومن بندوں کے دلوں میں ڈال دے اور اپنے مومن بندوں کی محبت

بھی ہمارے دلوں میں ڈال دے، چنانچہ سرور دو عالم ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! اپنے اس بندے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور اس کی ماں کی محبت اپنے مومن بندوں کے دلوں میں ڈال دے اور ان مومنوں کی محبت بھی ان کے دلوں میں پیدا فرمادے‘‘۔
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس دعا کا اثر بتاتے ہیں کہ کوئی ایسا مومن پیدا نہیں ہوا جو میری بات کو سنتا ہو یا مجھے دیکھتا ہو مگر اس کے دل میں میری محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

فقیہانہ شان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سفر و حضر میں رحمت للعالمین ﷺ کے رفیق اور صاحب رہے گھر میں بھی آتے جاتے تھے، مجلس نبوی ﷺ میں بھی حاضر باش رہے، ان صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک چبوترہ بنالیا تھا جہاں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اہل صفہ کا امیر مقرر کردیا تھا حضور اکرم ﷺ کا جب کھانے کے لیے ان کو جمع کرنے کا ارادہ ہوتا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بلاتے وہ پھر سب کو بلاتے اور جمع کرتے، کیوں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ان کے ٹھکانے کا علم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک روز عشاء کی نماز پڑھ کر لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے لیکن ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مسجد ہی میں رہے تاکہ رات یہیں بسر کرلیں اور رسول اللہ ﷺ بھی اپنے گھر تشریف لے گئے اور تمام اصحاب بھی سو گئے۔ جب رات کا تہائی حصہ گزر گیا تو محبوب کائنات حضور پر نور ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ’’میرے اصحاب رضی اللہ عنہ کو بلالاؤ‘‘ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک ایک کے پاس گئے اور ان کو بیدار کرنے لگے پھر سب بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اندر آنے کی اجازت چاہی، اجازت ملی، سب اندر آئے، وہ تیس کے قریب تھے امام الزاہدین ﷺ نے ان کے سامنے ایک بڑا پیالہ رکھا جس میں جو بنے ہوئے تھے آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک اس میں رکھا پھر فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر شروع کرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ آل محمد ﷺ نے کھانے کے بغیر شام گزاری ہے، یہاں کچھ نہیں ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ سے بے حد محبت تھی بلکہ وہ محبوب رسول ﷺ سے بھی محبت کرتے تھے۔

چنانچہ ایک دن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ (حضرت فاطمہ بنت رسول ﷺ کے صاحبزادے) سے ملاقات ہوئی تو ان سے کہا کہ وہ جگہ مجھے دکھاؤ جہاں رسول اللہ ﷺ تمہارا بوسہ لیا کرتے تھے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کرتہ ہٹایا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کی ناف پر بوسہ دیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو نبی کریم ﷺ کی صحبت اور مجلس سے وابستہ کرلیا تھا آپ کا ہر قول اور عمل آنحضرت ﷺ کے فرمان کے مطابق ہوتا تھا آنحضور ﷺ نے بھی آپ کو اپنا مقرب بنایا تھا اور اس طرح میل جول تھا جیسے کوئی شفیق و مہربان بھائی دوسرے بھائی سے رکھتا ہے، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ کی احادیث اور ارشادات کو محفوظ کیا۔

ایک دن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ ﷺ سے بہت سی احادیث سنتا ہوں لیکن یاد نہیں رہتیں انہیں بھول جاتا ہوں، آنحضور ﷺ نے فرمایا اپنی چادر پھیلاؤ چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے چادر پھیلادی، نبی کریم ﷺ نے اس میں دست مبارک رکھا پھر فرمایا کہ اسے اپنے سینہ سے لگالو، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر کو سینہ سے لگایا تو آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کوئی حدیث نہیں بھولا۔

ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے سوال کرنے پر بڑے دلیر تھے بہت سی باتیں دریافت کرلیا کرتے تھے جو کوئی دوسرا نہ پوچھ سکتا تھا۔ ایک عورت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس مسئلہ پوچھنے آئی وہ پوچھنے لگی کہ اے صحابی رسول ﷺ! میں نے بدکاری کی ہے اور میں نے بچہ بھی جنم دیا اور اس کو قتل کردیا کیا میرے لیے توبہ کی کوئی سبیل ہے؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، تمہارے لیے توبہ کا کوئی

راستہ نہیں ہے، وہ عورت افسوس اور ندامت کرنے لگی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے صبح کی نماز آنحضرت ﷺ کے ساتھ پڑھی، پھر اس عورت کا واقعہ آنحضور ﷺ کے سامنے ذکر کیا اور اپنا جواب بھی ذکر کیا تو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا "تم نے اچھا نہیں کیا۔ کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی تھی:

والذین لایدعون مع اللہ الھاً اخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا یزنون ومن یفعل ذلک یلق اثاماً O یضعف لہ العذاب یوم القیامۃ ویخلد فیہ مھاناً O الامن تاب وامن و عمل صالحاً فاولئک یبدل اللہ سیاتھم و کان اللہ غفوراً رحیما (الفرقان:۶۸۔۷۰)

"اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے اور جس شخص (کے قتل) کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق پر اور وہ زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسا کام کرے گا تو سزا سے اس کو سابقہ پڑے گا کہ قیامت کے روز اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ ذلیل ہو کر رہے گا مگر جو توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا بڑا مہربان ہے"۔

جب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سنی تو جلدی سے اس عورت کے پاس پہنچے اور اس کو یہ آیت سنائی تو وہ عورت سجدہ میں گر گئی اور کہنے لگی کہ اللہ کا شکر ہے جس نے میرے لیے مصیبت سے نکلنے کی راہ نکالی۔

ایک مرتبہ ابو وفرہ رضی اللہ عنہ آئے اور مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضور نبی کریم ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف فرما ہیں، ابو وفرہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ! ایسے شخص کے بارے میں آپ کیا

فرماتے ہیں جس نے کوئی گناہ نہ چھوڑا ہو، کیا اس کے لیے توبہ کا کوئی راستہ ہے؟ آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم مسلمان ہو؟ ابوفرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جی ہاں رحمت للعالمین ﷺ نے فرمایا کہ بس نیک کام کرتے رہو اور برائیوں سے پرہیز کرو، اللہ تعالیٰ ان برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کردیں گے، ابوفرہ رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میرے گناہوں اور برائیوں کا کیا ہوگا؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں تمہارے لیے بھی یہی حکم ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قل یاعبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً" (الزمر:۵۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو: جنہوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا۔

ابوفرہ رضی اللہ عنہ نے فرمان سنا تو اللہ اکبر اور لاالہ الا اللہ کہتے ہوئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ سے علم حاصل کرنے کی بے حد طلب اور حرص رہتی تھی ایک دن حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ایک تیسرے شخص مسجد میں بیٹھے اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کررہے تھے کہ سرکار دوعالم ﷺ تشریف لے آئے جب آپ ﷺ تشریف فرما ہوئے تو سب خاموش ہوگئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنا کام جاری رکھو چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی دعا کرنے لگے اور آنحضرت ﷺ ان کی دعا پر آمین کہنے لگے پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے دعا شروع کی کہ اے اللہ! میرے ان ساتھیوں نے جو کچھ آپ سے مانگا ہے میں وہ بھی مانگتا ہوں اور اس کے ساتھ آپ سے ایسا علم مانگتا ہوں جو پھر مجھ سے فراموش نہ ہو"۔ آنحضور ﷺ نے ان کی دعا پر بھی کہا "آمین" حضرت زید بن ثابت اور ان کے ساتھی عرض کرنے لگے یارسول اللہ ﷺ!

ہم بھی اللہ تعالیٰ سے ایسے علم کی دعا کرتے ہیں جو کبھی فراموش نہ ہو‘ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ دوسی نوجوان تم پر سبقت لے گیا۔ (یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ)

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا بھی بڑا جذبہ تھا چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے کہ اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اسلام کی ہدایت دی اور اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو قرآن سکھایا اور اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعہ احسان فرمایا“

اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ کو خاتم النبیین ﷺ کی احادیث مبارکہ حفظ کرنے کا بھی بے حد اشتیاق تھا چنانچہ ایک دن حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ کون ہے جو پانچ باتیں سیکھ کران پر عمل کرے گا یا عمل کرنے والوں کو سکھائے گا؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! میں کروں گا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اوران کو پانچ باتیں اس طرح بیان فرمائیں، فرمایا کہ ممنوعات سے بچو، سب سے بڑے عابد بن جاؤ گے، اللہ کی تقسیم پر راضی رہو سب سے بڑے مالدار بن جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ مومن بن جاؤ گے، دوسروں کے لیے وہی کچھ پسند کرو جو تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو اس طرح تم (صحیح معنوں میں) مسلمان بن جاؤ گے اور زیادہ نہ ہنسا کرو، کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ جب تک کوئی شخص نماز کے انتظار میں رہتا ہے اس وقت تک وہ حقیقت میں نماز میں رہتا ہے اور فرشتے اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ مسجد میں رہتا ہے فرشتے کہتے ہیں کہ اے اللہ! اس کی مغفرت فرما، اے اللہ! اس پر رحم فرما، جب تک کہ اسے حدث نہ ہو، وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اس نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حدث کیا ہے؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کہ حدث بے وضو ہونے کو کہتے ہیں۔ (رواہ عبدالرزاق)

ایک روز ابو القاسم ﷺ نماز پڑھا رہے تھے کہ حضرت رفاعہ بن نافع رضی اللہ عنہ کو چھینک آئی اور انہوں نے کہا: ”الحمدللہ حمدًا کثیر طیبا مبارکا علیہ کما

یحب ربنا و یرضی ''نماز کے بعد امام الانبیا ﷺ نے دریافت فرمایا کہ نماز میں کس نے کلام کیا ہے؟

(نوٹ: پہلے نماز میں کلام کرلیا کرتے تھے پھر ممانعت ہوگئی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نظر حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ پر پڑی پھر حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی ﷺ! میں نے کہا، آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کیا کہا تھا، رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے یہ کلمات کہے تھے''الحمد لله حمداً کثیراً طیباً مبار کا علیه کمایحب ربنا ویرضی ''شافع محشر ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم ہے کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تیس سے زیادہ فرشتے ان کلمات کو لینے کے لیے آگے بڑھے کہ ان میں سے پہلے کون ان کلمات کو لے کر آسمان پر چڑھے۔

ایک دن نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تین کام ایسے ہیں کہ اگر لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ اس میں کیا خیر و برکت رکھی ہے تو اس کو حاصل کرنے کے شوق میں تیر (وکمان) لے کر نکل آئیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فوراً دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! وہ تین کام کیا ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایک تو نمازوں کے لیے اذان دینا، دوسرا جماعت کے لیے جلدی کرنا اور تیسرا پہلی صف میں نماز پڑھنا'' ایک مرتبہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور دو رکعتیں پڑھے بغیر مسجد میں بیٹھ گیا رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تم نے بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں کیوں نہیں پڑھیں؟ وہ کہنے لگا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے آپ ﷺ کو اور دوسرے لوگوں کو دیکھا کہ وہ بیٹھے ہوئے ہیں میں بھی بیٹھ گیا، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو جب تک دو رکعتیں نہ پڑھ لے نہ بیٹھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے علم و عرفان سے عورتیں بھی فیضیاب ہوتی تھیں، اگر کسی عورت سے کوئی کام خلاف شرع سرزد ہوجاتا تو فوراً ٹوک دیتے تھے اور اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا حکم اس کو بتادیتے ایک مرتبہ ایک عورت کو دیکھا کہ

اس کے سیر اہن سے خوشبو آرہی ہے پوچھا تو مسجد سے آرہی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عورت کی نماز قبول نہیں فرماتے جو خوشبو لگاتی ہو، یہاں تک کہ وہ واپس جا کر اس طرح غسل کرے (دھوئے) جس طرح جنابت کا غسل کیا جاتا ہے۔ ایک دن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! جب ہم آپ ﷺ کا دیدار کرتے ہیں تو ہمارے دلوں میں رقت پیدا ہو جاتی ہے اور ہم آخرت والے لوگوں میں سے ہو جاتے ہیں لیکن جب آپ ﷺ سے فراق ہوتا ہے تو دنیا کے کاموں میں لگ جاتے ہیں اور بیوی بچوں میں مشغول ہو جاتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہاری وہی حالت رہے جو میرے پاس رہنے سے ہوتی ہے تو فرشتے تم سے ملاقات کیا کریں اور راستوں میں وہ تم سے مصافحہ کریں اور اگر تم سے گناہ کا صدور نہ ہو تو اللہ تعالیٰ ایک قوم کو لے آئیں جو اتنے گناہ کرے کہ ان کے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں پھر وہ معافی مانگے اور اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہو کر اس کو معاف کر دے“۔ (رواہ ابن النجار)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دیہاتی شخص نے حضور اکرم ﷺ کو ایک جوان اونٹنی ہدیہ میں دی تو آنحضور ﷺ نے اس کے بدلہ میں چھ جوان اونٹنیاں دے دیں تو اس دیہاتی آدمی کو ناگوار ہوا جب یہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچی تو فرمایا کہ ”فلاں شخص نے مجھے ایک اونٹنی ہدیہ میں دی تو میں نے اس کے بدلہ میں چھ جوان اونٹنیاں اس کو دے دیں اب وہ اس پر ناراض ہو گیا ہے میں نے اس بات کا ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ صرف قرشی نصاری یا ثقفی یا دوسی (یعنی ان قبائل سے تعلق رکھنے والے) شخص کا ہدیہ ہی قبول کروں“۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

وفات

جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن رضی

اللہ عنہ آئے، دیکھا کہ آپ رضی اللہ عنہ شدید درد و تکلیف میں مبتلا ہیں تو ان کو گلے لگایا اور دعا دی: اللھم اشف اباھریرۃ! یعنی اے اللہ! ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو شفا دے! ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ اے اللہ! ان کی دعا قبول نہ فرما ان کی دعا قبول نہ فرما۔

اس خدا کی قسم ہے جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ ایک آدمی اپنے بھائی کی قبر کے پاس سے گزرے گا تو آرزو کرے گا کہ کاش وہ اس کی جگہ ہوتا''

لوگ تو ان کے لیے دعا کرتے کہ مرض سے شفاء حاصل ہو مگر وہ یہ دعا کرتے کہ اے اللہ! میں تیری ملاقات کو پسند کرتا ہوں پس تو بھی میری ملاقات کو پسند فرما'' ایک دن جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن صخر رضی اللہ عنہ اپنی بیماری میں مبتلا تھے یہ دعا کرنے لگے: اے اللہ! میں ۶۰ ھ سے پہلے دنیا سے رخصت ہو جاؤں (آپ رضی اللہ عنہ یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ کاش وہ ۶۰ ھ سے پہلے فوت ہو جائیں)

کسی نے پوچھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کیوں روتے ہیں؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہاری اس دنیا پر نہیں روتا ہوں بلکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سفر دور دراز کا ہے اور توشہ بھی بہت تھوڑا ہے اور اس کشمکش میں مبتلا ہوں کہ میرا ٹھکانہ جنت ہو گا یا دوزخ''۔

جب وفات کا وقت آپہنچا تو فرمایا کہ (جب میری وفات ہو جائے تو) یہاں پر خیمہ نہ لگانا اور مجھے جلدی لے جانا اور میرے ہمراہ انگیٹھی نہ لے جانا''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اٹھہتر (۷۸) سال کی عمر پا کر دنیا فانی سے رخصت ہو گئے، آپ رضی اللہ عنہ کی وفات ۵۹ ھ کو ہوئی۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ

آپ کا پورا نام ''معاذ بن جبل بن عمرو'' ہے اور کنیت ابو عبدالرحمٰن ہے۔ نسب نامہ یہ ہے:

''معاذ بن جبل بن عمرو بن اوس بن عائذ بن عدی بن کعب بن عمرو بن ادی بن سعد بن علی بن اسد بن سارده بن یزید بن جشم بن خزرج اکبر''

سعد بن علی کے دو بیٹے تھے، سلمہ اور ادی، سلمہ کو نسل سے بنو سلمہ ہیں، جن کی اولاد میں حضرت ابوقتادہؓ، جابر بن عبد اللہؓ، کعب بن مالکؓ، عبداللہ بن عمرو بن حرام جیسے مشہور صحابہ گذرے ہیں۔ ان لوگوں کے ماسوا اور بھی بہت سے بزرگوں کو اس خاندان سے انتساب تھا، لیکن سلمہ کے دوسرے بھائی ادی کے گھر میں رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے وقت صرف ایک فرزند تھا جس کی وفات پر خاندان ادی کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔

بنو ادی کے مکانات ان کے بنو اعمام بنو سلمہ کے پڑوس میں واقع تھے، مسجد قبلتین جہاں تحویل قبلہ ہوا تھا یہیں واقع تھی، حضرت معاذ کا گھر بھی یہیں تھا۔ (سیر الصحابہ، ۵/۱۳۹)

حضرت معاذؓ کا قبول اسلام

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں خلقت کے اعتبار سے حق کو قبول کرنے کا مادہ موجود تھا، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا تعلق چونکہ مدینہ سے تھا، لہٰذا نبوت کے بارہویں سال جب مدینہ میں اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس کے قبول کرنے میں ذرا بھی تردد سے کام نہ لیا۔

تعلیم و تربیت

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اپنے بچپن ہی سے ایک ذہین اور ہونہار

شخصیت کے اعتبار سے جانے اور پہچانے جاتے تھے، جب نبی مکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ آپ کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور چند ہی دنوں میں فیض نبوت کے اثر سے اسلام کی تعلیم کا اعلیٰ نمونہ بن گئے اور ان کا شمار صحابہ کے برگزیدہ افراد میں ہونے لگا، عروج یہاں تک پہنچا کہ آپ کو زبان رسالت (ﷺ) سے اعتماد کی یہ سند عطا ہوئی۔

"اعلم امتی بالحلال والحرام معاذ بن جبل"

''میری امت میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں''

یمن کی امارت اور دینی خدمات

۹ھ میں آنحضرت ﷺ غزوۂ تبوک سے تشریف لائے تھے کہ رمضان میں یمن کا قاصد ''ملوک حمیر'' اہل یمن کے ایمان کی خوشخبری لے کر مدینہ آیا، اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے یمن کی امارت کے لئے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو تجویز فرمایا۔

جب آپ یمن سے گورنری کی میعاد ختم کر کے مدینہ واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو چکا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت تھا، حضرت معاذؓ مال و متاع کے ساتھ آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ ان کے گذر اوقات کے بقدر ضرورت علیحدہ کر کے بقیہ سارا سامان ان سے وصول کر لیا جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان کو رسول اللہ ﷺ نے حاکم بنا کر بھیجا تھا، اگر ان کی مرضی ہوگی اور میرے پاس لائیں گے تو لے لوں گا، ورنہ ایک حبہ نہ لوں گا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یہ صاف جواب ملا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور ان سے اپنا خیال ظاہر کیا، انہوں نے کہا کہ مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے صرف اس لئے بھیجا تھا کہ وہاں رہ کر اپنے نقصان کو پورا کرلوں میں کچھ نہ دوں گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو کر واپس چلے آئے، تاہم وہ اپنے خیال پر قائم تھے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے گواس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے انکار کردیا، لیکن آخر تائید غیبی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کی، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ پانی میں غرق ہورہے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر نکالا اور اس مصیبت سے نجات دی، سو کے اٹھے تو سیدھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور خواب بیان کرکے کہا کہ جو آپ نے کہا تھا مجھے منظور ہے وہاں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور خواب کا پورا واقعہ سنا کر قسم کھائی کہ جو کچھ ہے سب لاکردوں گا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''میں تم سے کچھ نہ لوں گا، میں نے تم کو ہبہ کردیا'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا ''اب اپنے پاس رکھو، اب تمہیں اجازت مل گئی''۔

یہ مراحل طے ہوگئے تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے شام کا قصد کیا اور اپنے اہل وعیال کو لے کر وہیں سکونت پذیر ہوگئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، ان کے دور خلافت میں فتوحات اسلامی کا سیلاب بلاد شام سے گزر رہا تھا، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بھی فوج میں شامل تھے اور میدانوں میں داد شجاعت دیتے تھے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اگرچہ اپنے عہد کے تمام غزوات میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے، تاہم دو موقعوں پر ان کو نہایت ممتاز فوجی عہدے تفویض ہوئے، ایک مرتبہ سفارت سے واپس آئے تو لڑائی کی تیاریاں شروع ہوئیں، اس موقع پر ان کو جو امتیاز حاصل ہوا، وہ یہ تھا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان کو میمنہ کا افسر بنادیا۔

مجلس شوریٰ کی نمائندگی

مجلس شوری کی باضابطہ شکل اگرچہ عہد فاروقی میں وجود میں آئی لیکن اس کا خاکہ عہد صدیقیؓ میں تیار ہوچکا تھا، چنانچہ ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جن لوگوں سے سلطنت کے مہمات امور میں مشورہ لیتے تھے ان میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا نام نامی بھی داخل تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ

عنہ کے زمانہ خلافت میں مجلس شوری کا باقاعدہ انعقاد کیا گیا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اس زمانہ میں بھی اس کے رکن تھے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بحیثیت فقیہ

فقہ کا موضوع عقائد نہیں نہ اخلاقیات بلکہ احکام ہیں جو حلال وحرام اور واجبات ومکروہات بیان کرتے ہیں۔ حضرت خاتم النبیین ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں حلال وحرام کا سب سے زیادہ جاننے والا (یعنی فقہ کا سب سے بڑا ماہر) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو قرار دیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اعلم بالحلال والحرام معاذ بن جبل (جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۲۰)

حضرت انس رضی اللہ عنہ یہ بھی کہتے ہیں آنحضرت ﷺ کے عہد میں چار شخصوں نے پورا قرآن جمع کیا تھا ان چار میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ (رواہ الترمذی)

حضور ﷺ کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فقیہ ہونے کی سند دینا

حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو ان سے دریافت فرمایا کس طرح فیصلے کیا کرو گے انہوں نے کہا میں فیصلہ کتاب اللہ سے لوں گا۔ وہاں نہ ملے تو سنت کی رُو سے فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے پوچھا اگر سنت میں بھی نہ ملے تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا:

اجتھد برائی میں اپنی رائے سے استنباط کروں گا۔ اس سے پتہ چلا کہ ان دنوں اہل الرائی عیب کی نظر سے نہ دیکھے جاتے تھے ورنہ حضور ﷺ اس پر ضرور نقض فرماتے۔ آپ نے ان پر اعتراض کرنے کی بجائے فرمایا۔

الحمدلله الذی وفق رسول الله . لمایرضی به رسول الله (جامع ترمذی ج ۱ ص ۱۵۹، مسند امام احمد بن حنبل، سنن ابی داؤد، سنن دارمی)

حمد کے لائق وہ ذات ہے جس نے اللہ کے رسول کے ایلچی کو اس

بات کی توفیق دی جس سے خدا کا رسول خود راضی ہوا۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے موضوع پر ایک ایسی ضرورت محسوس کی ہے جس کے لیے قرآن وسنت کی صریح موجود نہ ہوان میں رائے سے کام لینا اور اجتہاد کرنا اسے شریعت نے جائز کہا ہے سو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث کے بعد ہمیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں وہ ایک بڑی کھلی گمراہی میں ہیں۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے مسائل جن میں قرآن کی صریح رہنمائی موجود نہ ہوان میں رائے سے کام لینا اور انہیں قرآن وسنت کی جزئیات میں سے کسی جزئی پر قیاس کرنا ہرگز کوئی عیب نہیں نہ ان دنوں دینی رائے کو کوئی عیب سمجھا جاتا تھا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ مجتہد درجے کے صحابی تھے۔ آپ کو حضور ﷺ نے خود اجتہاد کی اجازت دی تھی اور دوسروں کے لیے آپ کے اجتہاد کو واجب القبول ٹھہرایا تھا جو مجتہد نہیں اس کے لیے ضروری قرار پایا کہ وہ ان صلحائے امت کی پیروی کرے جو اجتہاد کا درجہ رکھنے والے فقیہ ہوں۔ دوسرے لوگ ان کے فیصلوں پر چلیں یہی ایک تقلید کی راہ ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک موقعہ پر فرمایا::

ان معاذاقدسن لکم سنة کذلک فافعلوا (سنن أبی داؤد، ج ۱ ص ۷۴۔ فتح القدیر، ج ۲)

معاذ رضی اللہ عنہ نے بے شک تمہارے لیے ایک راہ قائم کردی ہے اب تم اس کی اقتداء میں چلو۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس دور سے ہی فقہاء صحابہ کی پیروی چلی آرہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فقیہ ہونے کی سند دینا

حافظ ذہبی نقل کرتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جابیہ میں جو تاریخی خطبہ دیا اس میں فرمایا:

من اراد یسئال عن الفقه فلیات معاذا (تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۰)

جو شخص فقہ کی کوئی بات پوچھنا چاہے وہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔

اس پس منظر میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی فقہی رائے محض ایک رائے قرار دے کر رد نہیں کی جاسکتی۔ ان کی فقہی آراء غیر مجتہدین کے لیے خود ایک شاہراہ ہے جو کتاب وسنت میں لپٹے مضامین کو اس نئے دور میں ہر موقع ضرورت پر واضح کر رہی ہے۔

حافظ ذہبی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

کان من نجباء الصحابة وفقها ئهم (ایضاً ج۲ ص۱۸)

آپ اشرف درجے کے صحابی تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں جو لوگ فقہاء تھے۔

آپ ان میں سے تھے۔

آپ ہی فیصلہ کریں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں فقہ کی کس درجے میں عظمت تھی اور فقہاء صحابہ کس اعتماد سے قوم کے امام سمجھے جاتے تھے۔

عن الاسود بن یزید قال اتانا معاذ بن جبل بالیمن معلما او امیرا فسالناه عن رجل توفی وترک ابنته واخته فاعطیٰ الابنة النصف والاخت النصف

(صحیح بخاری ج۲ ص۹۹۷)

اسود بن یزید کہتے ہیں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ہمارے ہاں یمن

میں معلم یا امیر ہو کر آئے۔ ہم نے آپ سے پوچھا ایک شخص فوت ہو گیا اور اس نے ایک بیٹی اور ایک بہن وارثوں میں چھوڑی۔ آپ نے اس کے ترکہ کا ایک نصف بیٹی کو اور دوسرا نصف بہن کو دلوایا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جب یہ فتویٰ دیا تو کیا کسی نے ان سے اس مسئلہ پر دلیل مانگی؟ یا اعتماداً بلا طلب دلیل اسے قبول کیا؟ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تابعین حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فتوے لیتے تھے اور ان سے اس وقت دلیل کا مطالبہ نہ کیا جاتا تھا۔ امت اس دور میں بھی فقہاء پر اعتماد کرتی تھی اور امت میں اس انداز میں تقلید اس وقت بھی جاری تھی، ایک مثال لیجئے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا مسلک یہ تھا کہ کافر تو مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔ لیکن مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے۔ آپ کا اجتہاد اس آیت کی روشنی میں تھا۔

ولن یجعل اللہ للکافرین علیٰ المومنین سبیلاً (النساء ۱۴۱)

اور اللہ ہر گز نہ دے گا کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی کوئی راہ۔

مسلمان بایں طور کہ اصل مالک روئے زمین کے وہی ہیں۔ خلق لکم مافی الارض جمیعاً۔ اور جو کچھ کفار کے پاس ہے وہ بھی من حیث الاصل مسلمانوں کا ہی حق تھا۔ جس پر انہوں نے بلطائف الحیل قبضہ کر رکھا ہے سو اگر کسی بھی عنوان سے کافروں کا مال مسلمانوں کو ملتا ہے تو مسلمانوں کی طرف سے نہ نہیں ہونی چاہیے۔ حق بحقدار رسید، کسی کافر کا بیٹا حقدار ہے وہ اپنے باپ کا مال کیوں کسی کے پاس جانے دے، علامہ عینی اس اختلاف کو اس طرف سے بیان کرتے ہیں:

واما المسلم فھل یرث من الکافر ام لافقالت عامة الصحابة رضی اللہ عنھم لا یرث وبہ اخذ علماء نا وھذا الاستحسان والقیاس ان یرث وھو قول معاذ بن جبل ومعاویة بن ابی سفیان وبہ اخذ مسروق و محمد بن الحنفیة و محمد بن علی بن الحسین (عمدۃ القاری ج ۲۳ ص ۲۶۰)

مسلم کافر کا وارث ہوسکتا ہے یا نہیں، جمہور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کے قائل ہیں کہ مسلم اس کا وارث نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ہاں یہی مسئلہ ہے اور یہ فیصلہ بطریق استحسان ہے اور قیاس مقتضی ہے کہ وہ وارث ہے صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ بھی یہی ہے اور تابعین میں امام مسروق امام محمد بن حنفیہ اور امام باقر کی رائے بھی یہی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور حکومت میں اگر اپنے اس فتوے پر عمل کیا تو یہ بطور ایک مجتہد ان کی رائے تھی اور کئی دوسرے مجتہدین بھی اس میں ان کے ساتھ تھے۔ سواسے بدعت کہنا کسی طرح درست نہیں۔ بدعت کا دور تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بات کیسے بدعت ہوسکتی ہے ان کی اتباع فرقہ ناجیہ کا نشان ہے۔ ما انا علیہ واصحابی وہ خود بدعت کا مورد کیسے بن سکتے ہیں۔

آپ کی فقہی شان کی ایک یہ بھی شہادت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آپ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا اور انہیں مسائل غیر منصوصہ میں اجتہاد کرنے کی اجازت دی۔ آپ کی نظر میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک مجتہد کی پوری اہلیت رکھتے تھے اور بجا طور پر ایک حاذق مجتہد تھے۔ حضور ﷺ نے اس سلسلہ میں آپ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله لما يرضى به رسول الله (مشکوٰۃ ص ۳۲۴ رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی)

سب تعریف اس خدا کی جس نے اپنے رسول کے رسول کو اس بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جابیہ میں جو تاریخی خطبہ دیا تھا۔ اس میں فرمایا تھا کہ

من اراد ان يسأل عن الفقه فليأت معاذاً ومن اراد ان يسأل عن المال فليأتني فان الله جعلني له خازنا

وقاسما (تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۰)

جو شخص فقہ کا کوئی مسئلہ جاننا چاہے وہ معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور جو شخص مال کے بارے میں سوال کرنا چاہے وہ میرے پاس آئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کا خازن اور تقسیم کنندہ بنایا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں علم فقہ کی کیا عظمت تھی اور مجتہد صحابہ رضی اللہ عنہم کی اجتہادی شان کے کیا چرچے ہوتے تھے۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

کان من بجاء الصحابة وفقها وفقها نهم (ایضاً ص ۱۸)

آپ بلند شان صحابہ اور ان کے فقہاء میں سے تھے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی ایک بے مثال فضیلت

شروع زمانہ میں جو لوگ دیر سے پہنچتے ، اور کچھ رکعتیں چھوٹ جاتیں تو وہ نمازیوں سے اشارہ سے پوچھ لیتے کہ کتنی ہوئیں، اور وہ اشارے سے جواب دے دیتے، اس طرح لوگ فوت شدہ رکعتیں پوری کر کے صف نماز میں مل جاتے تھے، ایک دن جماعت ہو رہی تھی اور لوگ قعدہ میں تھے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ آئے اور دستور کے خلاف قبل اس کے کہ رکعتیں پوری کرتے جماعت کے ساتھ قعدہ میں شریک ہوگئے، آنحضرت ﷺ نے سلام پھیرا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر بقیہ رکعتیں پوری کیں، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا:

قدسن لکم فهکذا فاصنعوا کماصنع معاذ

یعنی معاذ نے تمہارے لئے ایک طریقہ نکالا ہے تم بھی ایسا ہی کیا کرو۔

یہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے لئے کتنی قابل فخر فضیلت ہے کہ ان کی سنت تمام مسلمانوں کے لئے واجب العمل قرار پائی اور آج تک اسی پر عمل درآمد ہے اور دنیا کے

سارے مسلمان اسی کے مطابق اپنی فوت شدہ رکعتیں ادا کرتے ہیں۔ (رواہ احمد، ۲۱۰۲۳)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا مثل عورتیں نہ پیدا کریں گی

ایک مرتبہ ایک اور پیچیدہ صورت پیدا ہوئی، ایک حاملہ عورت کا شوہر دو برس سے غائب تھا، لوگوں کو شبہ ہوا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ موجود تھے، بولے کہ عورت کے رجم کا آپ کو بے شک حق ہے لیکن بچہ کے رجم کرنے کے کیا معنی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت چھوڑ دیا اور فرمایا وضع حمل کے بعد سنگسار کیا جائے، لڑکا پیدا ہوا تو خوبی قسمت سے اپنے باپ کے بالکل مشابہ نکلا، باپ نے دیکھا تو قسم کھا کر کہا کہ یہ تو میرا بیٹا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ملی تو فرمایا کہ ''معاذ رضی اللہ عنہ کا مثل عورتیں نہ پیدا کریں گی، اگر معاذ رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا''

قدرت نے جس فیاضی سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو کمالات عطا فرمائے تھے، اس کا اعتراف طبقہ صحابہ میں ہر ایک کو تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

عجزت النساء ان یلدن مثل معاذ (سیر الصحابہ، ۱۶۲/۵)

معاذ رضی اللہ عنہ جیسا شخص پیدا کرنے سے عورتیں عاجز ہیں۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی دو بیویوں کا قصہ

حضرت یحیٰی بن سعید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دو بیویاں تھیں ان میں سے جس کی باری کا دن ہوتا اس دن دوسری کے گھر سے وضو نہ کرتے پھر دونوں بیویاں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملک شام گئیں اور وہاں دونوں اکٹھی بیمار ہوئیں اور اللہ کی شان دونوں کا ایک ہی دن انتقال ہوا، لوگ اس دن بہت مشغول تھے اس لئے دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے دونوں میں قرعہ ڈالا کہ کس کو قبر میں پہلے رکھا جائے۔

حضرت یحیٰی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دو

بیویاں تھیں۔ جب ایک کے ہاں ہوتے تو دوسری کے ہاں سے پانی بھی نہ پیتے۔
(حیاۃ الصحابہ، ۲/۷۷۲)

فقیہانہ شان

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ملک شام کی طرف روانہ ہوگئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے شام جانے سے مدینہ والوں کو فقہی مسائل میں اور فتویٰ لینے میں بڑی دقت پیش آرہی ہے۔ کیونکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ مدینہ میں لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے تھے میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے (اللہ ان پر رحمت نازل فرمائے) یہ بات کی تھی کہ وہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں روک لیں کیونکہ (فتویٰ میں) لوگوں کو ان کی ضرورت ہے لیکن انہوں نے مجھے انکار کردیا اور فرمایا کہ ایک آدمی اس راستہ میں جاکر شہید ہونا چاہتا ہے تو میں اسے نہیں روک سکتا ہوں۔ میں نے کہا اللہ کی قسم! جو آدمی اپنے گھر میں رہ کر شہر والوں کے بڑے بڑے (دینی) کام کررہا ہے وہ اگر اپنے بستر پر بھی مرجائے گا تو بھی وہ شہید ہوگا۔ حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی مدینہ میں لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (حیاۃ الصحابہ، ۱/۶۰۰)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی فقہی دسترس

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جابیہ مقام میں لوگوں میں بیان فرمایا اور ارشاد فرمایا اے لوگو! تم میں سے جو قرآن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہے وہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس جائے اور جو میراث کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے وہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس جائے اور جو کوئی فقہی مسائل پوچھنا چاہتا ہے وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پاس جائے اور جو مال لینا چاہتا ہے وہ میرے پاس آجائے کیونکہ اللہ نے مجھے مال کا والی

اور اس کا تقسیم کرنے والا بنایا ہے۔ (حیاۃ الصحابۃ، ۲/۲۲۹)

علماء نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس بیان کو کسر نفسی پر محمول کیا ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شمار بھی عہد صحابہ کے ان اہل علم و دانش میں ہوتا ہے جن کی علمی شان کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا خوف آخرت

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو وہ رونے لگے تو ان سے کسی نے پوچھا آپ کیوں رو رہے ہیں؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کی قسم! نہ تو میں موت سے گھبرا کر رو رہا ہوں اور نہ ہی دنیا کو پیچھے چھوڑ کر جانے کے غم میں رو رہا ہوں بلکہ اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ (انسانوں کی) دو مٹھیاں ہیں ایک مٹھی جہنم کی آگ میں جائے گی اور دوسری جنت میں اور مجھے معلوم نہیں کہ میں ان دونوں مٹھیوں میں سے کس میں ہوں۔ (حیاۃ الصحابۃ، ۳/۴۷)

موت کے مہمان کو خوش آمدید

جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو فرمایا دیکھو کیا صبح صادق ہوگئی ہے؟ ایک آدمی نے آکر بتایا کہ ابھی نہیں ہوئی پھر فرمایا دیکھو کیا صبح صادق ہوگئی ہے؟ پھر کسی نے آکر بتایا کہ ابھی نہیں ہوئی بالآخر ایک آدمی نے آکر بتایا کہ صبح صادق ہوگئی ہے تو فرمایا میں اس رات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں جس کی صبح دوزخ کی آگ کی طرف لے جائے۔ خوش آمدید ہو موت کو، خوش آمدید ہو اس مہمان کو جو بہت لمبے عرصے کے بعد ملنے آیا ہے۔ جس سے مجھے بہت محبت ہے لیکن وہ ایسے وقت آیا ہے جبکہ میرے ہاں فاقہ ہے۔ اے اللہ! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے دنیا سے اور اس میں زیادہ عرصہ تک رہنے سے اس وجہ سے محبت نہیں ہے تاکہ میں نہریں کھودوں اور درخت لگاؤں بلکہ اس وجہ سے ہے تاکہ میں سخت گرمی کی دوپہر میں پیاس برداشت کروں یعنی گرمیوں میں روزے رکھوں اور مشقت کے مواقع پر مشقت اٹھاؤں اور علم

کے حلقوں میں علماء کی خدمت میں دوزانو بیٹھوں۔ (حیاۃ الصحابہ، ۳/۱۸۴)

لا الہ الا اللہ کی برکت

کثیر بن مرہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ہم سے اپنے مرض الوفات میں فرمایا ''میں نے نبی کریم ﷺ سے ایک بات سنی تھی، جسے میں چھپایا کرتا تھا آج تمہیں وہ بات بتا دیتا ہوں، میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

''من کان آخر کلامہ لا الہ الا اللہ وجبت لہ الجنۃ''

(رواہ ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۱۱۶ وابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۷۸۶ واحمد ۲۱۔۲۴۴)

''جس کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہو، جنت اس کے لئے واجب ہوگئی''۔

ایک اور روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو فرمایا:

''میرے اوپر سے خیمے کا پردہ ہٹادو، میں تمہیں ایک ایسی حدیث سناتا ہوں جو میں نے حضور ﷺ سے سنی ہے۔ اب تک تم سے اس لئے بیان نہیں کی تھی کہ کہیں تم اس پر تکیہ کر کے عمل سے محروم نہ ہو جاؤ۔ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے جو شخص دل کے اخلاص اور یقین کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہے گا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جہنم کی آگ اسے چھو بھی نہ سکے گی''۔ (رواہ احمد، ۲۱۰۴۸)

اپنے پھولوں کا پاسباں نہ رہا

عہد فاروقی میں ملک شام کی تمام فوج حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت تھی ۱۸ھ میں نہایت زور وشور سے شام میں طاعون نمودار ہوا، جو طاعون عمواس کے نام سے مشہور ہے، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اسی میں وفات پائی، انتقال کے قریب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین بنایا اور چونکہ نماز کا وقت آچکا تھا، حکم دیا کہ وہی

نماز پڑھائیں ادھر نماز ختم ہوئی، ادھر انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کچھ دنوں سپہ سالاری کے منصب پر فائز رہے۔

وبا اسی طرح زوروں پر تھی اور لوگ سخت پریشان تھے، حضرت عمرو بن عاصؓ نے کہا کہ ''یہاں سے ہٹ چلو، یہ بیماری نہیں بلکہ آگ ہے'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے سنا تو نہایت برہم ہوئے، کھڑے ہوکر ایک خطبہ دیا، جس میں عمرو رضی اللہ عنہ کو سخت سست کہا، اس کے بعد فرمایا کہ ''یہ وبا بلاء نہیں خدا کی رحمت ہے، نبی کی دعوت ہے اور صالحین کے اٹھنے کی ساعت ہے میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا تھا کہ مسلمان شام میں ہجرت اختیار کریں گے، شام اسلام کے جھنڈے کے نیچے آجائے گا، پھر ایک بیماری پیدا ہوگی، جو پھوڑے کی طرح جسم کو زخمی کرے گی، جو اس میں مرے گا شہید ہوگا اور اس کے اعمال پاک ہوجائیں گے، الٰہی اگر میں نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے تو یہ رحمت میرے گھر میں بھیج اور مجھ کو اس میں کافی حصہ دے''۔

تقریر ختم کر کے اپنے بیٹے کے پاس آئے جن کا نام عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ تھا، دعا قبول ہوچکی تھی دیکھا تو بیٹا اسی بیماری میں مبتلا تھا، باپ کو دیکھ کر کہا، الحق من ربک فلا تکونن من الممترین، یہ موت جو حق ہے، خدا کی طرف سے ہے، شک کرنے والوں میں اپنا شمار نہ کروایئے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، ستجدنی ان شاء اللّٰہ من الصابرین۔ تو انشاء اللہ مجھے صابروں میں پائے گا، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے انتقال کیا، بیٹے کے فوت ہونے سے پہلے دو بیویاں اسی بیماری میں مرچکی تھیں، اب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ تنہا رہ گئے تھے، رات مقررہ آئی تو خدا کا بندہ خاص بھی دائرہ رحمت میں شامل ہوا، دائیں ہاتھ کی کلمہ والی انگلی میں پھوڑا نکلا، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نہایت خوش تھے، فرماتے تھے کہ تمام دنیا کی دولت اس کے سامنے ہیچ ہے، تکلیف اس قدر تھی کہ بے ہوش ہوجاتے تھے بااین ہمہ جب ہوش آتا تو کہتے ''خدایا مجھ کو اپنے غم میں غمگین کر کیونکہ میں تجھ سے نہایت محبت رکھتا ہوں اور اس کو تو خوب جانتا ہے'' پھر بے ہوش ہوجاتے جب افاقہ ہوتا تو پھر یہی فرماتے وفات کی رات

بھی عجیب رات تھی، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نہایت بے چین تھے، بار بار پوچھتے تھے
''دیکھو صبح ہوئی''، لوگ کہتے تھے کہ ابھی نہیں، جب صبح ہوئی اور خبر کی گئی تو فرمایا:

اس رات سے خدا کی پناہ جس کی صبح جہنم میں داخل کرتی ہو، مرحبا اے موت! مرحبا! تو اس دوست کے پاس آئی جو فاقہ کی حالت میں ہے، الٰہی میں تجھ سے جس قدر خوف کرتا تھا، تجھ کو خوب معلوم ہے، آج میں تجھ سے بڑی امیدیں رکھتا ہوں میں نے کبھی دنیا اور درازی عمر کو اس لئے پسند نہیں کیا کہ درخت بونے اور نہر کھودنے میں وقت صرف کرتا بلکہ اس لئے چاہتا تھا کہ فضائح وفواحش سے دور رہوں، کرم و جود کو فروغ دوں اور ذکر کے حلقوں میں علماء کے پاس بیٹھوں''

وفات کا وقت قریب پہنچا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ گریہ و بکا میں مشغول تھے، لوگوں نے تسلی دی کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں، اس کے ماسوا فضائل و مناقب سے ممتاز ہیں، آپ کو رونے کی کیا ضرورت؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے نہ موت کی گھبراہٹ ہے اور نہ دنیا چھوڑنے کا غم مجھے عذاب وثواب کا خیال ہے، اسی حالت میں روح مطہر جسم سے پرواز کرگئی اور خالق کون ومکاں کا پیارا اپنے محبوب آقا کے جوار رحمت میں پہنچ گیا۔

وفات کے وقت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی عمر شریف ۳۶ سال کی تھی، اور ۱۸ھ تھا، وفات بھی نہایت مبارک خطہ میں واقع ہوئی، بیت المقدس اور دمشق کے درمیان غور نامی ایک صوبہ تھا جس میں بیسان ایک مشہور شہر تھا، جو نہر اردن کے قریب واقع تھا، اسی میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی، شہر کے مشرقی طرف وہ مقدس مقام واقع تھا جہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھالئے گئے تھے، مدفن کے لئے وہی مقام تجویز ہوا اور نعش مبارک وہیں سپرد خاک کی گئی۔ (سیر الصحابہ،۵/۱۵۴)

باغ باقی ہے باغباں نہ رہا
اپنے پھولوں کا پاسباں نہ رہا
کارواں تو رواں رہے گا مگر

ہائے وہ میر کارواں نہ رہا

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا حلیہ مبارک

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا رنگ سفید، چہرہ روشن، قد دراز اور آنکھیں سرمگیں تھیں، بال سخت گھونگریالے، آگے کے دانت صاف اور چمکدار، بات کرنے میں دانت کی چمک ظاہر ہو جاتی تھی، جس کو ان کا ایک عقیدت مند ''نور'' اور ''موتی'' سے تعبیر کرتا ہے۔ آواز بہت خوبصورت اور گفتگو نہایت شیریں تھی، حسن ظاہری کے لحاظ سے وہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں ممتاز تھے۔

اولاد و احفاد

بعض مورخین کا خیال یہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ہاں اولاد نہیں ہوئی، لیکن مستند تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ایک بیٹا تھا جس کا نام ''عبدالرحمٰن'' تھا، صاحب استیعاب کے مطابق یہ بیٹا جنگ یرموک میں شریک تھا اور ۱۸ھ میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے پہلے وفات پائی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

آپ عبد مناف پر جا کر آنحضرت ﷺ کے ہم جد ہو جاتے ہیں۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ دونوں عبد مناف کی اولاد ہیں۔ حضور ﷺ کے اعلان نبوت کے وقت آپ کی عمر پانچ سال کی تھی، آپ صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لے آئے تھے لیکن آپ نے اسے اپنے والد سے چھپائے رکھا اور فتح مکہ کے دن اپنے ایمان کا اظہار فرمایا۔ ذہنی طور پر آپ حضور ﷺ کے مقابل نہ آنا چاہتے تھے۔ اس لیے جنگ بدر اور جنگ خندق میں آپ اپنے والد سفیان کے ساتھ جنگ میں نہ نکلے تھے۔ اسلام لانے کے ساتھ ہی آپ نے حضور ﷺ کی صحبت لازم پکڑی اور آپ کے پاس ہی رہنے لگے۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ نے انہیں اپنا کاتب مقرر کرلیا اور پھر آپ کو کاتب وحی ہونے کی منزلت بھی دی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور آپ اب ہمہ تن حضور ﷺ کی خدمت میں رہتے تھے اور وحی لکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے آپ کو دعا دی۔

اللهم اجعله هادياً مهدياً و اهدبه. (جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۴۷)

اے اللہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو دوسروں کے لیے بھی ہدایت کا سبب بنا اور خود بھی اسے ہدایت یافتہ بنا اس کے ذریعہ اوروں کو بھی ہدایت ملے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے دُعا فرمائی:

اللهم علم معاوية الكتاب ومكن له في البلاد وقه العذاب. (مجمع الزوائد، ج ۹ ص ۳۵۶)

اے اللہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو علم کتاب دے (حقائق قرآن اس پر کھول دے) اور اسے بلادِ اسلامی میں تمکنت عطا فرما اور اسے عذاب آخرت سے بچا۔

کیا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکے گا کہ کہے حضور ﷺ کی دُعا قبول نہ ہوئی

تھی؟ (معاذ اللہ)

عن معاوية قال قال رسول الله ﷺ توضا و قال فلما توضا نظر الى فقال يا معاوية ان وليت امراً فاتق الله واعدل. (رواہ ابو یعلیٰ فی سند جلد ۶ ص ۴۴۲ والبیہقی فی دلائل النبوۃ کمافی الاصابہ جلد ۳ ص ۴۳۳)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا سب وضو کرو۔ آپ نے جب وضو کیا تو میری طرف نظر کی اور مجھے کہا کہ جب تو والی بنایا جائے تو اللہ سے ڈرنا اور عدالتیں قائم کرنا تاکہ انصاف کا بول بالا ہو۔

آپ کے علم و بصیرت کے پیش نظر آنحضرت ﷺ آپ سے مشورہ بھی لیتے تھے اور آپ کی قدر کرتے تھے ایک موقعہ پر فرمایا۔

ادعوا معاوية واحضروه امركم فانه قوى امين.

(مجمع الزوائد ج ۹ ص ۳۵۶)

معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلاؤ اور اسے اپنی بات کہو وہ امانت دار ہے اور امانت سنبھالنے کی قوت رکھتا ہے۔

ان روایات کی روشنی میں یہ بات بلاتردید کہی جاسکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علم ان کی بصیرت اور ان کی دیانت اور امانت پر پورا یقین تھا۔ رہی آپ کی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف معرکہ آرائی تو یہ ایک غلط فہمی پر مبنی رہی۔ اس کے پیچھے ترک دیانت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آپ کے ان حالات میں بھی آپ کی اور آپ کی پوری جماعت کو فئة عظيمة من المسلمين فرمایا ہے۔ (مشکوۃ ص ۵۶۹ رواہ البخاری)

ان اختلافات کے خاتمہ پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جو آپ کی بیعت کرلی اور اپنے کل علاقے بھی ان کے زیرِ پرچم کردیئے تو اس

کے بعد مسلمانوں کے کسی گروہ کو ان سے (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے) اختلافات کا کوئی حق نہیں رہ جاتا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے چند فقہی مسائل

(۱) مسلمان کو کافر کی وراثت

کافر تو مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا لیکن مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے۔ خاوند کو بیوی پر جو حق ولایت حاصل ہے اس میں یہ مسئلہ شاید کسی سے اوجھل نہ ہو کہ مسلمان مرد تو کتابیہ عورت سے نکاح کر سکتا ہے لیکن کوئی مسلمان لڑکی کسی کتابی مرد کے نکاح میں نہیں دی جا سکتی۔ اس مسئلہ کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان تو کافر کا وارث ہو سکتا ہے لیکن اس کا عکس درست نہیں، قرآن کریم میں ہے۔

لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلاً (النساء:۱۴۱)

اللہ تعالیٰ کافروں کو مومنین پر ہرگز کوئی راہ نہ دے گا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے اس اجتہاد میں منفرد نہیں ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا اجتہاد بھی یہی تھا۔ آپ نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد الاسلام یزید ولاینقص سے یہ استنباط کیا کہ مسلمان کو کسی صورت میں نقصان میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر اسے کافر سے بھی مال آتا ہے تو اسے اس کے پاس آنا چاہیے۔

ابوالاسود الدئلی روایت کرتے ہیں:

کان معاذ بالیمن فارتفعوا الیه فی یهودی مات وترک اخاه مسلماً فقال معاذ انی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الاسلام یزید ولا ینقص فورثه. (المصنف لابن ابی شیبہ ج۶ ص۲۸۴)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جب یمن میں تھے تو آپ کے پاس ایک مقدمہ لایا گیا ایک یہودی مرگیا اور اس کے وارثوں میں صرف

اس کا ایک بھائی تھا اور وہ مسلمان تھا۔ اس پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ اسلام زیادہ کرتا ہے کم نہیں کرتا۔ پس آپ نے اسے وارث ٹھہرایا۔

علامہ شبعی عبداللہ بن معقل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بھی یہی رہا ہے۔

ما رأیت قضاءً بعد اصحاب رسول الله ﷺ احسن من قضاء قضیٰ به معاویة فی اهل الکتاب قال نرثهم ولا یرثوننا کما یحل لنا النکاح فیهم ولا یحل لهم النکاح فینا. (المصنف ج ۶ ص ۲۸۵)

میں نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے فیصلوں کے بعد اس سے بہتر کسی کو فیصلہ کرتے نہیں دیکھا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہل کتاب کے بارے میں دیا۔ آپ نے فرمایا ہم ان کے وارث ہوں گے اور وہ ہمارے وارث نہ ہوسکیں گے۔ ان کی عورتیں ہمارے نکاح میں آسکتی ہیں ہماری ان کے نکاح میں نہ جاسکیں گی۔

علامہ عینی کہتے ہیں قیاس کا تقاضا یہی ہے جن فقہاء نے مسلمان کو کافر کا وارث نہیں مانا انہوں نے استحسان سے کام لیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

واما المسلم فهو یرث من الکافر ام لافقالت عامة الصحابة لایرث و به اخذ علماؤ نا والشافعی وهٰذا استحسان والقیاس ان یرث وهو قول معاذ بن جبل و معاویة بن ابی سفیان وبه اخذ مسروق والحسن و محمد بن الحنفیة و محمد بن علی بن الحسین

(عمدۃ القاری ج ۲۳ ص ۲۶۰)

واضح رہے کہ امام مسروق، حضرت حسن بصری، محمد بن حنفیہ اور امام باقر جیسے

حضرات بھی اس مسئلہ میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے حضرت سعید بن المسیب اور امام نخعی جیسے تابعین بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے موافق بتلائے ہیں۔ (ایضاً)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنے اس اجتہاد کی بناء اس حدیث پر رکھی۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

عن معاذ قال یرث المسلم من الکافر من غیر عکس واحتج بانہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول الاسلام یزید ولاینقص وھو حدیث اخرجہ ابو داؤد وصححہ الحاکم.

اس دور میں جن لوگوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کو بدعت کہا ہے وہ سمجھ نہیں پائے کہ مجتہد اپنے فیصلے میں خطا بھی کرے تو بھی اسے ایک اجر ملتا ہے۔ اس کے اجتہاد کو کسی صورت میں بدعت نہیں کہا جاسکتا اور بدعت صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد سے شروع ہوتی ہے، صحابہ کا عمل کیسے بدعت ہوگیا۔ ان ھذا الشی عجاب۔

(۲) کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف

ابن شہاب زہری کہتے ہیں جو کافر عہد دے کر مسلم علاقے میں آیا ہے اس کی دیت میں اور مسلمان کی دیت میں کوئی فرق نہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ٹھہرائی ہے اور کافروں کو مسلمانوں کے برابر نہیں آنے دیا۔

یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد نہیں اس بارے میں خود حضور ﷺ سے بھی یہ حدیث مروی ہے۔

عقل الکافر نصف دیۃ المسلم وفی روایۃ نصف عقل المومن (رواہ احمد والنسائی ج ۲ ص ۲۴۷)

کافر کا خون بہا مسلمان کی دیت کا نصف ہے۔

وفي رواية عقل اهل الذمة نصف عقل المسلمين. (ایضاً)

ذمیوں کا خون بہا مسلمان کے خونبہا کا نصف ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل تھے اور مالکی فقہ میں اب تک یہ مسئلہ اسی طرح مفتی بہ ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ دونوں کے اجتہاد میں یہ فرق ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کافر کے قاتل سے پوری دیت لینے کے قائل ہیں، جس میں سے آدھی مقتول کے وارثوں کو ملے گی اور باقی نصف بیت المال میں جائے گی۔ کیونکہ اس قاتل نے جس طرح اس کافر کو نقصان پہنچایا اس نے سلطنت کے باندھے عہد کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ مگر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس ذمہ کی دیت نصف ٹھہرائی اور بیت المال کے لیے قاتل سے کچھ نہ لیا۔ یہ آپ کا اجتہاد تھا۔

دونوں بزرگوں کے اجتہاد میں جو صلابت اور اصابت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اجتہاد میں ہے وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہاد میں نہیں۔ عام لوگوں پر اس قتل بے جا کی زد برابر پڑنی چاہیے، قتل کافر کا ہو یا مسلمان کا دیت برابر ہونی چاہیے۔ یہ اگلی بات ہے کہ مقتول کے وارثوں کو نصف ملے اور دوسرا نصف بیت المال میں جائے۔ اس سے قاتلوں اور قانون توڑنے والوں پر کوئی نرمی نہ آئے گی اور لاء اینڈ آرڈر کسی پہلو سے کمزور نہ ہوگا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہی مطلب اس حدیث کا ہے۔

دية ذمي دية مسلم . (السنن الکبریٰ للبیہقی ج۸ص۱۰۲)

ذمی کی دیت اور مسلمان کی دیت برابر ہے۔

اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ ساری اس مقتول کے وارثوں کو جانی چاہیے اور اس جہت سے یہ مسلمانوں کے برابر ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علم وفہم کی داد دیجئے۔ آپ نے کس طرح دونوں حدیثوں میں تطبیق دے دی ہے۔ اس سنت سے بھی نہیں نکلے جو پہلے سے چلی آ رہی تھی

اور کافروں کو مسلمانوں کے برابر بھی نہیں آنے دیا اور عوام پر لاء اینڈ آرڈر کا رعب برابر قائم رکھا۔

فقہاء کوفہ گو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس اجتہاد سے متفق نہیں ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام سفیان الثوری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اور ہے۔

(نیل الاوطار ج ۷ ص ۶۵)

لیکن ہم اجتہاد پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خراج تحسین دیئے بغیر آگے جانا نہیں چاہتے۔ اللہ تعالیٰ نے کس شان سے ان پر علم روشن کیا تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ قاتل سے پوری دیت لیتے تھے۔ اس کی تصریح آپ کو اس روایت میں ملے گی۔ کیا آپ نے دوسرا نصف بیت المال میں نہیں ڈالا؟

فلما كان معاوية اعطى اهل المقتول النصف والقى النصف في بيت المال ثم قضىٰ عمربن عبدالعزيز في النصف والغىٰ ماكان جعل معاوية. (السنن الکبریٰ ج ۸ ص ۱۰۲)

پس جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو آپ نے مقتول کے وارثوں کو نصف دیت دلوائی اور دوسرا نصف بیت المال میں دیا۔ پھر جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکومت آئی تو آپ نے اسی ذمی کے ذمہ صرف نصف دیت لگائی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو حصہ بیت المال میں لیا تھا اسے جانے دیا۔

بقول حضرت ربیعہ الرای حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خود یہ تصریح فرمائی، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے دیت نصف ٹھہرائی تھی اس کے مصرف میں سلطنت کو بھی شامل کر دیا تھا۔

فقال معاويه ان كان اهله اصيبوا به فقد اصيب به بيت مال المسلمين فاجعلوا لبيت مال المسلمين النصف ولاهله النصف. (الجوہر النقی للعلامہ الترکمانی ج ۸ ص ۱۰۳)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے اگر اس مقتول کے گھر والوں
پر ایک مصیبت آئی ہے تو مسلمانوں کے بیت المال پر بھی تو ایک
زد پڑی ہے۔ سو آدھی دیت بیت المال میں ڈالو اور آدھی اس
مقتول کے وارثوں کو دو۔

سو امام زہری کے اس بیان میں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دیت کی نصف ثانی اپنے لیے ٹھہرائی اس سے مراد اسے مسلمانوں کے کھاتہ میں ڈالنا ہے نہ کہ اپنی ذات کے لیے، زہری کی وہ مغالطہ انگیز عبارت یہ ہے۔

وکان معاویہ اول من قصرھا الی النصف واخذا النصف لنفسہ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۳۹)

معاویہ رضی اللہ عنہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دیت کو نصف کیا اور
دوسرا نصف اپنے لیے لے لیا۔

جب قاتل کے وارثوں سے پوری دیت لی گئی تو اسے نصف کرنے کی بات کہاں رہی رہا صرف اس کے مصرف میں اجتہاد۔ کیا ہر مجتہد کو دلائل کی روشنی میں اجتہاد کرنے کا حق نہیں؟ اور کیا یہ حدیث میں نہیں کہ مجتہد صحیح بات پانے میں خطا بھی کر جائے تو بھی وہ ایک اجر کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ نادان ہیں وہ جو اسے اس پر ملامت کرتے ہیں۔

(۳) ایک وتر کا اجتہاد

وتر کی کم از کم نماز تین رکعت ہے۔ آنحضرت ﷺ سے کسی صحیح روایت میں مستقل طور پر ایک وتر پڑھنا ثابت نہیں جن روایات سے ایسا لگتا ہے وہ سب ماؤل ہیں۔ آپ نے پہلے کچھ رکعات پڑھیں اور پھر ایک رکعت اور ملا کر اس نماز کو وتر بنا لیا۔ اوتر برکعۃ سے یہی مراد ہے کہ پہلی رکعتوں کو وتر کیا ایک رکعت اور ملا کر۔ اب یہ کل تین ہوں یا پانچ یا سات لیکن یہ واضح ہے کہ وتر کی کم از کم مقدار تین رکعت ہی ہیں اس سے کم نہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اہل مدینہ کا یہی عمل نقل کیا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے وتر اس ایک رکعت ہی کو سمجھ لیا اور فتوے دیا کہ

ایک رکعت علیحدہ پڑھنے سے بھی وتر کی نماز ادا ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس کا علیحدہ پڑھنا کسی روایت میں نہیں ملتا۔ اس ایک رکعت کا کام پہلی نماز کو وتر بنانا ہے۔ اگر پہلے دو رکعت بھی نہ ہوں تو یہ رکعت آخر کس نماز کو وتر بنائے گی؟ حضور ﷺ ایک رکعت سے کس نماز کو وتر بنایا کرتے تھے؟ انہی دو رکعتوں کو جو آپ نے پہلے پڑھی ہوتی تھیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بہت تعجب ہوا مگر آپ چونکہ مجتہد تھے اور مجتہد خطا بھی کرے تو اسے ایک اجر ملتا ہے۔ اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کو غلط نہ کہا۔ اسے اجتہاد کے سائے میں گوارا کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض نہ کرو وہ فقیہ ہیں اور فقیہ اجتہاد بھی تو کرتا ہے۔

اس وقت تک تین رکعت وتر پر پوری امت کا اجماع نہ ہوا تھا۔ اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کسی اعتبار سے اس اجتہاد میں محل ملامت نہیں بنتے۔ ہاں اب جب اس پر اجماع ہو چکا ہے تو اب کسی کے لیے امت کے اس اجماع سے نکلنا جائز نہیں۔ امت کا عام عمل پہلے بھی تین رکعت ہی تھا۔

یہ ایک وتر کے خلاف سوال کیوں اٹھا؟ اس لیے کہ امت کا عام عمل تین رکعت پر ہی تھا اور اس سے کسی صحابی کو اختلاف نہیں تھا جب اس عام عمل کے خلاف ایک بات سامنے آئی تو لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو اپنے وقت کے بڑے مجتہد اور بقول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ترجمان القرآن تھے۔ انہوں نے فرمایا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ٹھیک کہا ہے اور ان کا ایسا کرنا ان کے اجتہاد اور ان کی فقاہت کی وجہ سے ہے وتر کا ایک ہونا حدیث کی کوئی منصوص بات نہیں ہے، معاویہ فقیہ ہیں اور انہوں نے اجتہاد کیا ہے۔ یہاں ہماری مسئلہ وتر سے بحث نہیں۔ بتلانا صرف یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں فقیہ سمجھے جاتے تھے۔ مسئلہ کی پوری تحقیق مطلوب ہو تو حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر کا مطالعہ کریں۔

ان تفصیلات سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے۔ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اول درجے کے جو فقہاء گزرے اوران کے علم واجتہاد پر پوری امت کو ناز رہا ہے ان میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں اور حضور ﷺ کی دعا کہ اے اللہ! معاویہ رضی اللہ عنہ کو علم کتاب عطا فرما، آپ کے حق میں ہو بہو پوری ہوئی البتہ یزید کی ولی عہدی میں ان کا اجتہاد اصابت نہ پا سکا۔

واللہ ولی امرہ وھو یعلم السر وماظھر.

حضرت امام حسن بصری سے منقول ہے

عن الحسن قال اجمع المسلمون علی ان الوتر ثلاث لا یسلم الافی اخوھن (المصنف لابن ابی شیبہ ج۲ ص۲۱۴)

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں مسلمانوں کا اجماع ہے کہ وتر تین رکعات ہی ہیں ان میں سلام صرف آخر میں ہے۔

یہاں اجماع سے مراد تین رکعت وتر کی مقدار ہے یہ بات کہ یہ تین ایک سلام سے ہوں یہ ان کا اپنا مذہب ہے، شافیوں کے ہاں بھی وتر تین رکعت ہی ہیں ان سے کم نہیں مگر ان کے ہاں افضل یہ ہے دو سلاموں سے ہوں، مالکیوں کے نزدیک ضروری ہے کہ دو سلاموں سے ہوں، یہ اختلاف ان کی صورت ادا میں ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وتر کی کم از کم رکعات تین ہی ہیں ان سے کم نہیں، علامہ بیجوری شافعی شمائل ترمذی کی شرح میں لکھتے ہیں:

ظاھر اللفظ یقتضی انه صلی الثلاث بسلام واحد وھو جائزبل واجب عند ابی حنیفة ولکن صلوتھا بسلامین افضل عندنامعشر الشافعیة ومتبعین عند المالکیة. (شرح شمائل ص۱۴۴)

الفاظ کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ آپ نے تین رکعت ایک سلام سے پڑھے ہیں یہ جائز ہے بلکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں واجب

ہے لیکن ہم شافعیہ کے ہاں تین وتر دو سلاموں سے پڑھنا افضل ہے
اور مالکیہ تو کہتے ہیں کہ تین وتر دو سلاموں سے پڑھے جائیں۔
آنحضرت ﷺ نے اگر کبھی وتر کی نماز ان دو رکعتوں کو ساتھ ملائے بغیر بھی پڑھی ہوتی تو اہل مدینہ کا عام عمل بھی یہی ہوتا کہ صرف ایک وتر بھی کبھی علیحدہ پڑھے ہوتے لیکن مسجد نبوی کے امام حضرت امام مالک (۱۷۹ھ) لکھتے ہیں ہمارے ہاں اس پر بالکل عمل نہیں۔ وتر کی کم از کم مقدار تین ہے اس سے کم نہیں:

ولیس علی ھذہ العمل عندنا ولکن ادنی الوتر ثلاث.

(مؤطا امام مالک ص ۴۷)

اس طرح ایک وتر پڑھنے پر ہمارے ہاں بالکل عمل نہیں وتر کی کم از کم مقدار تین رکعات ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں

صلوٰۃ المغرب وتر صلوٰۃ النھار. (ایضاً)

مغرب کی نماز دن کی نمازوں کی وتر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی فرماتے ہیں:

الوتر ثلث کوتر النھار صلوٰۃ المغرب (طحاوی شریف ص ۱۴۳)

وتر تین رکعات ہی ہیں جیسے دن کے وتر مغرب کی نماز ہیں۔

حضرت ابو العالیہ (۹۳ھ) کہتے ہیں:

علمنا اصحاب محمد اوعلمونا ان الوتر مثل صلوٰۃ المغرب غیر انا القراۃ فی الثالثۃ فھذا وتر اللیل وھذا وتر النھار. (ایضاً)

پس حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ سمجھایا ہے کہ وتر کی نماز مغرب کی نماز کی طرح ہے سوائے اس کے کہ ہم تیسری رکعت میں بھی سورت ملاتے ہیں وہ رات کے وتر ہیں اور یہ دن کے۔

(۴) بیٹے کی جانشینی بوقت ضرورت

جب تک صحابہ رضی اللہ عنہم خاصی تعداد میں رہے مسلم سوسائٹی پر علم اور تقویٰ کی پوری چھاپ تھی آنحضرت ﷺ کے جانشین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے علم وتقویٰ اوران کی تاریخی خدمات پر چنا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے جانشین ہوئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ان کے علم وتقویٰ اور خلافت کی صلاحیت پر نظر تھی پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ چنے گئے تو عشرہ مبشرہ کے اعزاز پر پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اعتماد پر مگر ازاں بعد مسلم سوسائٹی میں وہ بات نہ رہی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اختلافات نے قوموں کی پہلی فطرت کھول کر رکھ دی تھی۔ حجاز پر تقویٰ و دیانت کا غلبہ تھا۔ مگر قلمرو اسلامی کی نئی وسعت کے سامنے یہ آبادی فیصلہ کن نہ ہو سکتی تھی۔ ایران وروم، عراق وشام اور مصر اور افریقہ کے لوگوں کے اپنے اپنے مزاج تھے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے نہج البلاغہ کے خطبے عراقیوں کی بے وفائی اور شامیوں کی عزیمت اور صلابت پر شاہد ناطق ہیں۔ ایسے ماحول میں خلیفہ کا علم وتقویٰ پر انتخاب حالات کا سامنا کرنے کے لیے کافی نہ سمجھا گیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے علم و تقویٰ پر کسے شک ہو سکتا ہے۔ مگر کیا یہ صحیح نہیں کہ انہیں عراقیوں نے دھوکہ دیا۔ خطوط بھیج کر انہیں بلایا اور جب وہ آئے تو خود یہ حکومت کے ساتھ مل گئے۔ اہل حجاز کی سادگی اور اہل عراق کا تلون یہ وہ بواعث تھے جن کی وجہ سے نیا خلیفہ شامیوں میں سے چنا جائے یہ احساس اور بڑھتا گیا تھا۔ اور اسی سے سلطنت اسلامی کی کچھ صلابت اور عزیمت کی توقع رہ گئی تھی۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام میں کچھ اس انداز میں حکومت کی تھی کہ لوگ ان پر جان دیتے تھے پھر شیرازہ اسلام کے بکھرنے کے بعد پھر سے اسے باندھنے کا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا کارنامہ بھی ہر کسی کے سامنے تھا۔ الائمة من قریش کی رو سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ قریشی تھے اور عبد مناف کی اولاد میں سے ہونے کے باعث حضور اکرم ﷺ کے قریبی بھی تھے، شامیوں میں اور لوگ ان روایات کے حامل نہ تھے جو بنی امیہ

میں پائی جاتی تھیں۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ جس طرح شامی افواج اور شامی عوام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر جان دیتے ہیں اس سطح پر وہ اور کسی کا ساتھ دے سکتے ہیں تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خاندان کا ہی دے سکیں گے۔ اس لیے انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ اپنے بیٹے کو ولی عہد کر دیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پہلے اس میں کچھ تردد کیا کہ بیٹا باپ کا کیسے جانشین ہو۔ لیکن بالآخران حضرات کی بات مان لی کیوں کہ باپ کے بعد بیٹا جانشین ہے اس میں شرعاً کوئی قباحت نہ تھی۔ کیا قرآن کریم میں یہ نہیں دیا گیا کہ وورث سلیمان داؤد (پ۱۹) (حضرت سلیمان حضرت داؤد کے وارث ہوئے) حضرت سلیمان حضرت داؤد کے بیٹے تھے اور ان کے جانشین ہوئے اب اگر حالات کو سلجھانے کے لیے بیٹے کا انتخاب کرنا پڑے کیونکہ شام کے لوگ اس کے وفادار ہو سکیں گے۔ تو ان حالات میں بیٹے کو جانشین بنانے میں شرعاً کوئی عیب نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید جاننے والا ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اگر اس نیت سے بیٹے کو نامزد کرتے ہیں کہ شامی فوجیں اس کے سوا اور کسی کے گرد وفادارانہ پہرہ نہ دے سکیں گی اور اگر کسی سادہ اور نیک بزرگ کو نامزد کیا گیا تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے گرد اتنی حمایت جمع نہ کر سکے۔ تو محض اس لیے ایسا نہ کرنا کہ باپ کے بعد بیٹا نہیں ہوسکتا۔ یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے اس کے لیے ملک کو خطرے میں نہیں ڈالا جاسکتا۔

پھر یہ بھی علم الٰہی میں تھا کہ آئندہ مسلم سلطنتیں دنیا میں باپ بیٹے کی حکومت سے چلیں گی، ہندوستان کے شاہان اسلام خلجی ہوں یا تعلق لودھی خاندان ہو یا مغلیہ خاندان سب اسی نسبت سے رہ چکے ہیں۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب سب باپ بیٹا تھے۔ ہندوستان میں محمد بن قاسم کس حکومت کی طرف سے یہاں آئے تھے؟ کیا عبدالملک کی حکومت باپ بیٹے کی اساس پر نہ چل رہی تھی؟ خلفائے بنی عباس ہارون الرشید اور مامون الرشید کیا باپ بیٹا نہ تھے؟ اور کیا ان کے دور میں شوکت اسلامی قائم نہ تھی؟ پھر جو

اموی لوگ سپین چلے گئے تھے کیا انہوں نے خلافت عبدالرحمٰن ثالث کی اولاد میں باقی نہ رکھی تھی؟ پھر سلطنت عثمانیہ جو پوری قلمرو اسلامی کی طاقت کا مرکز تھی کیا باپ بیٹے کی جانشینی پر قائم نہ تھی؟ پوری دنیا میں مسلمان اسی نظام حکومت سے پھیلے اور انہی سے عالمی اسلامی شوکت قائم ہوئی اور گو اس میں خلافت راشدہ کا سا علم وتقویٰ اور اللہ کی حاکیت کا نظام نہ تھا۔ تاہم تمام کفری نظاموں کے سامنے یہی ایک چراغ تھا جس میں اسلام کا تیل جل رہا تھا۔ اب دیکھئے اسلامی حدود کس ملک میں قائم ہیں اور کیا وہ بھی باپ کے بعد بیٹوں کی سلطنت سے نہیں چل رہا۔

اسلامی عقیدہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم ہدایت کے روشن ستارے ہیں۔ کیا اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے بھی کوئی ستارہ چمکا؟ مجبوری کے حالات میں جب یہ طریق حکومت مسلمانوں نے پوری دنیا میں اپنایا تو ضروری تھا کہ اس کی اصل تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملتی جس سے پتہ چلے کہ مسلمان اگر اس نظام حکومت سے آگے بڑھے ہیں اور چلے ہیں تو ان کے پاس اس باب میں بھی ایک فقیہ صحابی کا عمل موجود تھا۔ جس نے بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے کہنے سے باپ کے بعد بیٹے کی ولیعہدی پر دستخط کیے اور اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس کی سند نہ ملتی تو مسلمانوں کی پوری دنیا کی مذکورہ حکومتیں اپنی اساس میں غیر اسلامی رہتیں اور یہ اسلام کے باقی نہ رہنے کا ایک عملی اقرار تھا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اسلامی نظام حکومت تیس سالوں سے زیادہ آگے نہ چل سکا۔ استغفراللہ

ایک ضروری بات

یہ علیحدہ بات ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا ان کے تجویز کردہ معیار پر پورا نہ اترا ہو لیکن یہ اس نامزدگی پر جرح نہیں ''دوسری جہت ہے۔ یہ نہیں کہ باپ کے بعد بیٹے کی جانشینی جائز نہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے مسلمانوں کو اس عمل حکومت کی ایک سند دی جس پر آئندہ کئی حکمران صدیوں چلتے رہے اور فقہائے اسلام میں سے کسی نے اسے ناجائز نہیں کہا۔

رہی یہ دوسری جہت جرح تو اس کے جواب میں ہم صرف یہ کہنا کافی سمجھتے ہیں

کہ قرآن کریم کی رو سے علم غیب خاصہ باری تعالیٰ ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھے۔ اونچے درجے کے ولی اللہ بھی تھے لیکن عالم الغیب نہ تھے۔ انہیں یہ علم نہ تھا کہ ان کے جانشین کا آئندہ کا کیا کردار ہوگا؟

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان اجتہاد جاننے کے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ کئی جگہ علماء نے ان کے مقابل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول بھی چھوڑ دیا۔ کیونکہ ان کی بات سنت کے بہت قریب پائی گئی۔

حافظ ابن تیمیہ انگلیوں کی دیت کی بحث میں لکھتے ہیں:

تركوا قول عمر في دية الاصابع واخذوا بقول معاوية لما كان معه من السنة۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲۰ ص ۲۱۵)

فقہاء نے انگلیوں کی دیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول چھوڑ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول اختیار کیا ہے کیونکہ وہ سنت کے زیادہ قریب ہے۔

اب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک اور اجتہاد ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس مسئلے میں اور کوئی نہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمۃ ابن التین سے نقل کرتے ہیں:

ان الفقهاء لم ياخذوا بعمل معاويه في ذلك (فتح الباری ج ۲ ص ۵۵۹)

فقہاء اربعہ میں سے کسی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو اختیار نہیں کیا۔

ایک سوال: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تو ایک وتر علیحدہ پڑھنے کے قائل تھے؟

الجواب: اگر ایسا ہوتا تو آل سعد میں تو یقیناً یہ صورت عمل باقی رہتی۔ مگر علامہ شعبی فرماتے ہیں صورت حال یوں نہ تھی وہ سب تین وتر ہی پڑھتے تھے۔

عن عامر قال كان ال سعد وال عبدالله بن عمر

یسلمون فی الرکعتین من الوتر ویرترون برکعة رکعة فقدبین الشعبی فی هذا الحدیث مذهب ال سعد فی الوتر وهم المقتدون بسعد المتبعون بفعله و ان وترهم الذی کان رکعة رکعة انما هو وتر بعد صلوٰة قد فصلوا بینه وبین التسلیم فقد عاد ذلک الی قول الذین ذهبوا الی ان الوتر ثلث. (طحاوی شریف ج۱ ص۴۴)

عامر سے روایت ہے کہ آل سعد اور آل عبداللہ بن عمر وتر کی دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرتے اور پھر ایک ایک رکعت ملا کر وتر پڑھتے تھے، علامہ شعبی نے اس حدیث کے بارے میں آل سعد کا وتروں کے بارے میں موقف بیان کیا ہے اور وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پیرو تھے اور آپ کے پیچھے چلنے والے ہی تھے۔ ان کا ایک وتر پڑھنا اس نماز کے بعد ہوتا تھا جو وہ اس ایک رکعت سے پہلے پڑھتے تھے وہ اس سلام سے دونوں میں فاصلہ کر لیتے، لیکن انجام کار وہ اسی صورت میں آجاتے کہ وتر تین رکعت ہوئے ہیں (گو اس صورت عمل میں معمولی فرق ہے)۔

حافظ ابن صلاح بھی کہتے ہیں:

لانعلم فی روایات الوتر مع کثرتها انه علیه الصلوٰة والسلام اوتر بواحده. (تلخیص الحبیر ج۲ ص۱۵)

ہم ذخیرہ روایات میں اتنی کثرت کے باوجود ایک ایسی روایت بھی نہیں پاتے کہ آنحضرت ﷺ نے (پہلی رکعتوں کو ملانے کے بغیر) کبھی ایک وتر پڑھتے ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وتر کی اصل رکعت وہ ہی ایک ہے جس میں دعائے قنوت پڑھی جاتی ہے۔ احناف اس موقع پر اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہیں (رفع یدین

کرتے ہیں) گویا اب نماز شروع کر رہے ہوں۔ مگر یہ ہاتھ اٹھانا شروع رکعت میں نہیں ہوتا، درمیان قیام ہوتا ہے۔ اس میں یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ وتر کی اصل رکعت تو یہی ہے جو رفع یدین سے شروع ہو رہی ہے مگر یہ رکعت مستقل طور پر ایک نہیں۔ اس سے پہلے دو رکعت کا شفعہ ہے جسے اس تیسری رکعت سے ملا کر وتر کیا گیا ہے۔ پہلے چار رکعت دو دو پر قعدہ کرتے پڑھی گئی ہوں تو اس ایک رکعت کو ملانے سے وہ بھی وتر ہو جائیں گی گویہ پانچ رکعت وتر نماز کہلائے گی۔

وتر کی اصل رکعت وہ ایک ہی ہے (دعائے قنوت والی) مگر اس کی ادائیگی کا طریقہ ہے کہ اس ایک رکعت کو مستقل طور پر ادا نہیں کیا جاتا۔ دو رکعت پہلے ساتھ ملائی جاتی ہیں اگر حضور ﷺ نے وتر کی نماز کبھی ایک رکعت پڑھی ہوتی تو مدینہ منورہ میں تو اس پر عمل ضرور ہوتا۔ حالانکہ مدینہ کے لوگ جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کبھی ایک رکعت وتر پڑھتے نہیں پائے گئے۔

حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے وتر کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

> دو رکعتوں پر سلام پھیرا جائے اور اگر سلام نہ پھیرے تو مجھے امید ہے کوئی حرج نہیں ہوگا لیکن نبی کریم ﷺ سے سلام پھیرنا ثابت ہے۔ (زاد المعاد ج ۱ ص ۲۱۵)

اس سے پتہ چلا کہ نماز وتر کی ہیئت کذائی یہی ہے کہ آخر کی دعاء قنوت والی رکعت کو پہلی پڑھی نماز سے جوڑا جائے۔

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ وتر کی ایک رکعت ہے لیکن یہ تنہا نہیں اس سے پہلے آٹھ رکعات تک ہیں۔ پھر ان کے ساتھ وتر پڑھے اور پھر سلام پھیر دے۔

وتر کا پہلی دو یا چار یا چھ یا آٹھ رکعتوں سے ملانا ضروری ہے ایک رکعت مستقل پر ادا ہو اسلام میں اس کا کہیں ثبوت نہیں۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

واستدل بقوله ﷺ صل ركعة واحدة على ان فصل الوتر افضل من وصله وتعقب بانه ليس صريحاً في

الفصل فيتحمل ان يريد بقوله صل ركعة واحدة اى مضافة الى ركعتين مما مضىٰ...... بان الصحابة اجمعوا علىٰ ان الوتر بثلث موصولة حسن جائز.

(فتح الباری ج ۲ ص ۵۵۸)

جن لوگوں نے حضور ﷺ کے اس فرمان سے کہ وتر ایک رکعت پڑھو یہ استدلال کیا ہے کہ وتر میں فصل کرنا وصل سے افضل ہے ان پر تعاقب کیا گیا ہے کیونکہ یہ روایت صریح نہیں اس میں احتمال ہے کہ صل ركعة واحدة کا مطلب یہ ہو کہ ایک رکعت دو رکعت کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے اور وتر حقیقت میں وہی رکعت ہے جو آخر میں آئے...... یہ تشریح اس پر مبنی ہے کہ صحابہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ وتر تین رکعت ملا کر پڑھنا (ایک سلام سے) یہی اچھا ہے اور یہی اس کے جواز کی صورت ہے۔

تین رکعت وتر کے اتنے قوی دلائل کے ہوتے ہوئے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایک وتر پڑھنے کو ان کی فقاہت پر محمول کیا گیا ہے اور ہر مجتہد کو اپنی فقہ پر عمل کرنے کا حق ہے۔ مجتہد کی بات اس وقت تک چلتی ہے کہ اس کے خلاف اجماع نہ ہوا ہو۔ اگر اس پر اجماع ہو جائے تو اس کا خلاف جائز نہیں۔ نہ مجتہد کو نہ اور کسی کو۔ اب تین رکعت پر اجماع ہے۔ لہٰذا اب کسی کا مستقل طور پر ایک وتر پڑھنا درست نہیں۔ دو رکعت پہلے ملا کر ایک رکعت وتر پڑھے تو یہی ایک صورت ہے جو سلف میں ایک وتر کہلاتی تھی۔

اس وقت ہمیں اس مسئلے سے بحث نہیں مسئلے کی تفصیل کے لیے کشف السر عن صلوٰة الوتر (عربی) یا شیخ الحدیث مولانا حبیب اللہ ڈیروی کی کتاب نفحة العطر فی ابحاث الوتر (اردو) مطالعہ فرمادیں۔

فقاہت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

ایک مرتبہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک عنین (نامرد)

کا مسئلہ اور مقدمہ پیش ہوا، انہوں نے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں واقعہ کی ساری تفصیلات ذکر کر کے مسئلہ کا حل معلوم کیا، سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو جواب ارشاد فرمایا وہ ان کی فقاہت کی اہم ترین دلیل ہے، فرمایا:

''بیت المال کی طرف سے ایک باندی خرید کر اس مرد کے حوالے کر دیں تا کہ وہ اس سے ازدواجی تعلقات قائم کرے، اس کے بعد اس باندی سے پوچھیں (تو پتہ چل جائے گا کہ آیا واقعی عنین ہے یا جان بوجھ کر بیوی کے حقوق ادا نہیں کر رہا)''۔

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا اور ایک باندی خرید کر ایک رات کو ان دونوں کے لئے تخلیہ کا موقع فراہم کر دیا، جب صبح ہوئی تو اس باندی سے ساری صورت حال پوچھی گئی، اس باندی نے جواب دیا کہ یہ میرے ساتھ کچھ نہیں کر سکا، یہ سن کر حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کر دیا کہ تو اپنی بیوی کو طلاق دیدے۔ (سیرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ)

ایک فقہی مسئلہ

سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ شام کے علاقے میں ایک شخص ''الاحوص'' نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ ابھی وہ مطلقہ عورت طلاق کی عدت گزارتے ہوئے آخری مراحل میں تھی کہ ''احوص'' کا انتقال ہوگیا (اب دوسرے مسائل کی طرح وراثت کا مسئلہ بھی اٹھا) سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مسئلہ وراثت کا حل پوچھنے کے لئے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنا قاصد بھیجا، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ چونکہ مطلقہ عورت عدت کے تیسرے اور آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اس لئے یوں سمجھا جائے گا کہ اس کی عدت مکمل ہوگئی، اور اب ان کے درمیان وراثت جاری نہیں ہوگی۔ (سیرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ)

فائدہ: یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے جس کی تفصیلات کیلئے کتب فقہ کی طرف رجوع فرمایا جائے۔

قرآن کریم کی خرید وفروخت کا مسئلہ

ایک مرتبہ عمران بن حدیر نے ابومجلز رحمۃ اللہ علیہ سے ''بیع مصحف'' کا مسئلہ دریافت کیا (کہ قرآن کریم لکھ کر اسے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟) ابومجلز نے جواب دیا کہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ''مصحف'' کی خرید وفروخت ہوتی رہی ہے، اس لئے جائز ہے، عمران نے پوچھا کہ اس کا مطلب ہے کہ میں بھی قرآن کریم کی کتابت کر کے اپنی روزی کما سکتا ہوں؟ ابومجلز نے جواب دیا کہ اپنے ہاتھ کو جس مرضی کام میں استعمال کرو (اس میں استعمال کرو تو بہت اچھی بات ہے)۔ (سیرت حضرت امیر معاویہ ج ۱ ص ۶۲۷)

صورت وسیرت

حضرت مسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہمارے پاس تشریف لائے اور وہ لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھے، مورخین کے مطابق آپ کا قد بلند و بالا اور رنگ گورا سفید تھا، نیز آپ ڈاڑھی میں خضاب بھی لگایا کرتے تھے۔ (سیر الصحابہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق)

معمولات یومیہ

مشہور مؤرخ مسعودی نے آپ کے دن بھر کے اوقات کا تفصیلی نقشہ کھینچا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''آپ فجر کی نماز ادا کر کے زیر سلطنت ممالک سے آئی ہوئی رپورٹیں سنتے، پھر قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے؛ اور تلاوت کے بعد گھر تشریف لیجاتے اور وہاں ضروری احکامات جاری کرتے، پھر نماز اشراق ادا کر کے باہر تشریف لاتے اور خاص خاص لوگوں کو طلب فرماتے اور ان کے ساتھ دن بھر کے ضروری امور کے متعلق مشورہ کرتے، اس کے بعد ناشتہ لایا جاتا جو رات کے بچے ہوئے کھانے میں سے ہوتا، پھر آپ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہتے اور اس کے بعد گھر تشریف لیجاتے، تھوڑی

دیر بعد باہر تشریف لاتے اور مسجد میں مقصودہ سے کمر لگا کر کرسی پر بیٹھ جاتے، اس وقت میں عام مسلمان ''جن میں کمزور، دیہاتی بچے، عورتیں سب شامل ہوتے'' آپ کے پاس آتے اور اپنی ضرورتیں تکلیفیں بیان کرتے تھے، آپ ان سب کی دل دہی کرتے، ضرورتیں پوری فرماتے اور ان کی تکلیفوں کو دور کرتے تھے۔

جب تمام لوگ اپنی حاجتیں بیان کر لیتے اور آپ ان کے متعلق احکام جاری فرما دیتے اور کوئی باقی نہ بچتا تو آپ اندر تشریف لیجاتے اور وہاں خاص خاص لوگوں، معززین اور اشراف قوم سے ملاقات فرماتے، آپ ان سے کہتے۔

''حضرات! آپ کو اشراف قوم اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ کو اس مجلس خصوصی میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہے، لہٰذا آپ کا فرض ہے کہ جو لوگ یہاں حاضر نہیں ہیں، ان کی ضرورتیں بیان کریں''۔

وہ ضرورتیں بیان کرتے اور آپ ان کو پورا فرماتے، پھر دوپہر کا کھانا لایا جاتا اور اس وقت کاتب بھی حاضر ہوتا، وہ آپ کے سرہانے کھڑا ہو جاتا اور باریاب ہونے والوں کو ایک ایک کرکے پیش کرتا اور جو کچھ وہ اپنی مشکلات اور معروضات تحریر کرکے لاتے آپ کو پڑھ کر سناتا رہتا، آپ کھانا کھاتے جاتے اور احکام لکھواتے جاتے تھے اور ہر باریاب ہونے والا شخص جب تک حاضر رہتا، کھانے میں شریک رہتا، پھر آپ گھر تشریف لے جاتے اور ظہر کی نماز کے وقت تشریف لاتے۔ ظہر کی نماز کے بعد خاص مجلس ہوتی جس میں وزراء سے ملکی امور کے متعلق مشورہ ہوتا اور احکامات جاری ہوتے، یہ مجلس عصر تک جاری رہتی، آپ رضی اللہ عنہ عصر کی نماز ادا کرتے اور پھر عشاء کے وقت تک مختلف امور میں مشغول رہتے، عشاء کی نماز کے بعد امراء سے امور سلطنت پر گفتگو ہوتی، یہ گفتگو ختم ہوتی تو علمی مباحث چھڑ جاتے اور یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا تھا''۔ (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق ص ۲۸۴)

آخری خطبہ

ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا بات ہے

آپ پر بڑھاپا بہت جلدی آگیا؟ آپ رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کیوں نہ آئے؟ جب اپنے سر پر ایک اکھڑ جاہل آدمی کو کھڑا پاتا ہوں جو مجھ پر قسم قسم کے اعتراضات کرتا ہے، اگر اس کے اعتراضات کا ٹھیک جواب دے دیتا ہوں تو تعریف کا کہیں سوال نہیں اور اگر جواب دینے میں مجھ سے ذرا سی چوک ہو جائے تو وہ بات چہار عالم میں پھیلا دی جاتی ہے۔

بہر حال! آپ بیمار ہوئے اور آپ نے اپنی زندگی کا جو آخری خطبہ دیا، علاوہ دوسری باتوں کے اس میں یہ بھی فرمایا،

لوگو! میں اس کھیتی کی طرح ہوں جس کے کٹنے کا وقت قریب آچکا ہے، میں تمہارا امیر تھا، یاد رکھو! میرے بعد مجھ سے بہتر کوئی امیر نہیں آئے گا جیسا کہ مجھ سے پہلے ہونے والے امیر مجھ سے بہتر تھے، (مجھے ان سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں) اور کہا جاتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کرنے کو پسند کرتے ہیں۔"

پھر فرمایا اے اللہ! میں تجھ سے ملاقات کرنے کو پسند کرتا ہوں، تو مجھ سے ملاقات کرنے کو پسند اور بہتر فرما۔ (سیر الصحابہ، سیرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، تاریخی حقائق)

وفات حسرت آیات

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹے یزید کو بلایا اور فرمایا بیٹا! ایک مرتبہ میں حضور ﷺ کے ہمراہ تھا، آپ ﷺ قضاءِ حاجت کے لئے تشریف لے گئے، میں وضو کا پانی لے کر پیچھے گیا اور آپ ﷺ کو وضو کروایا، اس موقع پر حضور ﷺ نے مجھے اپنے جسم مبارک پر پڑے ہوئے دو کپڑوں میں سے ایک کپڑا عنایت کیا، وہ میں نے حفاظت سے رکھ لیا تھا، اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اپنے بال اور ناخن مبارک کاٹے تو میں نے انہیں بھی جمع کر لیا تھا۔

اب تم حضور ﷺ کے اس کپڑے کو تو میرے کفن میں شامل کرنا، اس طرح کہ وہ کپڑا میرے جسم کے ساتھ لگا رہے، اور ان مبارک ناخنوں کو میری آنکھوں، منہ اور

سجدے کی جگہوں پر رکھ دینا اور پھر مجھے ارحم الراحمین کے حوالے کر دینا۔ (بحوالہ مذکورہ)

وصیت سیدنا امیر معاویہ

ایک مرتبہ مرض الوفات میں سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اہل خانہ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا، خدا سے ہمیشہ ڈرتے رہنا کیونکہ خدا اپنے سے ڈرنے والوں کو ہمیشہ مصائب سے محفوظ رکھتا ہے اور جو آدمی خدا سے نہیں ڈرتا، پھر اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا، اس وصیت کے بعد سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ میرا جتنا مال ہے، اس میں سے آدھا مال بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔ (سیر الصحابہ ج ۶ ص ۷۹)

قبر سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ کامل میں نقل کیا ہے کہ ایک دن عبدالملک بن مروان آپ کی قبر کے قریب سے گزرے تو کھڑے ہو گئے، اور کافی دیر تک کھڑے رہے اور دعائے خیر کرتے رہے، ایک آدمی نے پوچھا کہ یہ کس کی قبر ہے؟ عبدالملک بن مروان نے جواب دیا:

"قبر رجل كان والله فيما علمته ينطق عن علم، و يسكت عن حلم، اذا اعطى اغنى، واذا حارب افنى، ثم عجل له الدهر ما اخره لغيره ممن بعده، هذا قبر ابى عبدالرحمن معاوية"

"یہ اس شخص کی قبر ہے کہ جو بولتا تھا تو علم و تدبر سے، اور سکوت کرتا تھا تو حلم و وقار سے، جسے دیتا اسے غنی کر دیتا تھا، مخالفین سے جنگ ہوتی تو فناء کر دیتا تھا ا~~للہ تعالیٰ~~ نے کی ان پر مہربانیاں بھی بہت تھیں، یہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔"

(حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق بتغیر ص ۲۹۷)

حضرت جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہما

ستر انصاری رضی اللہ عنہم جو بیعت عقبہ میں شامل ہوئے آپ رضی اللہ عنہ ان میں سے تھے۔ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں فقیہ اور مفتی مدینہ کے نام سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے۔

حمل عن النبی ﷺ علماً کثیراً نافعاً. (تذکرہ ج ۱ ص ۳۸)

آپ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے بہت سا نافع علم پایا۔

حدیث کے اتنے شیدائی تھے کہ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کے بارے میں سنا کہ ان کے پاس ایک حدیث ہے جو انہوں (عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ) نے خود حضور ﷺ سے سنی ہے وہ ان دنوں ملک شام میں مقیم تھے۔ اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے ایک اونٹ خریدا اور اس پر ایک ماہ تک سفر کرتے کرتے ملک شام پہنچے۔ پیغام بھیجا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ دروازے پر کھڑا ہے۔ انہوں نے پوچھا جابر بن عبداللہ ہیں؟ فوراً باہر آئے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ان سے حدیث پوچھی۔ انہوں نے سنائی۔ انہوں نے سنی اور چل دیئے۔ (الادب المفرد امام بخاری ص ۲۵۲ تذکرہ ج ۱ ص ۳۸)

علامہ عینی رحمۃ اللہ عنہ فرماتے ہیں وہ حدیث غالباً یہ تھی:

عن جابر رضی اللہ عنہ عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سمعت النبی ﷺ یقول یحشر اللہ العباد فینا دیھم بصوت یسمعہ من بعد کما یسمعہ من قرب انا الملک الدیان. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۱۱۴)

حضرت جابر عبداللہ بن انیس سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں میں نے حضور ﷺ کو فرماتے سنا۔ اللہ بندوں کو حشر میں ایسی آواز سے بلائے گا جس کو قریب اور بعید والے سب یکساں سنیں گے فرمائے گا میں ہوں بادشاہ انصاف والا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی شخصیت کریمہ کس طرح جمع حدیث اور طلب علم میں منہمک تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ مجتہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے اور حدیث کے مناط کلام پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ مثلاً حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: لاصلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ اس شخص سے متعلق ہے جو اکیلے نماز پڑھے جو امام کے پیچھے نماز پڑھے اس پر سورۂ فاتحہ پڑھنا لازم نہیں۔ حدیث میں مراد رسول کو پہنچنا انتہائی گہرا علم ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ دونوں کے استاد تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی اس شرح حدیث سے بہت متاثر تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ فاتحہ خلف الامام کے قائل تھے۔ مگر یہ صاف فرماتے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھے بغیر نماز ہو جاتی ہے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

واما احمد بن حنبل فقال معنی قول النبی ﷺ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اذا کان وحدہ واحتج بحدیث جابر بن عبداللہ قال رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام قال احمد فھذا رجل من اصحاب النبی ﷺ تاول قول النبی ﷺ لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب ان ھذا اذا کان وحدہ. (جامع ترمذی جلد ۱ ص ۴۲)

امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی حدیث لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب کا معنی یہ ہے کہ نمازی جب اکیلا نماز پڑھے تو فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی اور آپ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے دلیل پکڑی ہے آپ فرماتے ہیں جس نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ پڑھی اس کی نماز نہ ہوئی مگر جبکہ وہ امام کے پیچھے ہو۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں

کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے صحابی ہیں وہ حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ بیان کر رہے ہیں کہ حدیث لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ سے مراد یہ ہے کہ نمازی جب اکیلا ہو۔

آپ مدینہ میں سب سے آخر فوت ہوئے۔ علم کے ایسے شیدائی تھے کہ ایک حدیث کے لیے شام کا سفر کیا۔ حضور ﷺ کے خاص اہل علم طلبہ میں سے تھے۔ امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ اور امام باقر رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے علم کثیر پایا۔ سورۃ فاتحہ مقتدی کے ذمہ نہیں اس کا برملا اظہار فرماتے۔ (جامع ترمذی ج ۱ ص ۴۲، مؤطا امام مالک)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ کی پیروی میں چلے۔

عالم وفقیہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بھی مکثرین روایت میں سے ہیں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بھی مسجد نبوی میں علمی حلقہ لگا کرتا تھا، لوگ آپ رضی اللہ عنہ سے علم حاصل کرتے تھے۔ (رواہ وکیع عن ہشام)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں انیس غزوات میں رسول کریم ﷺ کا رفیق رہا ہوں، بدر اور احد میں شریک نہ ہو سکا، میرے والد نے مجھے روک دیا تھا، لیکن ان کی شہادت کے بعد میں کسی غزوہ میں غیر حاضر نہ رہا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جمل والی رات پچیس مرتبہ میرے لیے مغفرت کی دعا فرمائی ہے۔ (اخرجہ احمد)

وفات

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی وفات ۷۴ھ کو ہوئی، بعض کے نزدیک ۷۸ھ کو ہوئی اور ۹۴ سال کی عمر پائی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے وصیت فرمائی تھی کہ حجاج بن یوسف الثقفی ان کا جنازہ نہ پڑھائے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں فوت ہونے والے آخری صحابی تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا خاندان

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی کنیت ''ابوحمزہ'' ہے اور ''خادم رسول اللہ'' کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آپ کا تعلق قبیلہ نجار سے ہے، جو انصار مدینہ کا معزز ترین قبیلہ شمار کیا جاتا ہے۔ سلسلہ نسب کچھ یوں ہے۔

''انس بن مالک بن نضر اء بن ضمضم بن زید بن حرام بن جنب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجار''

آپ کی والدہ ام سلیم سہلہ بنت ملحان انصاریہ ہیں، ان کا سلسلہ نسب تین واسطوں سے حضرت انسؓ کے والد کے سلسلہ سے جا ملتا ہے۔ سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا کا شمار عہد نبوی کی نامور اور ممتاز خواتین میں ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہجرت نبوی ﷺ سے دس سال پہلے مدینہ میں پیدا ہوئے، ابھی آپ کی عمر نو سال نہ ہوئی تھی کہ آپ کی والدہ نے اسلام قبول کرلیا، ان کے والد بیوی سے ناراض ہو کر شام چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ ماں نے دوسرا نکاح ابو طلحہ سے کیا جن کا شمار قبیلہ خزرج کے متمول اشخاص میں ہوتا تھا۔ حضرت ام سلیم، حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ حضرت ابوطلحہ کے گھر لے گئیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اسی گھر میں تربیت پائی اور تاریخ اسلام کے ایک بلند پایہ فرد ثابت ہوئے۔

ابوحمزہ کنیت رکھنے کی وجہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک خاص قسم کی سبزی چنا کرتے تھے جس کا نام ''حمزہ'' تھا اسی مناسبت سے آپ ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے ابوحمزہ کنیت تجویز فرمائی۔

گھرانہ انس کا قبول اسلام

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر آٹھ یا نو سال ہوگی کہ مدینہ میں اسلام کی صدا بلند ہوئی۔ بنو نجار نے قبول اسلام میں جو پیش رفت کی اس کا اثر تھا کہ اس قبیلہ کے اکثر افراد آنحضرت ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے تو حید و رسالت کے علم بردار ہو چکے تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ام سلیم نے بھی عقبہ ثانیہ سے قبل دین اسلام اختیار کر لیا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے والد چونکہ بت پرست تھے وہ بیوی کے اسلام سے برہم ہو کر شام چلے گئے، ادھر ام سلیم نے ابو طلحہ سے اس شرط پر نکاح کیا کہ وہ بھی مذہب اسلام قبول کریں، چنانچہ وہ مسلمان ہوئے اور عقبہ ثانیہ میں سرکار دو عالم ﷺ کے دست حق پرست پر مکہ جا کر بیعت کی تھی، اس طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کا پورا گھرانہ ایمان سے منور تھا، ان کی جنتی ماں ام سلیم شمع اسلام کی پروانہ تھیں اور ان کے محترم باپ حضرت ابو طلحہ دین حنیف کے ایک پرجوش فدائی تھے بیٹے نے انہی والدین کی آغوش محبت میں تربیت پائی اور ایک مثالی مسلمان ہوئے۔

خدمت رسول ﷺ کا اعزاز

ابھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر دس سال ہوگی کہ وہ یوم مسعود آیا جس کے انتظار میں اہل مدینہ نے کئی راتیں کاٹی تھیں، حضور ﷺ مدینہ تشریف لائے اور شہر مدینہ کو "مدینۃ الرسول ﷺ" ہونے کا شرف عطا فرمایا۔

ہوئی تیری آمد آمد تو برائے خیر مقدم
کہیں کھل گئے گلستاں، کہیں ہو گیا چراغاں

حضرت انس رضی اللہ عنہ گو اس وقت صغیر السن تھے لیکن پرجوش تھے، جس ساعت سعید میں مدینہ کا افق آفتاب نبوت کی نورانی شعاعوں سے منور ہو رہا تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور بہت سے لڑکے جا، رسول اللہ ﷺ کا مژدہ جاں فزاں سنا رہے تھے اور خوشی خوشی شہر کا چکر لگا رہے تھے۔

میں اس وقت سے تیرا پرستار حسن ہوں
دل کو میرے شعور محبت بھی جب نہ تھا

رہبر انسانیت ﷺ نے جب مدینہ میں اقامت اختیار فرمائی تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ انسؓ کو اپنی غلامی میں لے لیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے منظور فرمالیا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ خادمان خاص کے زمرہ میں داخل ہو گئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے سرکار دو عالم ﷺ کی وفات تک اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ انہوں نے کم و بیش دس سال حامل نبوت ﷺ کی خدمت کی اور ہمیشہ اس سعادت و شرف پر ان کو ناز رہا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس دن رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی میں حاضر تھا اس دن سے زیادہ قبیح اور تاریک دن میں نے کبھی بھی کسی دن کو نہیں دیکھا۔

دیکھا نہیں جب سے تجھے اے نور مجسم
آنکھوں میں رہا کرتا ہے برسات کا عالم

حضور ﷺ کی دعا

ایک مرتبہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا حضور ﷺ سب سے زیادہ کون سی دعا مانگا کرتے تھے؟" حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا "حضور ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

"اللھم ربنا اتنافی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار"

"اے اللہ! اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں جہنم کے عذاب سے محفوظ فرما"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی ہمیشہ یہی دعا مانگا کرتے تھے۔ (رواہ احمد ۱۱۵۴۳)

نگاہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا مقام

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بحرین کا امیر بنایا تھا جب اس کے لئے ان کو بلایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی آگئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے مشورہ لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''انس کو آپ ضرور بحرین کی امارت دیں، وہ عقل مند کاتب ہیں''

(خیر القرون کی درس گاہیں، ص: ۲۱۷)

بحرین کی امارت کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ بصرہ چلے گئے اور وہیں اپنا حلقہ درس قائم کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے:

وكانت اقامته بعد النبي ﷺ بالمدينة ثم شهد الفتوح ثم وطن البصرة ومات بها (الاصابہ، ۱/۷۲)

''وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مدینہ میں مقیم رہے پھر فتوحات میں شرکت کی اس کے بعد بصرہ مقیم ہوگئے اور وہیں وفات پائی''۔

سانحہ ارتحال

عمر شریف اس وقت سو سے متجاوز ہو چکی تھی ۹۳ھ میں پیمانہ عمر لبریز ہوگیا، چند مہینوں تک بیمار رہے، شاگردوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا، اور دور دور سے لوگ عیادت کو آتے تھے، جب وفات کا وقت قریب ہوا تو ثابت بنانی سے جو تلامذہ خاص میں تھے، فرمایا کہ میری زبان کے نیچے آنحضرت ﷺ کے موئے مبارک رکھ دو، ثابت نے تعمیل حکم کی، اسی حالت میں روح مطہر نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

وفات کے وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ عمر کے ۱۰۳ مرحلے طے کر چکے تھے، بصرہ میں ان کے سوا اور کوئی صحابی زندہ نہ تھا اور عموماً عالم اسلامی (بجز ابوالطفیل) صحابہ

کرام کے وجود سے خالی ہو چکا تھا، نمازِ جنازہ میں اہل عیال، تلامذہ اور احباب خاص کی معتدبہ تعداد موجود تھی، قسطن بن بدرک کلابی نے نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے محل کے قریب موضع طف میں دفن کیے گئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وفات سے لوگوں کو سخت صدمہ ہوا، اور واقعی رنج والم کا مقام تھا، تربیت یافتگان نبوی۔ ایک ایک کر کے اٹھ گئے تھے، صرف دو شخص باقی تھے جن کی آنکھیں شمع نبوت کے دیدار سے روشن ہوئی تھیں اب ان میں سے بھی ایک نے دنیائے فانی سے قطع تعلق کر لیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو مورق بولے افسوس! آج نصف علم جاتا رہا لوگوں نے کہا یہ اس کی کیا وجہ ہے؟ کہا میرے پاس ایک بدعتی آیا کرتا تھا، وہ جب حدیث کی مخالفت کرتا میں اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر کرتا تھا؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ حدیث سنا کر اس کی تشفی کرتے تھے اب کون صحابی ہے جس کے پاس جاؤں گا۔

باغ جہاں میں صورت گلہائے تر رہا
باغ جناں میں مثل نسیم سحر گیا
خاک چمن میں گوہر شبنم نہاں نہیں
خورشید جلوہ بار سے پوچھ کدھر گیا

حلیہ مبارک

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خوب صورت اور موزوں اندام تھے۔ مہندی کا خضاب لگاتے تھے، ہاتھوں میں خلوق نامی خوشبو ملتے جس کی زردی سے چمک پیدا ہوتی تھی۔ انگوٹھی پہنتے تھے۔ صاحب اسد الغابہ نے روایت کی ہے کہ انگوٹھی کے نگینہ پر شیر کی صورت کندہ تھی۔

ایام پیری میں دانت ہلنے لگے تھے تو سونے کے تاروں سے کسوائے تھے۔

بچپن میں ان کے بال قدرے لمبے تھے، آقائے نامدار سرور عالم ﷺ ان

کے سر پر ہاتھ پھیرتے تھے تو ان بالوں کو بھی مس فرمایا تھا۔ ایک دفعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بال کٹوانا چاہا تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے ان بالوں کو چھوا ہے ان کو نہ کٹاؤ۔

حضرت انس خز کے قیمتی کپڑے پہنتے تھے اور اس کا عمامہ باندھتے تھے۔

آل واولاد

اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو مال واولاد سے خوب نوازا تھا، ان کی وفات کے وقت بیٹوں اور پوتوں کی تعداد سو سے اوپر تھی، خدا نے انہیں اسی (۸۰) سے زائد بیٹے اور بیٹیاں عطا فرمائے تھے۔ ان کے مشہور بیٹوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) عبداللہ بن انس (۲) عبیداللہ بن انس
(۳) زید بن انس (۴) یحییٰ بن انس
(۵) خالد بن انس (۶) موسیٰ بن انس
(۷) ابوبکر بن انس (۸) براء بن انس
(۹) علاء بن انس (۱۰) عمر بن انس

مشہور بیٹیوں کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) حفصہ بنت انس (۲) ام عمرو بنت انس
(۳) رملہ بنت انس (۴) امینہ بنت انس
(۵) ام حرام بنت انس

(سیر الصحابہ، اسد الغابۃ)

احرام کا مسنون طریقہ

حضرت جریر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے ذات عرق مقام سے احرام باندھا اور پھر احرام کھولنے تک ہم نے انہیں اللہ کے ذکر کے علاوہ اور کوئی بات کرتے ہوئے نہیں سنا۔ احرام کھول کر مجھ سے فرمایا اے بھتیجے! احرام

اس طرح ہوا کرتا ہے۔ (طبقات ابن سعد، ۲۲/۷)

احرام نام ہے خواہشات نفس کو دبانے اور اللہ کے لئے بعض حلال چیزوں سے اجتناب کرنے کا۔ اس لئے اس میں ہر اس عمل کا اہتمام کرنا چاہئے جو اللہ کی رضا اور قرب کا ذریعہ ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا عمل اس طرف نشاندہی کر رہا ہے۔

ریشم ملے اونی کپڑے کا جواز

حضرت عامر بن عبید باہلی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ریشم ملے ہوئے اونی کپڑے کے بارے میں پوچھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرا دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کپڑے کو پیدا ہی نہ فرماتے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ نبی کریم ﷺ کے ہر صحابی نے اس کپڑے کو پہنا ہے (یہ کپڑا حلال تھا لیکن اسے عجم کے مالدار لوگ پہنتے تھے اس لئے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اسے پسند نہ کیا)۔ (حیاۃ الصحابۃ ۲، ۸۹۵/)

حضرت انس رضی اللہ عنہ اور مسئلہ بتانے میں احتیاط

آخر عمر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کوئی شخص مسئلہ دریافت کرتا تو کہتے کہ ہمارے غلام حسن بصری سے پوچھ لو، اور لوگوں سے کہتے کہ

انا سمعنا وسمع فحفظ و نسینا

ہم نے بھی سنا اس نے بھی سنا اور یاد کرلیا اور ہم بھول گئے۔

(خیر القرون کی درس گاہیں، ص ۲۱۵)

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ

آپ رضی اللہ عنہ انصار میں سے ہیں اور قرآن کریم پڑھنے میں صف اوّل کی فضیلت رکھتے ہیں۔ خود حضور ﷺ نے فرمایا:

اقرأهم ابی بن کعب. (الاصابہ ص ۱۹)

پوری امت میں آپ سید القراء سمجھے جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے دور میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم فقہ میں ممتاز سمجھے جاتے تھے اور فتوے دیتے تھے آپ ان میں سے ایک ہیں۔

مسروق تابعی رحمۃ اللہ علیہ (۹۳ھ) کہتے ہیں آپ ان چھ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہیں جو حضور ﷺ کے دور میں فتوے دیتے تھے۔ (ایضاً)

خطیب تبریزی (۷۴۳ھ) بھی لکھتے ہیں:

احد الفقهاء الذین کانوا یفتون علیٰ عهد رسول الله ﷺ. (الاکمال ص ۵۹۰)

جس دن آپ کی وفات ہوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

الیوم مات سید المسلمین (تذکرہ ج ا ص ۱۶)

آج مسلمانوں کے سردار چل بسے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے ان الفاظ میں خراج تحسین ان کی واقعی عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سوید بن غفلہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آپ کے شاگردوں میں تھے۔ جس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سید المہاجرین مانے گئے ہیں حضرت ابی بن کعبؓ سید الانصار تھے۔ آپ اپنے شاگردوں کو جب اجتہاد کرنے کی اجازت دیتے تو فرماتے خود اجتہاد کرنے سے پہلے

دوسرے مجتہدین کی آراء کو بھی دیکھ لیا کرو۔ پھر کوئی موقف اختیار کرو، پہلے مجتہدین کے فیصلوں کو جانے بغیر تم کیا اجتہاد کر سکو گے۔ بیہقی مسلمہ بن خالد سے نقل کرتے ہیں:

عن مسلمة بن خالد انه قام علیٰ زید بن ثابت فقال یا ابن عم اکرهنا علی القضاء فقال زید اقض بکتاب الله عزوجل فان لم یکن فی کتاب الله ففی سنة النبی ﷺ فان لم یکن فی سنة ﷺ فادع اهل الرای ثم اجتهد واختر لنفسک ولا حرج. (سنن کبریٰ ج۱۰ص۱۱۵)

اس سے پتہ چلا کہ مجتہدین کے فیصلوں پر نگاہ رکھنا پھر اجتہاد کرنا اور اپنی رائے قائم کرنا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس عبارت میں لفظ اہل الرای اور نکھر کر سامنے آتا ہے ہر عالم اس درجے میں نہیں ہوتا کہ اسے اہل الرای میں شمار کیا جا سکے۔ اہل الرای انتہائی بلند پایہ علمی پایہ ہے جو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ایک اجتہاد اور حضور ﷺ سے اس کی تصویب

آنحضرت ﷺ نے ایک رمضان تین رات مسجد میں تراویح کی جماعت کرائی پھر آپ اس کے لیے اگلی رات نہ نکلے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا تو آپ نے فرمایا:

فلم یمنعنی من الخروج الیکم الا انی خشیت ان تفرض علیکم (مشکوٰۃ ص۱۱۴ متفق علیہ)

مجھے تراویح پڑھانے کے لیے نکلنے سے کسی اور بات نے نہیں روکا سوائے اس کے مجھے ڈر لگا کہیں یہ نماز بھی تم پر فرض نہ ہو جائے۔

خشیت ان یکتب علیکم ولو کتب علیکم ماقمتم به.

مجھے ڈر لگا کہ یہ نماز تم پر فرض ہو جائے اور اگر یہ فرض ہو جاتی تم

اسے قائم نہ کرسکتے۔

یہاں ایک سوال ابھرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو اس نماز کو جماعت سے ادا کرنا چھوڑا تو کیا اسے ناپسند کرتے ہوئے چھوڑا یا امت پر شفقت آپ کو اس مقام پر لے آئی؟ یہ صحیح ہے کہ مردوں کے لیے فرض نمازوں کے سوا باقی نمازیں گھر پر پڑھنی بہتر ہیں لیکن اگر کسی کو پورا قرآن کریم یاد نہ ہو اور وہ رمضان میں اسے ختم کرنا تو تراویح باالجماعۃ کے سوا چارہ نہیں۔ ان حالات میں مسئلہ زیر بحث بہت گہرا ہو جاتا ہے کہ حضور ﷺ کا تراویح باالجماعۃ کو ترک کرنا اس عمل کی ناپسندیدگی کی وجہ سے نہ تھا۔ اس میں امت کی رعایت اور اس پر شفقت مقصود تھی۔ ان دونوں پہلوؤں پر آپ غور کریں اور فیصلہ دیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے دوسری جانب اختیار کی تھی اور مسجد میں تراویح کی جماعت باقی رکھی۔ یہ چونکہ حضور ﷺ کی اجازت کے بغیر تھا اس لیے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ محراب میں کھڑے نہ ہوئے ایک کونے میں جماعت کراتے رہے۔ آپ کو دیکھ کر تراویح کی کچھ اور جماعتیں بھی ہونے لگیں۔

ایک رات آنحضرت ﷺ ادھر آ نکلے اور تراویح کی ان جماعتوں کو دیکھا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

خرج رسول الله ﷺ فاذا اناس فی رمضان یصلون فی ناحیة المسجد فقال ماهولاء فقیل هولاء ناس لیس معهم قران وابی بن کعب یصلی بهم ویصلون بصلاته فقال رسول الله ﷺ اصابوا رفعم ماصنعوا. (سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۱۹۵، مختصر قیام اللیل ص ۹۷ وفی رواته مسلم بن خالد وقد تکلم فیہ)

ایک رات آنحضرت ﷺ گھر سے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ رمضان میں مسجد کے ایک طرف تراویح پڑھ رہے ہیں آپ نے پوچھا کہ یہ کیوں جمع ہیں؟ عرض کیا گیا ان لوگوں کو قرآن یاد

نہیں اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان کو نماز تراویح پڑھا رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا انہوں نے ٹھیک کیا ہے اور اچھا عمل ہے جو انہوں نے کیا۔

اس سے پتہ چلا کہ مسجد میں تراویح باجماعۃ سرے سے متروک نہ ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ کے نہ پڑھانے کے باوجود یہ سلسلہ کچھ نہ کچھ چلتا رہا تھا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جس بات کو اجتہاداً اختیار فرمایا لسان رسالت نے پھر اس کی تائید بھی کر دی اور اس وقت سے اب تک مسلمانوں میں برابر جاری ہے اور تراویح جماعت سے پڑھی جا رہی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جو تین رات تراویح پڑھائی ہر رات کتنی رکعات پڑھیں کسی صحیح الاسناد حدیث سے ان کا عدد متعین نہیں تھا۔

ومن ظن ان قیام رمضان فیه عدد موقت عن النبی ﷺ لایزاد ولاینقص منه فقدا خطاء (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲ ص ۴۰۱)

اور جن لوگوں نے گمان کیا کہ قیام رمضان میں حضور ﷺ کی طرف سے کوئی طے شدہ رکعات ملتی ہیں جن میں کمی بیشی نہ ہو اس نے ایسا سمجھنے میں خطا کی ہے۔

اعلم انه لم ینقل کم صلی رسول الله ﷺ فی تلک اللیالی هل هو عشرون اراقل.

جان لو کہ ان راتوں میں آپ ﷺ نے بیس رکعت تراویح پڑھی تھی یا کم حضور ﷺ سے اس باب میں کوئی عدد منقول نہیں۔

ان العلماء اختلفوا فی عددها ولو ثبت ذلک من فعل النبی ﷺ لم یختلف فیه (زجاجۃ المصابیح عن جلال الدین سیوطی ص ۲۷)

علماء میں تراویح کی رکعات میں اختلاف ہے۔ آنحضرت ﷺ سے اگر اس میں کوئی عدد معین ملتا تو آپس میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔

افقصر الصلوٰة المسماة بالتراويح على عدد معين و تخصيصها بقراة مخصوصة لم ترد به سنة. (نیل الاوطار للشوکانی ج۱ص ۴۶)

تراویح کو کسی عدد معین اور کسی مخصوص قرأت پر بند کرنا سنت سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔

ولم يات تعين العدد فى الروايات الصحيحة المرفوعة لكن يعلم من حديث كان رسول الله ﷺ يجتهد فى رمضان مالا يجتهد فى غيره رواه مسلم. ان عددها كثير. (انتقاد الرجیح ص ۶۱)

مشہور اہل حدیث عالم نور الحسن خاں بھوپالی لکھتے ہیں:

بالجملہ عددے معین در مرفوع نیامدہ۔ (العرف الجادی ص ۸۸)

بعض غیر مقلدین کا یہ کہنا کہ یہ پانچوں علماء جھوٹ بول رہے ہیں۔ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہ میں گیارہ رکعت کا ثبوت موجود ہے۔ علماء کبار کے خلاف بہت بڑی جرأت ہے۔

البتہ محمد بن نصر مروزی نے کچھ ضعیف روایات سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی سند سے ایک رات آٹھ رکعت پڑھنا نقل ہے اس کے راوی محمد بن حمید الرازی اور عیسیٰ بن جاریہ دونوں ہیں۔ اگر آنحضرت ﷺ نے تین راتوں میں سے کسی میں آٹھ رکعت تراویح پڑھی ہوتیں تو آپ کی اس مسجد میں اسلام کی اس چودہ سو سالہ تاریخ میں کسی رمضان میں تو آٹھ رکعت تراویح پڑھائی گئی ہوتیں۔ اس کے برعکس ہم اب تک خانہ کعبہ میں اور مسجد نبوی میں بیس رکعت تراویح کی جماعت ہی دیکھتے آرہے ہیں۔ تاریخ میں ایک سال بھی ایسا نہیں ملتا جب ان دو بڑی مسجدوں میں تراویح باجماعت کبھی آٹھ رکعت پڑی گئی ہو۔

ایک قابل غور نکتہ

آنحضرت ﷺ سے تو ان راتوں کے بارے میں ایک صحیح روایت بھی تعداد رکعت کی نہیں ملتی۔ البتہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو جو حضور ﷺ نے تراویح کی جماعت کراتے دیکھا اور آپ نے ان کی تصویب وتحسین فرمائی۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے جو تعداد رکعات کی ملے گی وہ عدد من وجہ آنحضرت ﷺ کا تائید یافتہ سمجھا جائے گا۔ کیونکہ حضور ﷺ آپ کی تراویح کی تصویب فرما چکے ہیں:

عن عبدالعزيز بن رفيع قال كان ابى بن كعب يصلى بالناس فى رمضان بالمدينة عشرين ركعة و يوتر بثلث. (المصنف لابن ابی شیبہ ج۲ ص۱۶۳)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مدینہ شریف میں رمضان میں بیس رکعت تراویح پڑھاتے تھے اور تین وتر پڑھتے تھے۔

جب حضور ﷺ نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی نماز تراویح کی تصویب فرمائی تو کیا بیس کا یہ عدد (عشرین) حضور ﷺ کا پسند کردہ سمجھا جائے گا؟ اس پر غور فرماویں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں جب پھر ان اوزاع متفرقہ کو ایک امام (اور وہ بھی حضرت ابی رضی اللہ عنہ ہی تھے) پر جمع کیا اور اسے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے قبول کیا۔ تو اب یہ دیکھیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کتنی رکعات تراویح کا حکم دیتے ہیں۔

عن يحيىٰ بن سعيد ان عمر بن الخطاب رضى الله عنه امر رجلاً يصلى بهم عشرين ركعة . (المصنف ج۱ ص۱۶۳)

یحیٰ بن سعید رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ انہیں بیس رکعات تراویح پڑھائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تراویح بیس رکعت پڑھی جاتی تھیں یہ ایک ملکی سطح کی خبر ہے حکومت کے ایسے فیصلے خبر مستفیض بن کر پھیلتے ہیں۔ انفرادی خبروں میں

تو اتصال رواۃ کی ضرورت پڑتی ہے لیکن خلافت کے فیصلوں کو آگے نقل کرنے والے رواۃ اگر علماء ثقات اور ائمہ فقہاء میں سے ہوں تو ان کی نقل کردہ خبر مستفیض اتصال زمانہ کی محتاج نہ ہوگی۔

یحییٰ بن سعید انصاری (شاگرد خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ) جیسے امام علم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات نقل کرنا یا یزید بن رومان رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کی بات نقل کرنا کم علمی شہادتیں نہیں ہیں کیا ان کی روایات کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے قبول نہیں کیا؟ اور اپنے موطا میں انہیں جگہ نہیں دی؟ اور کیا اس پر علماء فن کا اتفاق نہیں سمجھا کہ موطا اہل حجاز کی اتفاق یافتہ کتاب ہے۔

سنن ابن داؤد کی بھی ایک روایت سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی نماز تراویح بیس رکعت ثابت ہوتی ہے:

عن الحسن عمر بن الخطاب رضی الله عنه جمع الناس علی ابی بن کعب رضی الله عنه فکان یصلی بهم عشرین رکعة. (سنن ابی داؤد ج ا ص ۲۰۲ باب القنوت الوتر)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوری قوم کو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر جمع کیا وہ انہیں بیس رکعت پڑھاتے تھے۔

افسوس کہ آج سنن ابی داؤد کے بعض نسخوں میں اس لفظ عشرین رکعة کو عشرین لیلة میں بدل دیا گیا ہے۔

نوٹ: مولانا وحید الزمان کے ترجمہ میں جسے اسلامک اکیڈمی اردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے اس کے جلد ا ص ۵۳۵ پر عشرین رکعة کو عشرین لیلة بنا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ آپ قنوت نصف اخیر میں پڑھتے تھے اگر آپ کا یہ قنوت پڑھنا نصف آخر میں تھا تو نصف آخر سے پہلے بیس رکعت کیسے ہوگئیں۔ کیا رمضان سوا مہینے کا ہوتا ہے؟

آیئے ہم آپ کو آٹھویں صدی ہجری میں لے چلیں اور اس دور کے نسخہ سنن ابی داؤد کا پتہ دیں۔ اس میں کیا الفاظ تھے؟ مشائخ سعودی کے جلیل القدر امام فقہ حافظ ابن قدامہ الحنبلی (۶۲۰ھ) لکھتے ہیں:

ان عمر لما جمع الناس علیٰ ابی بن کعب کان یصلی بھم عشرین رکعة. (المغنی ج۱ص۸۰۳)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کو (تراویح کے لیے) حضرت ابی رضی اللہ عنہ پر جمع کیا تو وہ آپ کو بیس رکعت پڑھاتے تھے۔

جب اس پرانے نسخے میں بھی عشرین رکعة کے الفاظ ہی ہیں تو یہ بات واضح ہے کہ آج جن نسخوں میں اسے عشرین لیلة کر دیا گیا ہے یہ تحریف ہے جو بیس رکعت تراویح کے خلاف کی گئی ہے۔ اس پر بھی اطمینان نہ ہو تو حافظ ذہبی (۷۴۸ھ) کی تاریخ دول الاسلام میں اسے ابوداؤد کے حوالہ سے دیکھ لیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کا یہ تسلسل بیس رکعت تراویح کچھ اس انداز سے چلا کہ امت میں ایک حلقہ اہل علم بھی ایسا نہ رہا کہ جو بیس رکعت سے کم تراویح کا قائل ہو۔ یہاں تک کہ ہم حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مکہ اور مدینہ کا یہ تعامل بیس رکعت عراق پہنچ کر بھی بیس ہی رہا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں تراویح کی رکعات؟

عن ابن ابی الحسناء ان علیاً امر رجلاً یصلی بھم عشرین رکعة. (سنن کبریٰ للبیہقی ج۲ص۳۹۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت (تراویح) پڑھائے۔

ابوالحسناء دو ہیں ایک جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے اور دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد حکم بن عتیبہ کے شاگرد تھے یہ شریک نخعی کے استاد

تھے۔ (کما فی التہذیب)

جو ابوالحسناء حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں ان سے ابوسعید بقال اور عمرو بن قیس نے روایت لی ہے۔ سو ابن حجر کا اسے مجہول کہنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ اسے مستور الحال کہا جا سکے گا اور ظاہر ہے کہ مستور الحال کی روایت ایک جماعت محدثین کے نزدیک لائق قبول ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں شتیر بن شکل بھی بیس رکعت تراویح ہی پڑھاتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیس رکعت والی جملہ روایات صحیح ہیں۔ اگر کسی میں سند کا ضعف ہے تو وہ ان قرائن سے منجبر ہو جاتا ہے۔

عن شتیر بن شکل و کان من اصحاب علی انه کان یؤمهم فی شهر رمضان بعشرین رکعة و یوتر بثلث. (سنن کبریٰ)

شتیر بن شکل سے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے ہیں مروی ہے کہ آپ رمضان میں لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قبولیت

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا:

ان اللہ امرنی ان اقرأ علیک لم یکن الذین کفروا من اهل الکتاب. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۳۷)

اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے سامنے قرآن کی یہ سورت پڑھوں؟

حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے متعجب ہو کر پوچھا کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر آپ کو کہا ہے؟ (قال و سمانی؟) حضور ﷺ نے فرمایا نعم (ہاں)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ

جس طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس امت میں فقیہ الامت کے طور پر معروف ہیں۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فقیہ اہل شام اس امت کے حکیم الامت مانے گئے ہیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے انتقال کے وقت چار صحابی پورے قرآن کے حافظ تھے۔ ۱۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، ۲۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، ۳۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، ۴۔ حضرت ابوزید رضی اللہ عنہ۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۸)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ بات حضرات انصار کے بارے میں ہے۔ مہاجرین) کے حفاظ کرام ان کے علاوہ تھے جنگ یمامہ میں ستر کے قریب حافظ قرآن شہید ہوئے اس سے پتہ چلتا ہے کہ حفاظ قرآن ان دنوں بڑی تعداد میں موجود تھے۔

مشہور تابعی حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ (۶۱ ھ) فرماتے ہیں:

میں نے محسوس کیا کہ آنحضرت ﷺ کے جملہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا علم ان چھ میں سمٹ آیا ہے۔

۱۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ۴۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، ۵۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ۶۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ (تذکرہ ج ۱)

آپ کا اعزاز یہ ہے کہ آپ نے قرآن کریم براہ راست حضور ﷺ سے حفظ کیا تھا:

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جس طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عراق کے سب سے بڑے استاد مانے گئے ہیں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ صحابہ میں شام کے مرکزی عالم تسلیم کیے گئے ہیں اور وہاں جو علم پھیلا وہ آپ کے علم و معارف کا ہی پرتو تھا۔

حافظ ذہبی (۸۴۸ھ) لکھتے ہیں:

آپ شام کے فقیہ اور قاضی بھی تھے۔ (تذکرہ ج ۱)

شام کے مجتہد امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۷ھ) جن کی ان بلاد میں مدتوں تقلید کی جاتی رہی ہے انہی کے علمی جانشین تھے۔

فقیہ مصر حضرت لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۵ھ) روایت کرتے ہیں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس قدر علماء وفضلاء چلتے جیسے کسی بادشاہ کے خدم و حشم ساتھ چل رہے ہوں۔ (ذکرہ الذہبی رحمہ اللہ)

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ آپ رضی اللہ عنہ کی ہی علمی مسند کے وارث تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ اُم الدرداء بھی علم فقہ میں بہت اونچا مقام رکھتی تھیں۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی ایک اور مثال

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ فی الصلوۃ قرآن۔ کیا نماز میں قرآن پاک بھی ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں ہے۔ ایک انصاری نے کہا۔ وجبت یہ ضروری ہے یعنی نماز میں قرآن پڑھا جانا ضروری ہے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اس پر حضور ﷺ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور لوگوں کی نسبت آپ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے حضور ﷺ کی موجودگی میں کہا:

ما اری الامام اذا ام القوم الا قد کفاھم . (سنن نسائی جلد ا ص ۱۰۶، سنن کبریٰ جلد ا ص ۳۴۱)

امام کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ جب وہ لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ (قرآن پڑھنے میں) انہیں کافی ہوگا (یعنی مقتدی کو خود پڑھنے کی ضرورت نہیں)۔

آنحضرت ﷺ کے سامنے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا یہ فتوے دینا آنحضرت ﷺ سے اس بات کی تصدیق ہے کہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا بھی ہے اور

امام کا پڑھنا اسے کافی ہوجاتا ہے حضور ﷺ کے سامنے کوئی بات کہی جائے اور حضور ﷺ اس پر انکار نہ فرمائیں تو اسے محدثین کے ہاں حدیث نبوی ہی مانا جاتا ہے اسے صرف قول صحابی نہیں سمجھا جاتا۔

امام طحاوی (۳۲۱ھ) لکھتے ہیں:

فهذا ابوالدرداء قد سمع من النبی ﷺ فی کل صلوٰة قران فقال رجل من الانصار وجبت فلم ینکر ذلک رسول الله من قول الانصاری ثم قال ابو الدرداء بعد من رایه ماقال وکان ذلک عنده علی من یصلی وجده وعلی الامام لاعلی المامومین. (شرح معانی الآثار ج ا ص ۱۰۶)

یہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے نبی پاک ﷺ سے یہ بات سن رکھی تھی کہ ہر نماز میں قرآن پڑھنا ضروری ہے ایک انصاری نے کہا تھا واجب ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس پر انکار نہیں فرمایا۔ پھر ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے سے کہا جو کہا اور ان کے ہاں حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ ہر نماز میں قرآن پڑھنا ضروری ہے اکیلے نمازی اور امام کے بارے میں سمجھا جائے گا، مقتدیوں کے بارے میں نہیں (ان کے لیے امام کا پڑھنا کافی ہے)

اور اگر یہ سمجھا جائے کہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے مذکور جملہ حضور ﷺ کے سامنے نہیں کہا اور یہ بات ان کا اپنا اجتہاد تھا تو بھی اس سے اتنی بات ضرور واضح ہے کہ آپ نے حضور ﷺ کے اس ارشاد کہ ہر نماز میں قرآن آنا لازمی ہے کو اکیلے نمازی یا امام پر محمول کیا ہے آپ مقتدیوں کو اس حدیث کے عموم میں نہیں لائے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کس اونچے درجے کے فقیہ اور مجتہد تھے کہ خود آنحضرت ﷺ کے سامنے آپ کی اجازت سے فتویٰ دیتے تھے۔ آپ کا موقف یہ ہے کہ نماز میں قرآن پڑھنے کی جملہ روایات صرف امام کے متعلق

ہیں یا اکیلے کے بارے میں ہیں، مقتدی کے لیے یہ حکم نہیں ہے کہ وہ اصالۃً قرآن پڑھے۔ وہ سورت فاتحہ ہو یا مازاد علی الفاتحہ۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھئے کس اونچے درجے کے مجتہد ہیں۔ آپ بھی حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بام القرآن کا معنی یہی بیان کرتے ہیں:

ان ھذا اذا کان وحدہ. (جامع ترمذی جلد۱ص۴۲)

حضرت سفیان عینیہ رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں جلالت قدر کو دیکھو آپ کس وضاحت سے فرماتے ہیں:

لمن یصلی وحدہ. (سنن ابوداؤد جلد۱ص۱۱۹)

امام بخاری بے شک اس حدیث کو مقتدیوں پر بھی لائے ہیں مگر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی تردید کردی ہے اور کہا ہے کہ یہ تشدد ہے۔

وشدد قوم من اهل العلم فی ترک قرأة فاتحة الکتاب وان کان خلف الامام فقالوا لا تجزی صلوٰة الابقرأة فاتحه الکتاب وحده کان ار خلف الامام. (جامع ترمذی ج۱ ص۴۲ طبع دوم ج۱ص۷۱)

اور کچھ لوگوں نے نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کے بارے میں تشدد اختیار کیا ہے۔ گو وہ (نمازی) امام کے پیچھے ہو وہ کہتے ہیں بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے نماز نہیں ہوتی اکیلا ہو یا مقتدی۔

محدثین کا اس موقف کو تشدد قرار دینا بتلاتا ہے کہ اس وقت اس مسئلہ میں عامہ اہل علم کا موقف کچھ اور تھا؟

ہمیں اس وقت اس مسئلے سے بحث نہیں ہم یہاں صرف حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی علمی عظمت اور مجتہدانہ شان کا ذکر کر رہے ہیں کہ آپ نے کس طرح اس حدیث کے عموم سے مقتدی کو نکال دیا اور حق یہ ہے کہ انہوں نے صحیح بات کو پالیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے ایمان ویقین کا ایک واقعہ

حضرت طلق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ایک شخص نے آپ کو اطلاع دی کہ آپ کے مکان کو آگ لگ گئی ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے بھی یہی کہا۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں۔ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے بھی وہی اطلاع دی۔ آپ نے اسے بھی کہا۔ ایسا نہیں ہوا۔

پھر ایک شخص آیا اور اس نے کہا۔ اس جگہ آگ ضرور لگی اور آگ کے شعلے بہت بلند ہوئے مگر آپ کا مکان بچا رہا اسے آگ نہ لگی۔ آپ نے فرمایا مجھے معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ایسا نہ کرے گا۔ کیونکہ میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص صبح کے وقت یہ کلمات پڑھ لے وہ شام تک ان کی حفاظت میں رہتا ہے میں نے صبح وہ کلمات پڑھ لیے تھے۔

وہ کلمات یہ ہیں:

اللھم انت ربی لا الہ الاانت. علیک توکلت وانت رب العرش الکریم ماشاء اللہ کان ومالم یشاء لم یکن ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم. اعلم ان اللہ علی کل شی قدیر. وان اللہ قدا حاط بکل شی ء علماً اللھم انی اعوذبک من شر نفسی ومن شر کل دابۃ انت اخذ بنا صیتھا ان ربی علیٰ صراطٍ مستقیم.

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

فضائل ومناقب

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اہل بیت میں خاص مقام ومرتبہ حاصل تھا اس بناء پر کتاب اللہ کا ترجمان، سنت رسول اللہ ﷺ کا معبر اور اسلامی احکام کا معلم ان سے بہتر کون ہوسکتا تھا، عام لوگ پیغمبر علیہ السلام کو صرف جلوت میں دیکھتے تھے اور یہ خلوت وجلوت دونوں میں دیکھتی تھیں اس لیے وحی کی زبان "ما ینطق عن الھوی" نے یہ فیصلہ کیا۔

"فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام" (صحیح بخاری، ترمذی، مناقب عائشہ رضی اللہ عنہا)

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عام عورتوں پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو عام کھانوں پر۔

خود آنحضرت ﷺ کو خواب میں ان کے حرم نبوت میں آنے کی خوشخبری سنائی گئی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بستر کے سوا کسی دوسری ام المومنین کے بستر پر وحی کا نزول نہیں ہوا۔ (صحیح بخاری، مناقب، عائشہ رضی اللہ عنہا)

جبریل امین علیہ السلام نے خود حاضر ہو کر سلام پیش کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ میں فخر کے طور پر نہیں بلکہ واقعہ کے طور پر کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نو باتیں ایسی عطا فرمائی ہیں کہ دنیا میں میرے سوا کسی اور کو نہیں ملیں (۱) خواب میں فرشتے نے آنحضرت ﷺ کے سامنے میری صورت پیش کی۔ (۲) جب میں سات سال کی تھی تو آپ ﷺ نے مجھ سے نکاح کیا (۳) جب میری عمر ۹ سال کی ہوئی تو میری رخصتی ہوئی۔ (۴) میرے سوا اور کنواری بیوی آپ کے حرم میں نہ تھی۔ (۵) آپ ﷺ جب میرے بستر پر ہوتے تب بھی وحی نازل ہوتی (۶) میں آپ ﷺ کی محبوب ترین بیوی تھی۔ (۷) میری شان میں قرآن کی آیات نازل ہوئیں۔

(۸) میں نے جبریل امین کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ (۹) آپ ﷺ نے میری ہی گود میں سر رکھے ہوئے انتقال فرمایا۔

علمی اعتبار سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو تمام امہات المومنین پر بلکہ چند بزرگوں کو چھوڑ کر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر فوقیت عام حاصل تھی۔

(۱) جامع ترمذی میں حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایسی مشکل بات کبھی پیش نہیں آئی کہ جس کو ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ معلومات ہم کو نہ ملی ہوں“ (جامع ترمذی، مناقب عائشہ رضی اللہ عنہا)

(۲) حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ جن کو متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے شرف تلمذ کا اعزاز حاصل ہے، فرماتے ہیں کہ ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تمام لوگوں میں سب سے زیادہ فقیہ سب سے زیادہ صاحب علم اور عوام الناس میں سب سے اچھی رائے والی تھیں“ (مستدرک حاکم)

(۳) امام زہری رحمۃ اللہ علیہ جو تابعین کے امام تھے اور جنہوں نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی صحبت اور ان سے تربیت حاصل کی تھی، فرماتے ہیں کہ ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عالم تھیں اور بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے مسائل پوچھا کرتے تھے“۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۶)

(۴) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ابوسلمہ جو کہ جلیل القدر تابعی تھے، کہتے ہیں کہ ”میں نے رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کا جاننے والا اور کسی رائے میں ان سے زیادہ فقیہ اور آیات قرآن کے شان نزول اور مسائل فرائض کا جاننے والا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا“۔ (مسند مذکور)

(۵) ایک دن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی سے پوچھا کہ لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اس نے کہا کہ ”امیر المومنین! آپ ہیں“ آپ نے کہا کہ نہیں میں تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں سچ سچ بتاؤ! اس نے کہا: اگر ایسا

بات ہے تو عائشہ رضی اللہ عنہا''۔ (مستدرک حاکم)

(۶) حضرت عروہ بن الزبیرؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حلال و حرام، علم و شاعری اور علم طب میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا'' (ایضاً)

(۷) ایک شخص نے حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ تابعی جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تلمیذ و تربیت یافتہ تھے، سے پوچھا کہ کیا ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فن فرائض سے واقف کار تھیں؟ جواب دیا: ''خدا کی قسم! میں نے بڑے بڑے بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان سے فرائض کے مسائل دریافت کرتے ہوئے دیکھا ہے'' (زرقانی ج ۳ ص ۲۲۷)

(۸) محمود بن لبید کا قول ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بہت سی احادیث زبانی یاد کرتی تھیں لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے برابر نہیں'' (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۶)

(۹) امام زہری رحمۃ اللہ علیہ شہادت دیتے ہیں کہ ''اگر تمام مردوں کا اور تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا علم ایک جگہ جمع کیا جائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم ان میں سب سے وسیع ہوتا'' (مستدرک حاکم)

(۱۰) بعض محدثین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فضائل میں یہ حدیث بھی نقل کی ہے آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنے دین کا ایک حصہ اس ''حمیراء'' سے سیکھو''

اس حدیث کو علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ ''النہایۃ'' اور فردوس اپنی ''المسند'' میں لائے ہیں لیکن لفظاً اس کی سند ثابت نہیں اور اس کو موضوعات میں شمار کیا گیا ہے تاہم معنی اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

علم و اجتہاد

فقہ و اجتہاد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقام و مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس باب میں آپ رضی اللہ عنہا صرف عورتوں میں نہیں بلکہ مردوں میں بھی واضح طور پر ممتاز نظر آتی ہیں۔

علم حدیث

علم حدیث کا موضوع ذات نبوی ﷺ ہے اس لیے فن کی واقفیت کے ذریعہ سب سے زیادہ اس کو حاصل تھے جس کو سب سے زیادہ آپ ﷺ کا قرب حاصل تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس قسم کے مواقع زیادہ میسر آ سکتے تھے، وہ آنحضرت ﷺ کی آخر عمر تک ہمیشہ خدمت گزار اور شرف صحبت سے ممتاز رہیں اس لیے ان کو آنحضرت ﷺ کے احوال اور احکام سے زیادہ واقفیت تھی۔

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے بھی کوئی بھی احادیث کی واقفیت میں ان کا مدمقابل نہیں ان کی روایات کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ نہ صرف ازواج مطہرات نہ صرف عام عورتوں بلکہ مردوں میں بھی چار پانچ کے سوا کوئی ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

قوت حفظ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس عطیہ خداوندی سے بدرجہ اتم سرفراز تھیں پہلے بھی گزر چکا ہے کہ لڑکپن میں کھیلتے کھیلتے بھی کوئی آیت ان کے کانوں میں پڑ جاتی تو ان کو یاد رہ جاتی، احادیث کا دارومدار زیادہ تر اسی قوت پر ہے۔

ام المومنین رضی اللہ عنہا نے اپنے معاصرین پر نکتہ چینیاں کی ہیں ان میں قوت حفظ کو بھی دخل ہے۔

(۱)...... جب حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے چاہا کہ مسجد میں ان کا جنازہ آئے تو وہ بھی نماز پڑھ لیں، لوگوں نے اعتراض کیا تو فرمایا کہ لوگ کس قدر جلد بھول جاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے سہیل رضی اللہ عنہ بن بیضاء کی نماز جنازہ مسجد ہی میں پڑھی تھی۔ (صحیح مسلم، کتاب الجنائز)

(۲)......حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ اپنے شاگردوں سے کہا کہ مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے لوگوں نے اس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا تو فرمایا: خدا ابو عبدالرحمٰن پر رحم فرمائے! آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ مہینہ کبھی ۲۹ کا بھی ہوتا ہے"۔ (مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۲۴۳)

(۳)...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے لوگوں نے سوال کیا کہ آنحضرت ﷺ نے عمرہ کتنی بار ادا کیا؟ آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ چار مرتبہ جن میں ایک رجب کے مہینہ میں "حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ نے بلند آواز سے کہا کہ خالہ جان! کیا آپ نہیں سنتیں کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ بتایا گیا کہ وہ کہتے ہیں کہ "آنحضور ﷺ نے چار بار عمرہ ادا کیا جن میں سے ایک رجب میں فرمایا کہ خدا تعالیٰ ابو عبدالرحمٰن پر رحم کرے! آپ ﷺ نے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا جس میں وہ شریک نہ ہوں، رجب میں کوئی عمرہ آپ ﷺ نے نہیں کیا"۔ (صحیح بخاری، کتاب العمرۃ)

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم فقہ میں کیا مقام تھا؟ قرآن وحدیث اور فتاویٰ وارشاد کی سرخیوں کے جو واقعات آئیں گے ان سے ان کا پایہ واضح وروشن ہوگا۔

قرآن مجید

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اصول یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتی تھیں اگر اس میں مسئلہ معلوم نہ ہوتا تو پھر احادیث کی طرف رجوع کرتی تھیں پھر قیاس کا درجہ تھا۔

(۱)......ایک صاحب نے متعہ کے متعلق پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہا نے حسب ذیل آیت اس کی حرمت میں پیش کی۔

"والذین هم لفروجهم حفظون الاعلی ازواجهم اوما ملکت ایمانهم فانهم غیر ملومین". (سورۃ المومنون:۱۰)

"اور جو لوگ اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں لیکن اپنی بیویوں

کے ساتھ یا اپنی باندیوں کے ساتھ تو ان پر کوئی ملامت نہیں''

اب ظاہر ہے کہ ممنوعہ عورت نہ بیوی ہے اور نہ باندی، اس لیے متعہ جائز نہیں۔

(۲)...... ایک شخص نے دریافت کیا کہ اہل عجم اپنے تہواروں میں جو جانور ذبح کرتے ہیں کیا ان کا کھانا جائز ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جو جانور خاص اس دن کے لیے ذبح کریں وہ جائز نہیں ہے''۔ (عین الاصابہ للسیوطی)

(۳)...... حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے ایک عورت سے ۸۰۰ میں ادھار ایک باندی خریدی اور شرط یہ لگائی کہ جب وظیفہ ملے گا تو ادا کر دیں گے، اسی دوران انہوں نے اسی عورت کے ہاتھ اسی باندی کو ۶۰۰ میں نقد بیچ دیا اس عورت نے معاملہ کی اس صورت کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم نے بھی برا کیا اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے بھی، ان سے کہہ دو کہ انہوں نے حضور ﷺ کے ہمراہ جہاد کا جو ثواب حاصل کیا تھا وہ رائیگاں ہو گیا لیکن یہ گروہ توبہ کر لیں۔ مطلب یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس خاص صورت میں اس ۲۰۰ کی زیادتی کو سود قرار دیا۔ اس مسئلہ میں ان کا ماخذ یہ آیت تھی۔ ''فمن جاءہ موعظة من ربہ فانتھیٰ فلہ ما سلف ''یعنی جس کو اپنے پروردگار کی طرف سے (سود کے متعلق) نصیحت آ چکی تھی''۔ (البقرہ)

پھر باز آ گیا تو اس کو اسی قدر لینا چاہیے جس قدر پہلے دیا تھا۔

حدیث نبوی ﷺ

قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے مسئلہ یہ پیش آیا کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو طلاق لے لینے کا اختیار عطا کر دے اور بیوی اس اختیار کو واپس کر کے اپنی شوہر ہی کو قبول کر لے تو کیا بیوی پر کوئی طلاق پڑے گی؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے نزدیک ایک طلاق ہو جائے گی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک اس صورت میں ایک طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔ اس کی دلیل میں انہوں نے تخیر کا واقعہ پیش کیا کہ آنحضور ﷺ نے اپنی

بیویوں کو اختیار دیا کہ خواہ وہ دنیا قبول کریں یا کاشانہ نبوت میں رہ کر فقر و فاقہ کی زندگی کو پسند کریں سب نے دوسری صورت کو اختیار کیا، کیا اس سے ان پر ایک طلاق واقع ہوگئی''۔ (صحیح بخاری، باب من خیر نساءہ)

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا ایک باندی تھیں، ان کے آقا نے ان کو اس شرط کے ساتھ بیچنا چاہا کہ ولایت کا حق ان کو حاصل ہوگا، بریرہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آکر اپنی حالت عرض کی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خریداری کا ارادہ ظاہر فرمایا لیکن ولایت کی شرط قبول نہیں کی، آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے تو صورت حال معلوم کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم خرید کر آزاد کر دو ایسی شرطیں خود کالعدم ہو جائیں گی چنانچہ وہ آزاد ہوئیں تو اپنے شوہر کو قبول نہ کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے فقہ کے متعدد اصول مستنبط کیے آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بریرہ رضی اللہ عنہا کے ذریعہ اسلام کے تین احکام معلوم ہوئے۔

(۱) ولایت کا حق آزاد کنندہ کو ملے گا۔

(۲) غلامی کی حالت میں اگر ایک غلام اور ایک باندی کی شادی ہوئی ہو اور بیوی آزاد ہو جائے اور شوہر غلامی کی حالت میں ہو تو بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے شوہر کو قبول کرے یا نہ کرے۔

(۳) اگر کسی حق دار کو صدقہ کا مال ملے اور وہ اپنی طرف سے کسی غیر مستحق کو ہدیہ کے طور پر پیش کرے تو اس غیر مستحق کو اس کا لینا جائز ہوگا، یعنی اس کی حیثیت بدل جائے گی۔

قیاس

حدیث کے بعد قیاس کا درجہ ہے شریعت مطہرہ کے نظائر اور فیصلوں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جس قدر آگاہ تھیں وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔

(۱)...... آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں عورتیں مسجد میں آتی تھیں اور جماعت کی نمازوں میں شریک ہوتی تھیں، آپ ﷺ نے عام حکم دیا تھا کہ لوگ عورتوں

کو مسجدوں میں آنے سے منع نہ کریں لیکن عہد نبوت کے بعد مختلف قوموں کے میل جول اور تمدن کی وسعت اور دولت کی بہتات سے عورتوں میں زیب و زینب آچکی تھی یہ دیکھ کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اگر آج آنحضور ﷺ زندہ ہوتے تو عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روک دیتے''۔ (صحیح بخاری ج ا، باب خروج النساء الی المساجد)

آپ رضی اللہ عنہا کی اس رائے پر گو اس وقت عمل نہیں ہوا لیکن اس استنباط کا منشاء وہی قیاس عقلی ہے۔

(۲)...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتوی تھا کہ جو مردہ کو غسل دے اس کو غسل کرنا چاہئے اور جو شخص جنازہ اٹھائے تو اس کو دوبارہ وضو کرنا چاہئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سن کر فرمایا ''کیا مسلمان مردہ بھی ناپاک ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص لکڑی اٹھائے تو اس کو کیا ہوتا ہے''۔ (عین الاصابہ للسیوطی)

(۳)...... شرعی غسل کے لیے ضروری ہونے کے لیے خروج ماء کی ضرورت ہے یا نہیں؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ضروری ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: الماء من الماء، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات سنی تو پہلے اس کے خلاف ایک حدیث بیان کی پھر فرمایا کہ اگر کوئی ناجائز فعل کا مرتکب ہو اور خروج ماء نہ ہو تو کیا رجم کرو گے پھر غسل کیوں نہ ضروری ہو''۔ (عین الاصابہ للسیوطی)

معاصرین سے اختلاف

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فقہی مسائل میں اپنے معاصرین سے اختلاف بھی کیا ہے، ہم نے اس قسم کے احکام کی یہ فہرست جامع ترمذی اور دیگر کتب حدیث سے منتخب کی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا	دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
(۱) جنازہ اٹھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا	حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے نزدیک ٹوٹ جاتا ہے۔

(۲) عورت کے لیے غسل میں بال کھولنا ضروری نہیں۔	حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے نزدیک ضروری ہے۔
(۳) التقاء سے غسل واجب ہوتا ہے۔	حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے نزدیک خروج ماء شرط ہے۔
(۴) مردہ کو غسل دینے سے غسل واجب نہیں۔	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک واجب ہوجاتا ہے۔
(۵) نماز میں عورت کے سامنے آنے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک باطل ہوجاتی ہے۔
(۶) نماز مغرب میں جلدی کرنی چاہئے۔	حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تاخیر کرنی چاہئے۔
(۷) حالت جنابت میں صبح ہوجانے سے روزہ نہیں جاتا۔	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ چلا جاتا ہے۔
(۸) افطار میں جلدی کرنی چاہئے۔	حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ تاخیر کرنی چاہئے۔
(۹) قربانی کا گوشت تین دن کے بعد بھی کھانا جائز ہے۔	حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جائز نہیں۔
(۱۰) حج میں وادی محصب میں اترنا سنت نہیں۔	حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سنت ہے۔
(۱۱) حج میں بال منڈانے کے بعد خوشبو لگانا جائز ہے۔	حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے نزدیک جائز نہیں۔
(۱۲) کعبہ میں قربانی بھیجنے سے حج کی پابندیاں عائد نہیں ہوتیں۔	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عائد ہوجاتی ہیں۔

(۱۳) حج میں حائض کو طواف وداع کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔	حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے نزدیک کرنا چاہئے۔
(۱۴) حج میں عورت زعفرانی کپڑے پہن سکتی ہے۔	حضرت عمر رضی اللہ عنہ مکروہ ہے۔
(۱۵) یتیم اور نابالغ کے مال میں بھی زکوٰۃ ہے۔	حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نہیں ہے۔
(۱۶) حاملہ بیوہ ہوجائے تو عدت کی مدت وضع حمل ہے۔	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دونوں مدتوں میں جو زمانہ زیادہ ہو وہی عدت کا زمانہ ہوگا۔
(۱۷) اگر بیوی طلاق کا اختیار شوہر کو واپس کردے تو طلاق نہ ہوگی۔	حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک ایک طلاق ہوگی۔
(۱۸) اگر بالغ بھی کسی عورت کا دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہوگی۔	باقی ازواج مطہرات کے نزدیک ثابت نہیں ہوتی۔
(۱۹) قروء سے مراد طہر ہے۔	دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک حیض ہے۔
(۲۰) عورت کی میت کے بال نہیں سنوارنے چاہئیں۔	حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ سنوارنے چاہئیں۔

افتاء وارشاد

سابق میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جو فضائل ومناقب گزرے ہیں ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی زندگی کے بقیہ چالیس سال مقتدیانہ حیثیت سے بسر کیے لیکن ہمارے پاس خوش قسمتی سے ایسی تحریری شہادتیں بھی موجود ہیں جس سے یہ اندازہ یقین کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے، خلفاء علماء اور عامۃ المسلمین مشکلات میں ان ہی کے آستانہ پر

حاضر ہوتے تھے۔ محدثین کرام نے علمائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے تین طبقات قرار دیئے ہیں۔ طبقہ اول میں وہ حضرات ہیں کہ جن کے فتاویٰ اگر مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے طبقہ دوئم میں وہ اشخاص ہیں جن کے الگ الگ فتاوی یکجا کیے جائیں تو ایک معتد بہ رسالہ تیار ہو سکتا ہے اور طبقہ سوئم کا مجموعہ فتاوی ایک رسالہ کے بقدر ہے۔ طبقہ اول میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کے فتاوی اس کثرت سے احادیث کی کتب میں مذکور ہیں کہ اگر ایک جگہ جمع کیے جائیں تو ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے۔ (مقدمہ اعلام الموقعین)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وصال نبوی ﷺ کے بعد ہی افتاء کا منصب حاصل کر لیا تھا اور آخر زمانہ تک خلفائے راشدین کے زمانوں میں بھی وہ ہمیشہ اس منصب پر فائز و ممتاز رہیں۔ حضرت قاسم رحمۃ اللہ علیہ (جو مدینہ کے سات مشہور تابعین میں سے ہیں) فرماتے ہیں کہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، کے دور خلافت ہی میں مستقل طور پر منصب افتاء پر ممتاز ہو چکی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد آخر زندگی تک ہمیشہ اور برابر فتوے دیتی رہیں''۔ (طبقات ابن سعد ج۲ص ۱۲۶)

خود خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس شکوہ سے بے نیاز نہ تھے، بلکہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے احادیث پوچھوا بھیجتے تھے۔ (حوالہ مذکور)

حالانکہ دور فاروقی میں مخصوص اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ اور لوگوں کو افتاء کی اجازت نہ تھی، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علم پر کس درجہ اعتماد تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ جو فقہ و اجتہاد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے برابر تھے، وہ بھی بعض مسائل میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھ کر تسلی کر لیتے تھے۔ (صحیح بخاری، وتر، جنازہ)

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ جو علماء صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے، بھی اس آستانہ سے بے نیاز نہ تھے۔ (موطا امام مالک)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیمہ حج کے موسم میں کوہ شبیر کے دامن میں نصب ہوتا تھا، سائلین کا ہجوم ہوتا۔ (مسند احمد ج ۶، ص ۲۲۵، ۲۶۱)

جن مسائل میں صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف پیش آتا لوگ فیصلہ کے لیے ان ہی کی عدالت میں رجوع کرتے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی کہ مجھے ایک مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف بہت شاق گزرا، آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا جواب دیا تو انہیں تشفی ہوگئی اور کہا کہ آپ کے بعد اب کسی سے یہ مسئلہ نہ پوچھوں گا۔ (موطا امام مالک)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ جو کہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں، ان میں افطار کے وقت کے متعلق اختلاف تھا، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ افطار جلدی کرتے اور پھر فوراً ہی مغرب کی نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے اور حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ دونوں میں تاخیر کرتے تھے، لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے افتاء لیا تو دریافت کیا کہ ان میں تعجیل کون صاحب کرتے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کہ آنحضور ﷺ کی عادت شریفہ بھی یہی تھی۔ (مسند احمد ج ۶ ص ۴۸)

ایک مجلس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ دونوں بزرگ موجود تھے مسئلہ یہ پیش آیا کہ اگر کوئی حاملہ عورت بیوہ ہو جائے اور چند روز کے بعد اس کو وضع حمل ہو جائے تو اس کی عدت کا زمانہ کس قدر ہوگا؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان دونوں میں جو سب سے زیادہ مدت ہوگی وہی عدت کا زمانہ ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وضع حمل تک اس کی عدت کا زمانہ ہے، دونوں میں فیصلہ نہ ہوا تو لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا تو انہوں

نے اس کی عدت وضع حمل تک بتائی۔ اور دلیل میں سبیعہ کا واقعہ پیش کیا جو بیوہ ہو گئی تھی اور تیسرے ہی دن ان کا وضع حمل ہوا اور انہیں اسی وقت دوسرے نکاح کی اجازت مل گئی۔ (طیالسی ومسند عائشہ رضی اللہ عنہا وام سلمہ رضی اللہ عنہا)

یہ فیصلہ اس قدر مدلل تھا کہ جمہور علماء کا اسی پر عمل ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ زیادہ تر زن وشوہر کے مسائل وتعلقات آنحضور ﷺ کے حالات اور شب بیداری اور ذاتی اخلاق کے متعلق ہیں اور حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اگر ان کے فتاوی کو یکجا کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فریضۂ ارشاد کو جس حد تک ادا کیا وہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کوششوں سے کسی طرح کم نہیں ہے وہ اپنے حجرے میں مجمع عام میں موسم حج میں غرض کہیں بھی اس فریضہ سے غافل نہیں رہتی تھیں۔

مصر وعجم کی ریشہ دوانیوں سے لوگوں میں حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس قدر ناراضگی پھیلنی شروع ہوئی کہ بعض لوگ ان پر لعنت بھیجنے لگے، مخارق بن شامہ بصرہ کے ایک رئیس تھے انہوں نے اپنی بہن کو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا کہ اس ابتلائے عام کے بارہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں فرمایا کہ "میرے بیٹوں کو میری طرف سے سلام کے بعد کہہ دو کہ میں نے اسی جھرے کے اندر یہ منظر دیکھا ہے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام وحی لاتے ہوتے آپ ﷺ تشریف فرما ہوتے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پاس ہوتے تو آپ ﷺ ان کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہتے "ہاں! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ لکھو" اللہ تعالیٰ یہ رتبہ فروتر لوگوں کو عطا نہیں کرتا۔ لہٰذا جو عثمان رضی اللہ عنہ کو گالیاں دے اس پر خدا کی لعنت ہو"۔ (الادب المفرد، باب نقص شی من الاسم)

ابو سلمہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے ایک زمین کے متعلق چند لوگوں کو ان سے اختلاف تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا جب وہ آئے تو انہیں سمجھایا کہ اے ابو سلمہ رضی

اللہ عنہ! اس زمین سے دستبردار ہو جاؤ؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "بالشت بھر زمین کے لیے بھی اگر کوئی ظلم کرے گا تو ساتوں طبقے اس کے گلے میں ڈالے جائیں گے"۔ (صحیح بخاری، باب اثم من ظلم شیئا)

حضرت ابن ابی السائب رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ کے واعظ تھے، واعظین گرمی مجلس کے لیے نہایت مسجع دعائیں بنا بنا کر پڑھا کرتے اور اپنے تقدس کے اظہار کے لیے ہر وقت وعظ کے لیے آمادہ رہتے ہیں، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے فرمایا کہ "تم مجھ سے تین باتوں کا عہد کرو، ورنہ میں بزور تم سے باز پرس کروں گی، عرض کی یا ام المومنین! وہ کیا باتیں ہیں؟ فرمایا کہ دعاؤں میں عبارتیں مسجع نہ بناؤ، کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم ایسا نہیں کرتے تھے، ہفتہ میں صرف ایک دن وعظ کہا کرو۔ اگر یہ منظور نہ ہو تو دو دن اور اس سے بھی زیادہ چاہو تو تین دن لوگوں کو خدا کی کتاب سے مت اکتاؤ، ایسا نہ کیا کرو کہ لوگ جہاں بیٹھے ہوں آکر بیٹھ جاؤ اور قطع کلام کر کے اپنا وعظ شروع کر دو۔ بلکہ جب ان کی خواہش ہو اور وہ درخواست کریں تب کہو"۔ (مسند احمد ج ۶ ص ۲۱۷)

وفات

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آخری زمانہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کا آخری وقت ہے اس وقت ان کی عمر ۶۷ سال کی تھی۔ ۵۸ھ میں رمضان کے مہینے میں بیمار ہوئیں، چند روز تک علیل رہیں، کوئی خیریت پوچھتا تو فرماتیں "اچھی ہوں"۔ (طبقات ابن سعد جز و نساء ص ۵۱)

جو لوگ عیادت کو آتے اور بشارت دیتے تو فرماتیں "اے کاش! میں پتھر ہوتی، اے کاش! میں کسی جنگل کی جڑی بوٹی ہوتی"۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اجازت چاہی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تامل ہوا کہ وہ آکر تعریف نہ کرنے لگیں، بھانجوں نے سفارش کی تو اجازت دی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا "آپ رضی اللہ عنہ کا نام ازل سے ام المومنین تھا، آپ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی سب

سے محبوب بیوی تھیں، رفقاء سے ملنے میں آپ رضی اللہ عنہا کو اتنا ہی عرصہ باقی ہے کہ روح بدن سے پرواز کر جائے۔ خدا تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہا ہی کے ذریعہ تیمم کی اجازت دی، آپ رضی اللہ عنہا کی شان میں قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں جواب ہر محراب و مسجد میں شب و روز پڑھی جاتی ہیں'' فرمایا ''ابن عباس رضی اللہ عنہا مجھے اپنی تعریف سے معاف رکھو، مجھے یہ پسند تھا کہ میں معدوم محض ہوتی''۔ (متدرک حاکم)

مرض الوفات میں یہ وصیت فرمائی کہ اس حجرہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ مجھے دفن نہ کرنا، میں نے ایک جرم کیا ہے، مجھے دیگر ازداج مطہرات کے ساتھ جنت البقیع میں دفن کر دینا۔ (طبقات ابن سعد، جز ونساء ص ۵۱)

''اور رات ہی کو دفن کر دی جاؤں، صبح کا انتظار نہ کیا جائے'' کسی نے عرض کی کہ آپ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وغیرہ کے ساتھ دفن ہوتیں تو بہت بہتر تھا، فرمایا کہ ''اگر ایسا ہو تو پچھلا عمل جاتا رہے اور نیا شروع کروں'' (موطا امام محمد، باب النوادر)

آپ رضی اللہ عنہا نے ۱۷، رمضان المبارک ۵۸ھ بمطابق ۱۳ جون ۶۷۸ء بعد از نماز وتر بوقت شب وفات پائی۔

وفات کی خبر سن کر انصار اپنے گھروں سے نکل آئے، آپ رضی اللہ عنہا کے نماز جنازہ میں اتنا ہجوم تھا کہ لوگوں کا بیان ہے کہ رات کے وقت اتنا مجمع نہیں دیکھا گیا۔

بعض روایات میں ہے کہ عورتوں کا ہجوم دیکھ کر روز عید کے اژدہام کا وہم ہوتا تھا۔ (طبقات ابن سعد جزء نساء ص ۵۲)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا تو بولیں کہ ''عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے جنت واجب ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی سب سے محبوب بیوی تھیں''۔ (رواہ الحاکم)

مسند طیالسی میں ہے کہ انہوں نے کہا ''خدا ان پر رحمت بھیجے کہ وہ اپنے باپ کے سوا آپ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب اور پیاری تھیں''۔ (طیالسی، مسند ام سلمہ رضی اللہ عنہا ص ۲۲۴)

ان دنوں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ کے قائم مقام حاکم تھے،

انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی۔ قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن عتیق، عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، بھتیجوں اور بھانجوں نے قبر مبارک میں اتارا۔ (مستدرک حاکم)

اور حسب وصیت جنت البقیع میں مدفون ہوئیں، مدینہ منورہ میں قیامت برپا تھی کہ آج حرم نبوت کی ایک اور شمع بجھ گئی۔

حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ (تابعی) فرماتے ہیں کہ اگر مجھے ایک بات کا خیال نہ ہوتا تو میں ام المومنین رضی اللہ عنہا کے لیے ماتم کا حلقہ قائم کرتا۔ (طبقات ابن سعد، جزء نساء ص ۵۴)

مدینہ منورہ کے ایک صاحب سے لوگوں نے پوچھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وفات پر اہل مدینہ نے کس قدر غم والم کا اظہار کیا؟ جواب دیا کہ جس جس کی وہ ماں تھیں (یعنی تمام مسلمان) اسی کو ان کا غم تھا۔ (طبقات ابن سعد، نساء ص ۵۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بعد کچھ متروکات چھوڑے، جن میں ایک جنگل بھی تھا یہ ان کی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے حصہ میں آیا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو تبرکاً ایک لاکھ درہم میں خریدا، جانتے ہو کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے یہ خطیر رقم کہاں صرف کی؟ عزیز و اقارب میں تقسیم کر دی۔ (صحیح بخاری، باب ہبۃ الواحد للجماعۃ)

مآخذ ومراجع

الصحیح لامام البخاری	محمد بن اسماعیل البخاری رحمۃ اللہ علیہ
الصحیح لامام المسلم	مسلم بن الحجاج القشیری رحمۃ اللہ علیہ
السنن لامام ابی داؤد	سلیمان بن اشعث السجستانی رحمۃ اللہ علیہ
السنن لامام النسائی	ابوعبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ
السنن لامام الترمذی	محمد بن عیسی الترمذی رحمۃ اللہ علیہ
السنن لامام ابن ماجہ	محمد بن یزید القزوینی رحمۃ اللہ علیہ
المسند لامام احمد	امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ
فتح الباری	علامہ ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ
تفسیر لابن کثیر	العلامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ
طبقات ابن سعد	الامام ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ
البدایہ والنہایہ	العلامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ
سیر اعلام النبلاء	
تذکرۃ الحفاظ	
کنز العمال	احمد علی المتقی رحمۃ اللہ علیہ
الاصابۃ	ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ
الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب	ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ
الاکمال	ابن ماکولا
اعلام الموقعین	ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ
بغیۃ الملتمس فی رجال الاندلس	احمد بن یحیٰی رحمۃ اللہ علیہ
تاریخ بغداد	خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ
تاریخ جرجان	حمزہ بن یوسف سہمی رحمۃ اللہ علیہ
تاریخ مکہ	احمد سباعی رحمۃ اللہ علیہ

کتاب	مصنف
تجرید اسماء الصحابہ	امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ
تہذیب التہذیب	ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ
جمہرۃ انساب العرب	ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ
ذیل العبر	ذہبی رحمۃ اللہ علیہ
ذیل العبر	حسینی رحمۃ اللہ علیہ
جامع بیان العلم	ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ
رسالہ المسترشدین	حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ
رحلہ ابن بطوطہ	ابن بطوطہ رحمۃ اللہ علیہ
شفاء الغرام فی تاریخ البلد الحرام	فاسی مکی رحمۃ اللہ علیہ
صفوۃ الصفوۃ	ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ
طبقات ابن سعد	محمد بن سعد واقدی رحمۃ اللہ علیہ
طبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ	عبد القادر تمیمی مصری رحمۃ اللہ علیہ
طبقات الحنابلہ	ابو یعلی موصلی رحمۃ اللہ علیہ
المعارف	ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ
المنتظم	ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ
وفیات الاعیان	ابن خلکان رحمۃ اللہ علیہ
مناقب الامام احمد	ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ
المحدث الفاضل	رامہرمزی رحمۃ اللہ علیہ
حلیۃ الاولیاء	ابو نعیم الاصفہانی رحمۃ اللہ علیہ
تاریخ الطبری	علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ
حیاۃ الصحابہ	مولانا یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ
فضائل صدقات	شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ
حکایات صحابہ	شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ

تدوین حدیث	مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ
نفحۃ العرب	مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ
خیر القرون کی درسگاہیں	مولانا قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ
سیرت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ	طالب الہاشمی
حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم	العلامہ محمد یوسف الکاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ
درس ترمذی	المفتی محمد تقی العثمانی مدظلہ
انعام الباری	المفتی محمد تقی العثمانی مدظلہ

☆☆☆☆☆☆